شیخ راحت اللہ قریشی ''راحت اندوری''

حیات اور شاعری

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

پیش کردہ

ہری پرکاش سریواستو

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، فیض آباد (یو پی)

نگراں

ڈاکٹر محمد نسیم خاں

صدر شعبۂ اردو

بابا برواداس پوسٹ گریجویٹ کالج

پروئیا آشرم، ضلع امبیڈکر نگر

۲۰۱۱ء

SHAIKH RAHATULLAH QURAISHI "RAHAT INDAURI" HAYAT AUR SHAYARI

Thesis

SUBMITTED TO

DR. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY

FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

HARI PRAKASH SRIVASTAVA

Under Supervision of

Dr. Mohd. Naseem Khan

Head

DEPARTMENT OF URDU

B.B.D.P.G. COLLEGE PARUIYA ASHRAM,

DISTT. AMBEDKAR NAGAR

2011

راحت اندوری

فہرست

پیش لفظ

ابتدا ہی سے اردو سے لگاؤ اور خاص کر اس کی شاعری کی ہمہ گیریت سے متاثر ہو کر میں نے حرز جان بنائے رکھا اور ایم اے تک تعلیم حاصل کر سکا۔ راحت اندوری کو میں نے اکثر مشاعروں میں سنا ان کے کلام اور انداز پیش کش نے گویا مجھے مسحور سا کر رکھا تھا۔ ایک خواہش دل میں گدگدانے لگی کہ اس بلند پایہ شاعر کی شاعرانہ عظمتوں پر کوئی مقالہ لکھ سکوں اس خیال کے تحت میں نے راحت اندوری کی جو کتابیں مجھے دستیاب ہو سکیں ان کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کی فکر و شعور رچاؤ، سادگی بیان کا میں قائل تو پہلے ہی سے تھا چنانچہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے میں نے ان کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کام کرنے کی ٹھان لی۔ اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد نسیم خان صاحب صدر شعبہ اردو سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا ''ہری پر کاش تمہارا ارادہ بہت اچھا ہے۔ مگر تحقیقی کام میں ایڑی کا پسینہ چوٹی تک آنے کا حوصلہ بھی ضروری ہے۔'' چنانچہ موصوف ہی کی نگرانی میں میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جتنا مطالعہ کرتا اور موصوف سے رہنمائی ملتی میں اس پر عمل پیرا ہوتا رہا۔ موضوع کی وسعتوں کا اندازہ کر کے اور اس پر سیر حاصل بحث کیلئے میں نے اپنے موضوع کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا اور ہر گوشے سے راحت کی شخصیت اور فن کو پرکھنے کی کوشش کی۔ مقالہ کے پہلے باب میں راحت اندوری کے سوانحی حالات، خاندان، تعلیم، شاعری کی ابتدا،

مشاعروں میں شرکت (ملکی اور بیرون ملک کے مشاعرے) اعزازات، عادات وخصائل واطوار، شادی ،اولاد اوران کی دوسری مختلف سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی تا کہ ان کی شخصیت وفکر وفن کا کوئی گوشہ تشنہ تحریر نہ رہ جائے۔

باب دوم میں راحت اندوری کے عہد اوراس کا ادبی پس منظر حتی الوسع مفصل طور پر تحریر کرنے کی کوشش کی ہے اوراس امر کا بخوبی لحاظ برتا ہے کہ جوبھی میرے زیر قلم آئے وہ تحقیقی معیار پر کھرا بھی ہو نیز ہر طرح کی افراط وتفریط ،بغض وجانب داری کا کہیں شائبہ بھی نہ رہ جائے۔

باب سوم راحت اندوری کی شاعری سے متعلق ہے بحیثیت شاعران کو پرکھنے کیلئے بحیثیت غزل گوجوان کی مخصوص اور واحد صنف سخن ہے، کے مخصوص خدوخال اوراس کی انفرادیت، تخیل، دل کو چھو لینے والی کیفیت ،اثر آفرینی سادی سی زبان میں بڑی بات کہہ جانے کا ہنران کے کلام پر ترقی پسندی کا عکس، ان کا پرزوراحتجاجی لہجہ اور بے باک پیش کش ان سب کا کھل کر جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں راحت اندوری کی دوسری اصناف سخن میں فکر اور طبع آزمائی اوران کی شاعری کے موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم میں راحت اندوری کی مجموعی علمی اورادبی خدمات کا جائزہ لے کر ان کی نگارشات کی قدروقیمت کا تعین، ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ ان کے کلام کے آئینہ میں حتی الامکان بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم راحت اندوری کی فلمی دنیا سے وابستگی اوران کی کارگزاریوں کے ذکر پر مشتمل ہے، راحت اندوری نے فلمی دنیا کو کیا دیا اوران کا مقصد اور فلمی شاعری کے فروغ کے لئے ان کی مساعی جمیلہ اور وہاں کے ماحول سے انہوں نے کیا اخذ کیا اور کیا دیا ان سب باتوں کا ذکر اس باب میں شامل ہے۔

باب ہفتم (حرف آخر) اس باب میں مختصراً اس پورے مقالے کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے تا کہ بیک نگاہ راحت کی شخصیت اوران کے کلام کی تصویر نظر کے سامنے آسکے۔اس کے بعد کتابیات کی فہرست

شامل مقالہ ہے۔ راحت سے متعلق جو کتابیں، رسائل اور جرائد، خطوط اور شخصی گفتگو کے جو حوالے راقم کے مطالعہ میں رہے ان سب کے اسماء شامل ہیں۔ ایسی بہت سی کتب و ماخذات جو زیر مطالعہ رہے لیکن ان کے اقتباسات شامل مقالہ نہیں ہیں، ان کے اسماء فہرست میں نہیں ہیں۔ یہ میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد نسیم خاں صاحب صدر شعبہ اردو جو اس مقالے کے نگراں بھی رہے ہیں تہہ دل سے شکریہ ادا کروں، جنہوں نے میری رہنمائی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مجھے صرف موصوف نے زبانی حوصلہ نہیں دیا بلکہ ان کی نگاہ میں راحت سے متعلق جو کتب یا رسائل جو بھی ہو سکے اور ان کی فراہمی میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور ان کی دستیابی کی کوشش کی اور اپنی دلی حوصلہ افزائیوں سے میرے اسپ شوق کو مہمیز کرتے رہے۔ باقر مہدی صاحب استاد شعبہ اردو کا میں سپاس گزار ہوں موصوف نے اپنی مصروفیات کے باوجود جب بھی میں گیا انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور جو ان سے بن پڑا مجھے موضوع سے متعلق دستیاب کرایا۔

عالمی پیمانے پر مقبول اور مشہور زمانہ شاعر و ناظم مشاعرہ جناب انور جلال پوری میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے راحت کے ایسے شعر و سخن کے بحر بے کراں کو میری تحقیق کے لئے زور دیا میرے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ انور صاحب کی قربت و شفقت مجھے حاصل ہے ان ہی کی جد و جہد اور حوصلہ افزائیوں کی بدولت میں اس تحقیقی کام کے لئے خود کو مستور اور ہمہ تن مصروف و مشغول کر سکا اور جب بھی میں نے اپنی تحقیق کے موضوع اور ماخذات کے سلسلے میں موصوف سے مشورہ کیا تو انہوں نے مجھے راحت کی شخصیت اور فن سے متعلق ایسی آگاہی بخشی کہ میں ان پر تحقیق کیلئے کمر بستہ ہو گیا۔ انور صاحب نے صرف زبانی معلومات ہی نہیں دیں بلکہ ایسے ماخذات تک میری رسائی صرف اور صرف انہیں کی بدولت ہو سکی جو میرے کیسۂ خیال میں بھی نہیں تھیں۔ اس طرح آج میں اپنا مقالہ پیش کر سکنے کا اہل ہو سکا ہوں۔ میں اپنے قلب و روح کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے دل کی ہر دھڑکن ان کی سپاس گزار ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوران تحقیق بہت سے کرم فرماؤں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا،

حوصلہ افزائی کی اس موقع پر سب کے نام گنوانا تو گفتگو کو طول دینے کے مترادف ہے میں ان سب ہی حضرات کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہر طرح کا تعاون دیا جس کی بدولت میں اپنا مقالہ ارباب فکر و نظر کی خدمت میں پیش کر سکنے کا اہل ہو سکا ہوں۔

ہری پرکاش سریواستو
متعلم شعبہ تحقیق
بی بی ڈی پی جی کالج
پروئیا آشرم، امبیڈکر نگر

باب اول

راحت اندوری
کے
حالات زندگی

(داہنے سے) راحت اندوری، مشہور ناظم مشاعرہ انور جلال پوری

۲۱؍جون ۲۰۰۸ء

عمرہ سے واپسی پر

(داہنے سے) منظر بھوپالی، راحت اندوری

راحت اندوری کے اسلاف خاندان شہر مالوہ کے مضافاتی علاقہ کھڑیل کے درمیان واقع قصبہ ہانسل پور کے باشندے تھے ان کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا۔ اپنی حد درجہ لگن محنت ومشقت کی وجہ سے وہ اپنے علاقہ کے لائق احترام افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔

راحت کے جد امجد غلام محمد ہانسل پور سے ترک وطن کر کے سون کچھ چلے آئے تھے یہاں بھی ان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ اس کے علاوہ مکانات کی تعمیر خرید وفروخت کا بھی ان کا کاروبار تھا۔ غلام محمد کی شادی قصبہ کملا پور میں ہوئی تھی ان کے دو بیٹے حشمت اللہ اور عبدالحفیظ تھے۔ حشمت اللہ کی شادی سون کچھ میں ہوئی تھی ان کے بطن سے ایک بیٹا رفعت اللہ اور ایک بیٹی تھی۔ یہی رفعت اللہ راحت اندوری کے والد گرامی تھے۔ راحت سے بڑی تین بہنیں اور ان سے چھوٹا ایک بھائی عادل قریشی ہے۔ ان کے سلسلہ نسب کو یوں نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

راحت کے والد رفعت اللہ کی شادی دیواس میں منظور حسین کی بیٹی مقبول بی سے ہوئی تھی۔ منظور حسین دیواس کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ یہ دیواس میں ہی محکمہ پولیس میں بعہدۂ انسپکٹر فائز تھے۔

راحت کی ولادت یکم جنوری ۱۹۵۰ء میں اندور میں ہوئی تھی۔ راحت اندوری کا پورا نام شیخ راحت اللہ قریشی ہے جس زمانے میں راحت کی ولادت ہوئی ان کے والدین کی اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ راحت کے چھوٹے بھائی عادل قریشی لکھتے ہیں ''راحت بھائی مجھ سے عمر میں چھ سال بڑے ہیں اندور کے نیاپوری محلّہ میں جب میں نے ہوش سنبھالا راحت بھائی نوتن ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، راحت بھائی کو میں چھوٹے بھائی جان کہا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کی حالت بہت خراب تھی راحت بھائی بہت کم عمری میں جب وہ اسکول کے طالب علم تھے مختلف کام کرنے لگے تھے۔'' (۱)

راحت کی ابتدائی تعلیم

دستور زمانہ کے مطابق راحت کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو فارسی سے ہوئی اس کے بعد وہ نوتن ہائی اسکول اندور میں داخل ہوئے اور اسی درس گاہ سے انہوں نے آٹھواں درجہ پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسی اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اندور کے آرٹ اینڈ کامرس کالج میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی کچھ ناگفتہ بہ حالات خاص کر قلت سرمایہ کی بنا پر انہیں یہ سلسلہ تعلیم بی اے سال اول میں ہی منقطع کرنا پڑا۔ جب ذرا حالات سدھرے تو انہوں نے اسلامیہ کریمیہ کالج بھوپال سے گریجویشن کیا۔

راحت جب نوتن ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے یہ ان کے والدین کے مالی بحران کا دور تھا اس لئے راحت اپنی تعلیم کے ساتھ مختلف کام کرنے لگے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے جھگن کی دوکان کی دوکان پر سائین بورڈ بنانے کا کام کیا یہاں وہ بڑی مستعدی اور انہماک سے کام کرتے تھے۔ جب کام زیادہ ہوتا

---

(۱) چھوٹے بھائی جان عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۶

تو دیر رات تک چھٹی نہیں مل پاتی تھی۔ روزہ رکھنے کے وہ بڑے پابند تھے۔ چنانچہ رمضان میں دیر ہونے پر اکثر ان کی والدہ بذاتِ خود جھگن کی دوکان پر روزہ افطار کرنے کا کچھ سامان ان کو دینے کیلئے جایا کرتی تھیں۔ لیکن راحت نے ہر تنگ و ترش حالات میں بھی اپنے انہاک میں کمی نہیں آنے دی۔ اس کام سے کچھ عافیت کے دن گزارنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ اسی مستعدی نے ان کے کام میں بھی ترقی کے امکان پیدا کر دئے اور ایک دن ایسا وقت بھی آیا جب ان کے بھائی عادل قریشی کی روایت کے بموجب:

''اندور کی ایک بڑی تجارتی بستی میں راحت بھائی کے بنائے ہوئے بورڈ سڑک کے دونوں جانب لگے ہوئے دیکھے جانے لگے دوکانداروں کو کئی کئی دن اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اپنا بورڈ کسی اور سے بنوانا گوارا نہ تھا۔ راحت بھائی کرایہ کی سائیکل لیکر چلاتے تھے اور اجرت کے بطور اسی دوکان کی سائیکلوں پر نام لکھا کرتے تھے۔''(۱)

بی اے کرنے کے بعد راحت کو اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا تھا لیکن ان کی انتھک محنتوں کو دیکھ کر اللہ نے ان کو فراوانی عطا کی تو انہوں نے ۱۹۸۵ میں اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ ڈی (Ph.D) اردو کی سند حاصل کر لی۔ .Ph.D کے مقالہ کا عنوان تھا ''اردو کی ترویج و اشاعت میں مشاعروں کا حصہ'' یہاں ان کی تحقیق کے نگراں پروفیسر آفاق احمد صاحب تھے چونکہ راحت مشاعروں میں شرکت کرتے کرتے مشاعروں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اور انہیں پروفیسر آفاق احمد صاحب جیسے دیدہ ور اور ہر اعتبار سے ہمدرد نگراں مل گئے تھے ان دونوں وجوہات کی بنا پر انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور حقِ تحقیق ادا کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر لی۔

راحت کی انتھک محنت یا خالق کی دین کہ Ph.D کرنے کے بعد جلدی ہی اسلامیہ کریمیہ کالج اندور میں لیکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے بارہ سال درس و

---

(۱) راحت میرے چھوٹے بھائی عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۷

تدریس کے کام انجام دئے۔ مشاعروں میں زیادہ آنے جانے اور دن بہ دن بڑھتی ہوئی اپنی مشغولیت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ طلباء کو زیادہ وقت نہیں دے پا رہے ہیں اس لئے اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

شعر گوئی کا آغاز

راحت کو شعر کہنے کا شوق تو بہت پہلے سے تھا لیکن اس کا آغاز انہوں نے بقول مضطر مجاز حیدرآبادی ۱۹۶۵ء یعنی پندرہ سال کی عمر سے کیا۔" (۱) اس کے برخلاف پروفیسر ظفر احمد نظامی لکھتے ہیں "انہیں ابتدا سے ہی شاعری کا شوق رہا، شعر و ادب کا ذوق رہا، ہزار شعراز بر تھے، مستقبل کا مظہر تھے، انہوں نے اختر شیرانی کو دل میں بٹھایا ساحر کو اپنایا، مجاز سے پیار کیا، مخدوم پر اعتبار کیا، فیض سے فیضیاب ہوئے کوچۂ سخن میں کامیاب ہوئے آخر کار تخلیق کا کرب سہا ۱۹۶۸ء میں پہلا شعر کہا پھر مسلسل شعر کہنے لگے" (۲)

پروفیسر ظفر احمد نظامی سے ملتی جلتی روایت راحت کے بھائی عادل قریشی کی ہے وہ لکھتے ہیں "ہم گھر والوں کو پہلی بار ۷۰۔۱۹۶۹ء میں معلوم ہوا کہ راحت بھائی شعر کہتے ہیں۔ پہلا مشاعرہ والدہ صاحبہ کی سفارش پر ماموں صاحب نے دیواس میں پڑھوایا تھا۔ ماموں انتظامیہ کمیٹی کے رکن تھے، مشاعرے میں راحت بھائی نے اپنا کلام پیش کیا تو کوئی نوٹس نہیں لیا گیا ہم ۱۵۔۲۰ افراد جو اندور سے ساتھ آئے تھے، ونس مور (Once More) کا شور کرنے لگے، جس پر عوام نے ہمیں ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ آج حال یہ ہے کہ ساری دنیا میں راحت بھائی کا کلام سنا پڑھا اور گایا جاتا ہے۔" (۳)

راحت نے اپنی ایک گفتگو میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا اور پھر یہ شوق تیز تر ہو کر ان منزلوں پر پہنچ گیا کہ آج ان کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے

(۱) مضطر مجاز حیدرآباد لمحے لمحے ۲۰۰۲ء ص ۴۳۳
(۲) پروفیسر ظفر احمد نظامی لمحے لمحے بدایوں ص ۱۱
(۳) چھوٹے بھائی جان عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۸

کہ وہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ہر جگہ جانے پہچانے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں صرف اسی قدر مصدقہ ہے کہ اسکول اور کالج کے زمانہ تعلیم میں بھی راحت اپنے کلاس میں بیٹھ کر شاعری کے نکات پر نہایت سنجیدگی سے غور وفکر کرنے لگے تھے، ان کی سنجیدگی اور توجہ سے ان کے استاد ڈاکٹر عزیز اندوری بھی ان سے خوش و مطمئن رہا کرتے تھے۔ آخر کار ایک دن راحت نے اپنے استاد ڈاکٹر عزیز اندوری کے روبرو یہ انکشاف کر ہی دیا کہ وہ شعر کہنے لگے ہیں۔ عزیز صاحب اس خبر سے کچھ خوش بھی ہوئے اور کچھ متفکر بھی۔ متفکر اس لئے کہ اگر دوران تعلیم راحت کو شاعری کا چسکا لگ گیا اور وہ اندور کی شعری فضا میں پوری طرح غرق ہو گئے تو ان کا تعلیمی سلسلہ بالکل اسی طرح منقطع ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہائی اسکول کے بعد بارہ سال شعری ماحول میں ڈوبے رہے تھے اور ان کی تعلیم پس پردہ چلی گئی تھی۔ عزیز صاحب نے اپنے اسی تجربے کے تحت راحت کو شروع میں تعلیم پر زیادہ دھیان دینے کی ہدایت کی مگر ان کے ذوق وشوق کو دیکھ کر انہیں شعر گوئی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ وہ مقامی شعری ماحول میں گھر کر اپنے دامن کو آلودہ نہ کرلیں، اور بسا اوقات راحت کو اپنے وعدے پر اٹل رہنے کی ہدایت بھی دیتے رہتے تھے۔ اسی وجہ دے راحت کے اشعار میں کلاسیکیت کا رچاؤ نہیں ہے اور نہ اس فضا میں ترقی پسندانہ نظریات کی جھلکیاں ہی نظر آتی ہیں اور نہ جدیدیت کے رنگ کا کوئی پروقار پہلو، بقول ڈاکٹر عزیز اندوری:

''ایک سچا فنکار جب اپنے ذہن کے دروازوں کو کھول کر کچھ سوچتا ہے تو اس کے تجربوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ وقت کی گردشوں پر گہری نگارہ رکھتے ہوئے آئینہ دل کو گرد وغبار، حالات سے صاف کرنے کی کوشش میں جٹ جاتا ہے۔ ایسے میں اس کی کوشش احتجاجی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت سے قریب تر بھی۔ راحت نے بھی ایسا کچھ کیا ہے معلوم ہوتا ہے اس کا دل موجودہ ناانصافیوں سے بہت متاثر ہوا ہے اسی لئے وہ بعض صورت میں بہت کڑوی کڑوی باتیں کرنے لگتا ہے مگر وہ کرے بھی تو کیا کہ اس کے عہد نے حساس دلوں کو ایسی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے

روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں
چاند پاگل ہوگیا تارے بھکاری ہوگئے

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے تھے جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بیوقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آگئے

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں اک تنہا شجر ایسا تھا (۱)

اسی زمانہ میں اندور کی کلاسیکی اور روایتی شعری فضا میں کچھ لوگوں نے اپنی آواز ملانے کی کوشش ضرور کی مگر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح ڈوب کر رہ گئی۔ ایک مدت مدید کے بعد اندور کی قدیم روایات جس میں جمود کی سی کیفیت طاری تھی، میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس گروہ میں اندور کی قدیم نسل کے شانہ بہ شانہ نوجوان نسل پیش پیش تھی۔ ان میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر راحت اندوری کا ہے، جنہوں نے ابتدا ہی سے اندوری شعری لہجہ سے خود کو قدرے مختلف بنائے رکھنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ اندور کے شعری ماحول نے راحت کو اپنے رنگ میں رنگ لینے کی ضرور کوشش کی ہوگی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے راحت نے خود اپنی الگ پہچان بنائے رکھنے کے عزم کے تحت خود کو اس روایتی ماحول میں ڈھلنے نہیں دیا۔

راحت اندوری کا اپنا الگ مزاج اور شعری رویہ تھا وہ شعر گوئی کو محض تفنن طبع یا اظہار جذبات

---

(۱) تیکھے لہجے کا شاعر، ڈاکٹر عزیز اندوری راحت اندوری شخص اور شاعر، مکتبہ دین و ادب لکھنؤ ص ۱۵۷، ۲۰۰۲

ہی کا وسیلہ نہیں گردانتے تھے بلکہ اسے مستقل ایک فن سمجھتے تھے۔ اس خیال نے انہیں ایک رہنما ایک استاد کی فکر لاحق تھی، اور وہ چاہتے تھے کہ کسی لائق ماہرفن سے اصلاح سخن لیا کریں ان کی توجہ اندور کے کلاسیکی مزاج کے شاعر قیصر اندوری پر مرکوز ہوئیں اور انہوں نے موصوف سے مشورہ سخن کرنا شروع کیا۔ غالباً اسی مناسبت سے کچھ دنوں تک لوگ انہیں راحت قیصری کہنے لگے تھے اور یہی ان دنوں ان کی شناخت بھی بن گئی تھی۔ لیکن جس نوع کی غزلیں راحت ان دنوں کہہ رہے تھے ان کی غزلوں کا مزاج ان کے استاد قیصر اندوری کے مزاج شعر گوئی اور رنگ سخن سے یکسر مختلف تھا۔ اسی لئے یہ سلسلہ مشورۂ سخن زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا اور پھر وہ ان سے الگ ہوتے ہی راحت قیصر سے راحت اندوری بن گئے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو راحت نے اپنے ابتدائی دور شعر گوئی میں قلم بند کئے تھے:

لوگ پیپل کے درختوں کو خدا کہنے لگے
میں ذرا دھوپ سے بچنے کو ادھر آیا تھا

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو آگے
جو آگے ہیں وہ ہمیں راستہ نہیں دیں گے

ہمارے عیب ہمیں انگلیوں پر گنواؤ
ہماری پیٹھ کے پیچھے ہمیں برا نہ کہو

اس وقت تو میں گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس ایک قمیض تھی جو میرا بھائی لے گیا

یہ جھیل اچھی ہے کنول اچھا ہے یا جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے

قبر کے پتھر کے نیچے تھیں مری عیاشیاں
اور مرے اعمال کا سایہ میرے بچوں پہ تھا

مندرجہ اشعار میں جو شعری مزاج ہے وہ یقینی طور پر اندور کے قدیم اور اس عہد کے شعری مزاج سے مختلف تھا۔ اسی بنا پر اندور کا شعری ماحول راحت اندوری سے شروع ہی میں اجنبیت کا اظہار کرنے لگا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی آواز اندور کی شعری فضا میں ان کی منفرد آواز بن کر ابھری اور فکری بلندیوں پر فائز ہوگئی۔ اس طرح انہوں نے جلدی ہی اندور کے شعری اور ادبی حلقے کو اپنی جانب متوجہ کرلیا اور ان کی طباعی اور ذہانت اور ان کے فن کا اعتراف کیا جانے لگا اور جب انہوں نے اندور کے مشاعروں میں شرکت کرنے کی ابتدا کی تو ان کے کلام کی انفرادیت اور ان کے خوبصورت ترنم کی بنا پر جلدی ہی انہیں مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی اور اس کے بعد وہ اندور کے باہر بھی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ راحت اندوری نے شاعری کی معشوقۂ طناز کو کیوں لگے لگایا اس سوال کے جواب میں راحت نے خود بیان کیا ہے کہ:

''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری مجھے ودیعت ہوئی تھی۔ بہت کم عمری میں میں اشعار موزوں کرنے لگا تھا اور حافظے پر اس قدر گرفت تھی کہ اقبال اور جوش کی طویل ترین نظمیں ازبر تھیں۔ بزم ادب لائبریری میں ایک شعری نشست ہو رہی تھی اور میں سامع کی حیثیت سے باہر کھڑا ہو کر اشعار سن رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آئے وہ میرے آشنا تھے اور مجھے جانتے تھے کہ میں شعر کہتا ہوں اس لئے انہوں نے مجھ سے اس نشست میں شعر پڑھنے کیلئے کہا اس وقت تک مجھے یہ شعور نہیں تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ مشاعرے کے قواعد اور ضوابط کی رو سے صحیح ہے میں نے بہت ہچکچاتے ہوئے ایک غزل پڑھی، جس کا مطلع تھا:

مقابل آئینہ ہے اور تری گلکاریاں جیسے
سپاہی کر رہا ہو جنگ کی تیاریاں جیسے

میرے حافظے کے مطابق یہی غزل میری پہلی غزل تھی جو میں نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں کہی تھی۔ اس غزل میں الماریاں، دھاریاں جیسے نامانوس قوافی نظم کئے تھے، جو اس عہد کی اندور کی فضا

سے مناسبت نہیں رکھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کرنی شروع کی جو مجھے سرے سے شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے اس کے بعد مقامی نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر عزیز اندوری سے اپنے کلام میں اصلاح لی لیکن ان کے اور میرے شعری مزاج میں ایک نسل کا فاصلہ تھا اس وجہ سے یہ سلسلہ بھی چند برس بعد منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے کو ہی اپنا رہنما اور استاد مان لیا۔''(۱)

مشاعروں میں شرکت

دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں مشاعرے کی روایت قدیم بھی ہے اور زیادہ بھی۔ اسے تہذیبی اور ثقافتی روایت کا ایک اہم حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لسانی تہذیب کے تحت یہ خیال خصوصی طور پر مدنظر رہتا ہے کہ مشاعروں کے ذریعے زبان کے فروغ اور علمی اور ادبی تصورات کی توسیع ہو سکے اور سماجی تہذیب کے تحت یہ پہلو پیش نظر رہتا ہے کہ پڑھا جانے والا کلام سماجی حالات و مسائل سے گفتگو کرے اور ان پر اس رو سے روشنی ڈالی جائے کہ سامعین کے سامنے مسائل حیات کی تصویر ابھر کر آجائے۔ مشاعرہ علمی فضا کو ہموار کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس میں پڑھا جانے والا کلام اکثر علمیت کی ان سطحوں کو چھو لیتا ہے، جنہیں صرف کاغذ پر ہی جانچا تولا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس نوع کا کلام مشاعرے کے وقار میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور مشاعرے کو ایک سنجیدہ ماحول عطا کرتا ہے، جسے کتب بینی کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعروں میں اکثر طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ایسا جادو جگا دیتا ہے، جس کے ذریعے سماجی کوائف اور انتشار پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے اور اکثر ایسے مواقع سماجی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرا سکنے کا کارگر وسیلہ بن جاتے ہیں اور اس طرح بڑی حد تک سماجی انتشار کم کر سکنے کا خیال پیدا ہونے لگتا ہے۔

مشاعرہ چونکہ انسانی جذبات احساسات اور نظریات کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے اس

---

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۴۳۸

لئے اس کی اہمیت بھی ہے، بقول ڈاکٹر عزیزی اندوری:

''چونکہ انسانی فطرت اپنے خیالات، احساسات، نظریات اور تنقیدی شعور کے پھیلاؤ اور تبلیغ کی خواہش روز اول ہی سے موجود ہے اس لئے وہ ان ذرائع اور وسائل کے حصوں کی طرف ہمیشہ متوجہ رہتا ہے۔ شعروسخن ان ذرائع اور وسائل کی ایک اہم اور مستحکم شکل ہے۔'' (۱)

مشاعرے میں پیش کیا جانے والا کلام جس قدر دلپذیر ہوتا ہے اسی قدر مشاعرہ بھی پروقار ہوجاتا ہے کلام شاعر کے زود اثر ہونے کی وجہ سے مشاعرہ بھی زود اثر ہوجاتا ہے۔ فراق گورکھپوری مشاعرے کے سلسلے میں اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''میں اس خیال سے بہت کم متفق ہوں کہ مشاعروں کی تعریف یا شعروشاعری کی صحبتوں کی تعریف تنقید نہیں ہے بسا اوقات یہ تنقید بہت پتے کی ہوتی ہے اور کئی موقعوں پر خطوط یا تذکروں یا عام بات چیت میں ضمنی طور پر شعروادب کے بارے میں جو باتیں زبان یا قلم سے اضطراری حالت میں نکل جاتی ہیں وہ تیر بہدف ہوتی ہیں۔'' (۲)

مشاعروں میں شاعر کا تعلق عوام سے براہ راست ہوتا ہے عموماً ایسے مضامین بیان کئے جاتے ہیں جن سے دلچسپی عام ہو، شعر کی ادائیگی کو پرکشش بنانے کیلئے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر کا کام شعر کہہ کر ختم نہیں ہوجاتا شعر کی ترسیل کے آخری مرحلے تک اسے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

آج کل شعر کی زبانی خواندگی اور تحریری پیش کش میں فرق کیا جانے لگا ہے جو بھی تخلیق تحریر میں آکر طباعت کے مراحل سے گزر جاتی ہے اسے آنکھ بند کرکے ادب مان لیا جاتا ہے اور ایسی تحریر جو محض زبانی خواندگی تک محدود رہ جاتی ہو خواہ کتنی ہی اہم ہو اس کا حلقۂ اثر کتنا ہی وسیع ہو اسے محض تفریح اور دل

(۱) ہمارے مشاعرے مطبوعہ تنقیدی تحریریں، ڈاکٹر عزیزی اندوری
(۲) اندازے، فراق گورکھپوری ص ۱۱

بہلا وا سمجھ لیا جاتا ہے، جو بہر حال ہماری کج نگاہی اور نا منصفی اور افسوس کی بات ہے۔

شکیل گوالیاری نے ایسی ہی ایک سچائی کی طرف اپنے ایک مضمون میں آنند بخشی کے مراسلے کو ہو بہو پیش کرتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے:

''ابھی کچھ دن قبل ایک معاصر جریدے میں فلم کے مشہور و معروف شاعر آنند بخشی کا مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں ''میں شاعر تو نام کا ہوں بنیادی طور پر ایک گیت کار ہوں اور تقریباً چار ہزار گیت لکھ چکا ہوں، غور کیجئے چار ہزار گیت لکھ کر شاعر کو کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ شاعر تو نام کا ہے ادھر پچاس غزلیں چھپوا کر ایک مبتدی اپنے کو ایک مکمل شاعر ہی نہیں پکا ادب نواز اور زبان و بیان کو خدمت گار سمجھ لیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر افسوس ناک حالت اور کیا ہوگی۔'' (۱)

مندرجہ روایت خواہ کتنی ہی سچائیوں کی مظہر ہو، اس پر مزید بحث سے دامن بچاتے ہوئے اس امر کی وضاحت اس موضوع سے متعلق یہ ہے کہ مشاعرے کے انعقاد کیلئے اسٹیج کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اسٹیج کا تعلق براہ راست شاعری کے روایتی نظام سے بہت گہرا ہے۔ یہ اسٹیج ہی ہے جو اردو ادب کی جملہ اصناف سخن میں تبدیلیوں کی ترسیل و ابلاغ کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ فکری رجحانات کی توسیع اسی مرکز سے فروغ پاتی ہے۔ سماجی اصلاحی معاشرتی ترقی سیاسی نشیب و فراز اور زندگی کی شکست و ریخت کی سچی تصویریں انہیں مشاعروں کے ذریعے اعلیٰ پیمانے پر پیش کی گئی ہیں۔ مشاعروں میں اسٹیج پر شعراء اپنا کلام سناتے ہیں۔ کلام کی معنوی خوبیوں کے ساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے پیش کرنے کے ڈھنگ کا بڑا دخل ہوتا ہے ساتھ ہی اگر آواز کا رس بھی شامل ہو جائے تو سارا مجمع متاثر ہو کر جھوم اٹھتا ہے۔

راحت اندوری کی شاعری کی ابتدا بہت کچھ اسٹیج سے کلام سنانے سے ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں جب ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی انہوں نے دیواس کے مشاعرے میں اپنی غزل پیش کی تھی، اس مشاعرے میں اردو کے مشاہیر سمجھے جانے والے بیشتر شعرا موجود تھے۔ راحت نے اپنا کلام ترنم سے پیش کیا تھا، کچھ ان

---

(۱) علمہ البیان شکیل گوالیاری، مشمولہ لمحے لمحے بدایوں ص ۱۹۶

کی شروعات کا عہد اوران کی عمر کا بھی دخل تھا، اور ساتھ ہی اس زمانے میں ہندوستان کی ادبی فضا میں ترنم اور غنائیت سے کلام سنانے والے شعراء کی تعداد بھی وافر ہوتی تھی۔ یہیں سے راحت کو محسوس ہو گیا کہ ان کا یہ لہجہ اور انداز تادیر ان کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لئے بعد کے بھساول کے ایک مشاعرے میں انہوں نے تحت اللفظ میں اپنا کلام سنایا اس مشاعرے میں عالم فتح پوری اور خمار بارہ بنکوی جیسے کہنہ مشق اور معتبر شاعر بھی موجود تھے۔ راحت کے انداز اوران کی آواز میں ایسی کھنک اور سحر انگیزی تھی کہ وہ مشاعرہ ان کو ملنے والی داد و تحسین سے گونج اٹھا۔ بعد میں انہیں بزرگوں کے مشورہ سے راحت نے ترنم کو خیر باد کہہ کر ترنم سے پڑھنے کی عادت استوار کر لی۔ آج عالم یہ ہے کہ بڑے سے بڑے ہندو پاک کے مشاعروں میں اچھے اچھے مترنم اور تحت گو شعراء راحت کے بعد کلام پڑھنے میں جھجھک سی محسوس کرتے ہیں اور پھر تو ان کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک جھلک بلیا کے مشاعرے، میں یوں دیکھنے کو آئی وہاں کے ٹاؤن ڈگری کالج کے مشاعرے میں راحت بہت تاخیر سے پہنچے تھے مجمع بے کیفی محسوس کرتے ہوئے اکھڑنے سا لگا، لیکن جیسے ہی راحت کے پہنچنے کی آواز گونجی مجمع پھر سمٹ کر آ گیا اور سارا پنڈال بھر گیا۔ اسی طرح کوٹہ شہر کے مشاعرے میں بھی حال ہوا یہ وہاں کی نمائش کا کل ہند مشاعرہ تھا مشاعرہ گاہ میں سامعین کا ہجوم تھا اچانک پانی گرنے لگا، افراتفری کا عالم ہو گیا۔ ایسے میں راحت کو دعوت سخن دی گئی۔ راحت کلام سناتے رہے مجمع ٹس سے مس نہ ہوا حالانکہ بارش ہو رہی تھی یہ سلسلہ لگ بھگ اسی طرح ایک گھنٹہ تک رہا۔

راحت اندوری کے مشاعرے میں پیش کش کے منفرد انداز پر مضطر مجاز نے لکھا ہے:

''راحت پہلے تو شعر کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں اور بڑی جادوگری کے ساتھ اسے پورے مشاعرے پر چادر کی طرح پھیلا دیتے ہیں۔'' (۱)

شعر کو اپنے اوپر مسلط کرنے یا طاری کرنے کے تعلق سے راحت اندوری اپنا خیال یوں پیش کرتے ہیں:

---

(۱) مضطر مجاز، ماخوذ از امکان لکھنؤ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ ص ۲۸

کاغذ کو سب سونپ دیا یہ ٹھیک نہیں
شعر کبھی خود پر بھی طاری کیا کرو

کاغذ سے اپنی بے نیازی کا اظہار راحت نے اور بھی کئی جگہ کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر شعر ہے تو چاہے مشاعروں کے ذریعے یا کاغذ کے راستے سے آئے اپنا مقام ضرور بنائے گا''

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''میری غزل یا تو میرے لئے ہوتی ہے یا میرے سامعین کیلئے۔ قارئین (سکہ بند رسالے والوں) سے میرا رشتہ کوئی خاص گہرا نہیں ہو پایا۔، جس کا مجھے افسوس ہے'' (۱)

ترسیل و ابلاغ کے اہم وسیلے یعنی پرنٹ میڈیا کے تعلق سے راحت اندوری نے اپنی بے نیازانہ روش کا اظہار اپنے کئی اشعار کے ذریعے بھی کیا ہے، مثلاً:

لوگ ہونٹوں پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں مجھے
میری شہرت کسی اخبار کی محتاج نہیں

اس سلسلے میں ڈاکٹر محبوب راہی کا یہ مشورہ نہایت صحیح ہے کہ:

''ان کی آواز لاکھ متاثر کن ہو اپنے لہجے کی تمام گھن گرج اور انداز بیان کی سحر انگیز دلکشی یہ سارا طلسم ایک معین مدت گزر جانے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ رسائل اور جرائد اور کتابوں میں وہ آئندہ کئی صدیوں تک محفوظ ہو جائیں گے کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی کے وسیع تر پھیلاؤ کے باوجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت کو اب بھی تسلیم کیا جا رہا ہے اور آئندہ بھی اس کے مکمل طور پر رد کر دینے کے امکانات کم ہیں۔'' (۲)

راحت کے مشاعرے کے بلا مبالغہ سب سے بڑے شاعر ہونے کے باوجود محض مشاعرے کے نہیں ہیں اعلیٰ و ارفع معیار کے حامل سنجیدہ ادب میں بھی وہ ایک مقام و وقار و اعتبار کے مستحق ہیں۔ اس

(۱۔۲) بحوالہ ڈاکٹر محبوب راہی، راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک امکام لکھنؤ ماہنامہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ ص ۳۵

میں شک نہیں کہ محمد حسین جونپوری، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے پڑھنے کی نقل کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں لیکن راحت کی نقل اتارنے کی کوشش میں بڑا خطرہ مول لینا ہے اور اکثر نقل مطابق اصل کے نہ ہوکر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ راحت کے انداز کی نقل میں بیشتر لوگوں کی نقالی راحت دکھائی دینے کے بجائے ''سرکس کا مسخرہ معلوم ہونے لگتا ہے'' بقول وامق جونپوری ''راحت ایک باشعور فنکار ہے جو اپنے اسلوب کے خطرات سے واقف ہے۔ وہ ایک روپ ڈانسر (تنی ہوئی رسی پر ناچنے یا چلنے والا) کی طرح بڑھتے ہیں اپنے حرکات کے مرکز نقل کو الفاظ و خیالات کو دائرہ جسم کے باہر نہیں جانے دیتے کہ مبادا توازن کھو بیٹھے اور تالی پٹ جائے۔'' (۱)

اسی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وامق جونپوری لکھتے ہیں:

''راحت ایک کامیاب ترین تحت اللفظ کا شاعر ہے۔ چند مبصرین اس کو مشاعرے کا سلطانہ ڈاکو کہتے ہیں۔ مجھ کو ان حضرات سے اتفاق نہیں اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ مشاعروں کو لوٹ لیتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنے خاص اسلوب تحت اللفظ اپنے تازہ مزاج صحت منداور تلخ وشیریں کلام کو لٹا دیتا ہے وہ بہت آسان زبان میں شعر کہتا ہے جس کا اعلان وہ یوں کرتا ہے:

ہم نے سیکھی نہیں ہے وہ قسمت سے
ایسی اردو جو فارسی بھی لگے

''خیالات اتنے سیدھے سادے اور غیر پیچیدہ بھی نہیں ہوتے کہ ہر شخص ان کو بہ آسانی سمجھ لے اور اس کا نام اچھی شاعری سے راحت اپنے منفرد اسلوب تحت اللفظ میں شعر کی وہ تصویر کھینچتا ہے کہ اس کا کلام سامعین کے ذہن میں نشتر کی طرح اتر جاتا ہے۔'' (۲)

اپنی خود اعتمادی کی بدولت راحت کو دنیائے اردو نے مشاعروں کے ڈائس سے راحت اندوری کی منزل تک کا سفر طے کرتے دیکھا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں مشاعروں کی محفلیں سجتی ہیں ہندوستان کا یہ

---

(۱) 'شاید کہ تری دل میں اتر جائے مری بات' وامق جونپوری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۰

(۲) 'شاید کہ تری دل میں اتر جائے مری بات' وامق جونپوری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۶

نمائندہ شاعر سوال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

گلاب خواب دوا زہر جام کیا کیا ہے
میں آگیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے

اسی لئے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں:

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

آج حال یہ ہے کہ دنیا کے ہر کونے سے مشاعروں کے دعوت نامے ان کے پاس آتے رہتے ہیں انہوں نے ابھی تک کتنے مشاعرے پڑھے اس کا شمار آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہیں تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں جن کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ ان سب باتوں کا یہی لب لباب ہے کہ مشاعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہی مشاعرے ہیں جنہوں نے راحت کو مقبولیت کے چرخ چہارم تک پہنچا دیا ہے۔ آج مشاعروں میں ان کی شمولیت مشاعروں کے وقار کا سبب بنتی ہے، اس میں شک بھی نہیں کہ راحت نے مشاعروں میں شریک ہوکر اس طرح اردو کی لسانی تہذیب کو فروغ دیا ہے جس طرح ہمارے قلمکار اپنے زور تخلیق سے کتب یا رسائل کے حوالے سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

آج اندرون ملک کے تمام اہم ترین مشاعروں میں راحت کی شرکت لازمی سی ہوگئی ہے یہی نہیں بلکہ غیر ملک کے بھی بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں راحت اندوری نے کراچی کے ان آٹھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، جن میں ہندوستان سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگناتھ آزاد اور فنا نظامی جیسے مشاہیر قد آور شعرا بھی شریک ہوئے تھے۔ ان مشاعروں میں راحت کے کلام کی اس قدر پذیرائی اور شہرت ہوئی کہ انہیں بیرون ہند کے مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ ۱۹۸۷ء میں راحت نے کراچی کا سفر کیا اور انعقاد پذیر ۱۳ مشاعروں میں انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنا کلام سنایا۔ ۱۹۹۴ء میں سلطنت عمان کے ایک مشاعرے میں راحت نے شرکت

کی، جس میں ہندوستان سے آل احمد سرور، معین احسن جذبی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، شہر یار اور بشیر بدر نے بھی شرکت کی تھی اور مشہور فلم اسٹار نصیر الدین بھی شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے میں کامیاب ہونے والے شاعروں میں راحت اندوری کا نام بھی شامل تھا۔ ۱۹۸۸ء میں پھر وہ بیرون ہند کے سفر پر روانہ ہوئے اور دوحہ، قطر، دبئی کے عالمی مشاعروں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا کلام سنایا۔ ان مشاعروں میں ہندو پاک کے متعدد شعراء بھی شریک ہوئے تھے اور پھر ۱۹۸۹ء میں راحت نے دبئی کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے علاوہ ابوظہبی، العین اور عمان وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور اسی سال وہ بزم ادب بحرین کے مشاعرے میں خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔ عرب ممالک کے علاوہ بھی راحت نے دوسرے ممالک جیسے بنگلہ دیش، ماریشس وغیرہ کا بھی مشاعروں ہی کی خاطر سفر کیا۔ ان تمام مذکورہ مشاعروں کے علاوہ بھی انہوں نے ۱۹۹۱ء میں امریکہ کا سفر کیا اپنے وہاں کے ایک ماہ قیام کے دوران انہوں نے کئی بڑے مشاعروں میں اپنی شاعری کی جوت جگائی ان میں نیویارک، واشنگٹن، ڈیلس، لاس اینجلس، سائل سنائی، کلولینڈ اور نیوجرسی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان مشاعروں میں راحت کے کلام کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں ان کے آخری مجموعے کلام پانچواں درویش کی جلدیں آناً فاناً نہ صرف یہ کی فروخت ہوگئیں بلکہ گھٹ گئیں۔

راحت کے اندرون ملک مشاعروں میں خاطر خواہ کامیابی جہاں انہیں حاصل ہوئی ان کے اسماہیں:

جشن جمہوریت لال قلعہ دہلی کا مشاعرہ۔

عالمی اردو کانفرنس دہلی اور حیدرآباد کا مشاعرہ۔ دہلی کلاتھ ملز کا مشاعرہ۔

شنکر میموریل حیدرآباد مشاعرہ۔

اردو ٹرسٹ حیدرآباد کا مشاعرہ۔

پنجاب ایسوسی ایشن حیدرآباد کا مشاعرہ۔

بزم ادب پٹھان کوٹ اور فرید کوٹ کا مشاعرہ۔

مغل آرٹ محمد علی لائبریری کا مشاعرہ۔

بوکارو اسٹیل اتھارٹی بوکارو کا مشاعرہ۔

سرسنگار سمد ممبئ کا مشاعرہ۔

بھوپال کے ایک مشاعرہ میں راحت کا عوامی طور پر شاندار استقبال کیا گیا اور ان کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے انہیں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔

ان مشاعروں کے علاوہ انہوں نے کانپور، علی گڑھ، مظفر نگر، میرٹھ، لکھنؤ اور دیوبند وغیرہ جیسے اردو کے بڑے مراکز کے مختلف مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا ہے ان میں کئی سرکاری اور نیم سرکاری مشاعرے بھی شامل ہیں۔ مشاعروں میں راحت اندوری کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ڈاکٹر بشیر بدر کے اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے، ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری ایسے کامیاب خوش نصیب شاعر ہیں، کہ ان کے مشہور شعر ہماری اعلیٰ غزل گوئی کے تنقیدی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ دراصل یہ امتیاز ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مشاعروں میں وقتی کامیابی کے شعر سے زیادہ اسٹیج پرفارمنس Stage Performance کی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ مشاعرے میں شاعر کی اداکاری یا ترنم کی لالہ کاری سے مشہور ہونے والا منظر شاعر کا بڑا دشمن ہے۔ وہی وقتی شہرت اس کی دائمی بدنامی کا ثبوت ہوتی ہے لیکن کیسی ہی اداکاری سے کتنے ہی ڈرامے سے کیسے ہی ترنم سے اگر اچھا شعر سامنے آتا ہے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ ترنم اور اداکاری صبح رخصت ہوجائیں گے اور شعر اپنی اصلیت پر سفر کرے گا۔ راحت اندوری ایسے خوش نصیب شاعر ہیں کہ مجموعی طور پر ان کے وہ شعر عوام میں مشاعروں کے وسیلے سے مشہور ہوئے ہیں جو سینہ بہ سینہ سفر کریں یا کاغذ پر آئیں۔ اپنی شاعرانہ صداقت کی وجہ سے آج کی غزل کے سرمایہ کا حصہ ہوجاتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) کالے گلاب کی خوشبو۔ مطبوعہ فاران، مضمون نگار ڈاکٹر بشیر بدر کھریا بنارس ص ۳۵

اعزازات وانعامات

یہ بات بغیر کسی شک وشبہ یا خوف تردید کے کہی جاسکتی ہے کہ راحت اندوری نے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ اعزازات حاصل کئے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ ان کی ادبی وشعری پیش کش کی صلاحیتوں کی بنا پر عالمی پیمانے پر ان کی مقبولیت میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔

انہیں اب تک جو ادبی اور قومی اعزازات ملے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

''مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے مشہور شاعر محمد علی تاج کے نام سے منسوب ایوارڈ یہ ایوارڈ صوبے کے نوجوان شعراء جو باصلاحیت بھی ہوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ راحت اندوری کو دیا گیا تھا۔

اسی طرح بھوپال سے ''ہم ایک ہیں'' نامی انجمن کی جانب سے ''غزل ایوارڈ'' ہندی ساہتیہ پریشد کی طرف سے ساہتیہ رتن، اتر پردیش اردو لٹریری فورم کی طرف سے قومی ایکتا ایوارڈ۔

نیشنل ڈیموکریٹک فورم دہلی کی طرف سے قومی یک جہتی ایوارڈ۔

بزم ادب نینی تال کی طرف سے اندرا گاندھی ایوارڈ۔

چترانجھی آگرہ کی طرف سے فراق گورکھپوری ایوارڈ۔

بزم ادب جھانسی کی طرف سے مرزا غالب ایوارڈ۔

ان گرانقدر اور لائق ذکر ایوارڈ کے علاوہ بھی ان کو طرح طرح کے ایوارڈس سے نوازا جاتا ہے ،جن کا احاطہ آسان نہیں ہے۔ ان تمام اعزازات کے علاوہ راحت اندوری کی ادبی وشعری صلاحیتوں اور خدمات کے پیش نظر مختلف شہروں میں مختلف تنظیموں کی طرف سے جشن منائے گئے ان میں بنارس، مرادآباد، دیوئی، بھوپال، مالیگاؤں، چندوسی، مئو اور اندور جیسے ادبی مراکز شامل ہیں۔ ان جشنوں میں راحت اندوری کی شخصیت اور ان کے کلام پر مشاہیر اہل قلم نے نہایت اہم اور قابل ذکر تاثرات پیش کئے

ہیں چند بخاطر ملاحظہ پیش ہیں:

پروفیسر قمر رئیس دہلی کے تاثرات ہیں:

''راحت کی غزل صرف سامعین کو چیخنے اور قارئین کو چونکنے کی ترغیب دینے والی شاعری نہیں ہے۔ یہ زخموں کو کریدنے احساس کی آنچ کو بڑھانے اور سوچ کو مضطرب بنانے والی شاعری ہے۔ یہ ایک ایسی نئی کمان کا تیر ہے، جو جدید میزائلوں کی طرح اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتا ہے۔اس کی غزل رومان پرور فضاؤں میں سانس نہیں لیتی، زندگی کی سچائیوں سے غذا حاصل کرتی ہے۔ راحت نے اپنی غزل کے موضوعات ہی نہیں رموز وعلائم بھی اردگرد کے مانوس ماحول سے لئے ہیں۔اس کے یہاں بے چین اور گونگے الفاظ بھی بول پڑتے ہیں اور چپکے سے کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو دلوں کو بے چین کر دیتی ہے، راحت کا لب ولہجہ کوش آہنگ پیکر آفرینی اور معنوی تہہ داری ایسے اوصاف ہیں، جو ان کی غزل کو اپنے معاصرین سے منفرد کرتے ہیں۔ راحت کے تخلیقی سفر میں اس کی اگلی منزلوں کے روشن نشانات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔''

عبدالقوی دسنوی بھوپال لکھتے ہیں:

''راحت اندوری صاحب گزشتہ کئی برسوں سے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی شناخت بنانے اور انہیں مقام حاصل کرانے میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے رہے ہیں اللہ نے انہیں اچھی شاعری کے ساتھ اچھی آواز سے بھی نوازا ہے اس لئے مشاعروں میں دھوم مچا دیتے ہیں۔''

''راحت اندوری اپنی شاعری کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ زندگی کے تلخ اور شیریں تجربوں او ر حقیقتوں کو پیش کرتے رہے ہیں۔ قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے ہوئے اپنا قدرداں بناتے رہے ہیں، بیشک ان کی شاعری اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ وہ شاعری کی دنیا میں اور نیک نام ہوں اور اردو کے خزانے میں نمایاں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوں۔''

احتشام اختر (کوٹہ) لکھتے ہیں:

''راحت اندوری میرے پسندیدہ شاعر ہیں، ان کے کلام میں بلا کی تازہ کاری اور جدت ہے، جتنا اچھا وہ لکھتے ہیں اس سے زیادہ اچھے انداز سے وہ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے ہیں، مجھے انہیں مشاعروں میں سننے کا موقع ملا ہے راحت اندوری نے نئی شاعری کو مشاعروں میں مقبول بنایا ہے یہ ان کا ایک کارنامہ ہے ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے، خود مجھے بھی یہ شعر ذاتی طور پر پسند ہے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد رقم طراز ہیں:

''.........ذہین طباع اور خوش اخلاق راحت اندور سے نکلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک بن کر ہمارے مشاعروں کے مطلع پر چھا گئے جب میں نے پہلی بار ان کو سنا تو وہ ترنم سے اپنا کلام پڑھ رہے تھے۔ ترنم اچھا تھا مگر ان کی شاعری اور ان کی شخصیت سے ہم آہنگ نہ تھا، پھر انہوں نے تحت میں پڑھنے کا وہ طریقہ ایجاد کیا، جس کے بانی اور خاتم وہ ہی گردانے گئے۔ یہ انداز شعر خوانی آغا حشر کے ڈراموں کے کرداروں کے جیسا تھا جسمیں الفاظ اپنے معنیٰ اسم اپنے مسمیٰ اور ثمر اپنے مغز کا اشاریہ بنتا تھا مشاعروں کی شب بیداری اور سفر کی صعوبتیں راحت کے ادبی اور علمی سفر میں حائل نہیں ہوئیں۔ وہ خوب سے خوب تر کی جانب بڑھتے گئے، شرر، ستارہ اور ستارہ آفتاب بنا، انہوں نے ایم اے کیا اور مشاعروں پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ہنگامہ پروری نے سنجیدگی کا لباس پہنا، مشاعروں کی جادوگری میں علمی اور ادبی وقار شامل ہوا اور پھر جب ایک مشاعرے میں انہوں نے اپنا معرکتہ الآراء شعر پڑھا:

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

تو علی سردار جعفری کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی، انہوں نے سراپا داد بن کر میری طرف دیکھا

اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر نوٹ کرلیا۔ راحت کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں عالمی سطح پر مشاعروں کے حوالے سے ان کا نام جانا پہچانا جاتا ہے۔ شہر ادب کی فصیلوں پر تعلقات، رسوخ گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی کا دودھ پی کر بڑے بڑے ناگ لہرا رہے ہیں، نئے آنے والوں کیلئے دروازہ مشکل سے کھولتے ہیں مگر راحت کے ہاتھوں کی دستک اور قدموں کی دھمک اتنی تیز ہے کہ اگر ٹھیکے داروں نے دروازہ نہ کھولا تو شہر ادب کی فصیل میں شگاف پیدا کر کے چیختے اور چنگھاڑتے ہوئے اپنی شاعری کو عہد حاضر کی تاریخی دستاویز بنا کر اس میں داخل ہو جائیں گے اور کوئی ان کو روک نہ سکے گا۔''

ساغر خیامی دہلوی کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر قلم اٹھانے میں یہ قباحت درپیش ہے کہ میں جو بھی دائرہ کھینچتا ہوں اس دائرے سے ان کی شخصیت اور فن باہر ہو جاتا ہے اور الفاظ میرے قلم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں راحت اندوری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو چوری نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان کے انداز کے شعر کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو وہ انداز سخن عطا کیا ہے، جس پر رشک آتا ہے۔ راحت کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اگر ان کو انسان کہوں تو فرشتے کیسے ہوتے ہیں۔ اگر فرشتہ کہوں تو انسان کیسے ہوتے ہیں۔ وہ انسان اور فرشتہ کے بیچ کی کڑی ہیں اپنے بڑوں کا ادب کرنا ان کا شیوہ ہے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کے ضمیر میں ہے، ان کی یہ صفت ان کے ہی ایک شعر سے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

آپ کی نظروں میں سورج کی ہے جتنی عظمت
ہم چراغوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں

بہرحال ایسے شاعر اور فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اس صدی میں جینے والے قابل تحسین اور مبارکباد ہیں کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے، جس میں راحت اندوری اپنی پوری ادبی تابانیوں کے ساتھ موجود ہیں میری دعا ہے کہ اللہ ان کو طویل عمر اور صحت عطا کرے تاکہ وہ علم وفن

کے چراغوں کو روشن کر سکیں۔''

ان آراء کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کا کوئی حریف نہیں اور نہ ان کی کسی سے چشمک ہی ہو سکتی ہے جو شخص بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ برقرار رکھنے کا خوگر ہو صرف انا کی بنیادوں پر اس کی شخصیت نہ استوار ہو اس کا کوئی حریف کیسے ہو سکتا ہے۔ ویسے اردو تاریخ میں ایسی مثالیں قدما سے لیکر عہد حاضر تک دیکھی جا سکتی ہیں کہ آپسی شاعرانہ چشمک ہر عہد میں رہی۔ لیکن راحت کے ساتھ ایسا کوئی معرکہ جوڑا نہیں جا سکتا کہ کسی شاعر یا ادیب سے ان کی چل رہی ہو۔ راقم کے خیال کو تقویت ان شخصیات کی آراء سے بھی حاصل ہوتی ہے جو راحت کی طرح اندور سے تعلق رکھتے ہیں، مثال کے طور پر اندور کے چند اکابرین ادب کی آراء ملاحظہ کیجئے:

پروفیسر اے اے عباسی (اندور) تحریر کرتے ہیں:

''۱۹۳۶ء میں آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم انگلینڈ گئی تو وہاں کے ایک اخبار نے اس ٹیم کے ہر کھلاڑی کا تعارف ایک ایک پیراگراف میں شائع کیا جب سر بریڈ مین (جو اپنے کھیل کی زندگی کی معراج پر تھے) کا نمبر آیا تو اخبار نے لکھا کہ ''بریڈ مین تو بریڈ مین ہیں'' موجودہ عصر کے نوجوان شعراء کا تعارف کراتے وقت ایسی ہی بات راحت اندوری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ ''راحت اندوری تو راحت اندوری ہیں۔''

''میرا راحت سے تعارف عرصے سے ہے مگر اس تعارف کی شکل کچھ ایسی ہے، جیسے کسی نمائش میں کسی دلکش کھلونے کو دیکھ کر کوئی بچہ رک کر اسے دیکھے، آنکھ بچا کر چھو لے مگر قیمتی ہونے کی وجہ سے خریدنے کی ہمت نہ کرے۔ اور آئندہ سال کی نمائش تک کیلئے اپنی خواہش کو دبا دے۔ راحت اسی طرح میری گرفت سے کھسکتے رہے ہیں چند سال ہوئے راحت قنوج (یوپی) کے مشاعرے میں شرکت کیلئے گئے تھے، تعطیلات گرما میں جب قنوج گیا تو پتہ چلا کہ راحت شہر کے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا گئے ہیں۔''

''اردو شاعری پر روایتی شاعری بہت حاوی رہی ہے اور جس شاعر نے بغاوت کرنے کی

جسارت کی وہ شروع شروع میں پریشان ہوا لیکن اگر ڈٹا رہا تو میدن جیت لیا۔ راحت اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ وہ سماج کے جس طبقے میں پیدا ہوا وہ دنیا کے ہر ملک کا سب سے بڑا طبقہ ہوتا ہے۔ (متوسط طبقہ) اوراس کے مسائل کی عکاسی راحت نے بحسن وخوبی کی ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کو راحت بہت عمیق نظر سے دیکھتا ہے اوراشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے اس کا جو پہلو دوسروں سے انوکھا ہے وہ ہے اس کے تیور۔ اس کے تیوروں میں عزم وحوصلہ ہے اس کی غزل میں وہ رومانیت نہیں ہوتی، جوغزل کا تقاضہ ہے مگر رومانیت کی راہ سے وہ زندگی کی اصلیت بتاکر تڑپا دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے والوں کو ہی سراہا جاتا تھا مگر راحت نے تحت اللفظ کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ جگر مرادآبادی کے ترنم کی نقل کرنا ان کے زمانے میں عام فیشن تھا۔ آج راحت کی طرح اشعار پڑھنا دوسرے شاعرشان سمجھتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹرایم اے فاروقی (اندور) راحت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''راحت کے بارے میں کچھ لکھنا آفتاب کو دیا دکھانا ہے میرے لئے فخر کی بات ہے کہ جس دور میں راحت اندوری اسلامیہ کریمیہ کالج کے شعبہ اردو میں پروفیسر تھا میں وہاں پرنسپل تھا اور اس دوران انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ راحت اندوری آج شاعری کا طویل سفر طے کرتے ہوئے کامیابی کی جس منزل پر پہنچے ہیں اس میں اسلامیہ کریمیہ کالج کا تعاون بھی شامل ہے راحت جب بھی ملے اسی خندہ پیشانی اورانکساری سے ملے، غرور کا کہیں نام ونشان نہیں دور دور تک اس بات کا احساس نہیں کہ عالمی شہرت یافتہ شخصیت بن چکے ہیں۔ پروردگار سے یہی دعا ہے کہ اردو ادب کی خدمت کیلئے راحت کو لمبی عمر عطا کرے۔''

مندرجہ کلمات راحت کی شخصیت اورفن پر بیان کردہ داخلی شواہد کے طور پرتسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ یہ بات ضرور حیرت انگیز ہے کہ آسمان ترقی اور مقبولیت تک پہنچ کر بھی ان میں غرور وتمکنت کا کوئی

---

(۱) تاثرات پروفیسر اے اے عباسی

شائبہ نہیں اور جہاں تک ان کے کلام اور انداز پیش کش کا تعلق ہے انہوں نے اپنے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

راحت اندوری کے جو پہلے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں اُن کی ارباب ذوق اور اہل دانش کی نظر میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے، پہلا مجموعہ ''دھوپ دھوپ'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ رُت ''دیوناگری میں'' ۱۹۸۳ء میں چھپا۔ تیسرا مجموعہ ''میرے بعد'' یہ بھی دیوناگری میں ۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوا اور چوتھا مجموعہ اردو میں پانچواں دوریش ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا، جہاں تک دوسرے مجموعہ ہائے کلام کا تعلق ہے یہ پسندیدگی اور پذیرائی کے لحاظ سے سب سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ راحت کا ایک اور مجموعہ کن فیکون زیر طبع ہے، جو راقم کی نظر سے ابھی نہیں گزرا ہے۔ لیکن یقین ہے کہ وہ بھی راحت کے پچھلے مجموعوں کے مقابلہ میں اگر بڑھ چڑھ کر نہیں تو ان کا ہم پلہ ضرور ہوگا۔ اس بیچ دیوناگری میں الکل ناراض نام سے ۲۰۰۹ء میں ایک نیا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

راحت کی شادی اور اولاد

راحت کی شادی دیواس میں سیما خاتون سے ہوئی، جن کا تعلق ایک شریف اور متوسط گھرانے سے تھا۔ راحت کی ان اہلیہ سے تین اولادیں ہوئیں، سب سے بڑی جوہی (ایک بیٹی کا نام) ہے جس کی ولادت ۲۷ر ستمبر ۱۹۷۸ء ہے۔ فیصل قریشی کا سن پیدائش ۱۶ر جون ۱۹۸۰ء ہے، اور ستلج قریشی کا سن پیدائش ۱۱ر مارچ ۱۹۸۲ء ہے۔

راحت کے والد نے متعدد مکان بدلے، آخر جب انہوں نے اپنا مکان خود تعمیر کروالیا تو وہاں مع اہل وایال اس میں رہنے لگے۔ راحت نے کھجرانہ میں اپنا نہایت خوبصورت مکان بنوالیا ہے اس لئے اکثر کھجرانہ والے مکان میں رہتے ہیں اور اپنے والد کے بنوائے ہوئے مکان میں بھی رہائش رکھتے ہیں اس طرح باری باری وہ کبھی شری نگر ایکسٹنشن (والد کے تعمیر کردہ مکان) اور کبھی کھجرانہ (اپنے تعمیر کردہ مکان) میں رہتے ہیں۔

راحت اندوری کے شوق، اخلاق وعادات

راحت اندوری نے اس عہد میں جب ہر طرف قحط الرجال جیسا منظر نامہ ہے، خوش اخلاقی، ایثار پسندی، مروت اور رواداری کے ایسے ثبوت بہم پہونچائے ہیں جن سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ اس آؤٹ ڈیٹیڈٹ (Out dated) زمانے میں کسی طرح نباہ رہے ہیں اس کا ثبوت ان کے چھوٹے بھائی عادل قریشی کے مطابق اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ راحت کا سب سے زیادہ بلکہ واحد شوق نئے نئے کپڑے سلوانے اور پہننے کا تھا۔ اسی سلسلے میں خاص لطف کی یہ بات ہے کہ وہ ان نئے کپڑوں کو لاکر سب سے پہلے اپنے بھائی عادل کو پہننے کیلئے دیتے تھے اور پھر بعد میں انہیں خود پہنتے تھے یہ طریقہ ان کا کافی دنوں تک بدستور چلتا رہا۔ محض چند سالوں سے اس پابندی کی شدت میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ راحت نہایت بااخلاق بامروت اور رنگارنگ طبیعت ومزاج کے حامل ہیں۔ شہرت کی بلندیوں پر فائز رہ کر بھی وہ زیادہ تر غریب لوگوں، رشتہ داروں اور پرانے دوستوں سے عام لوگوں کے برعکس ملنا جلنا اور مراسم رکھنا نہیں بھولتے، ان کے بھائی عادل قریشی کا بیان ہے:

''خدا کا شکر ہے کہ شہرت کے آسمان پر پہنچنے کے باوجود زمین سے راحت بھائی کا رشتہ استوار ہے، شکاگو یا نیویارک کا مشاعرہ پڑھ کر لوٹنے کے بعد ان کا پہلا ٹھکانہ آج بھی رانی پورہ کا پٹیا ہی ہوتا ہے۔ بچپن کے جوانی کے دوست جو کڑے وقت کے ساتھی تھے آج بھی اقربا کی ان کی لسٹ میں وہی نام موجود ہیں جو شخص اپنے دوستوں کی بیماری یا دکھ کو دیکھ کر رو پڑتا ہو اور اپنی حیثیت سے زیادہ مدد کرنے کیلئے بیتاب رہتا ہو اس کے بارے میں یہ بتانا بے معنیٰ ہے کہ والدین کے آخری دنوں میں انہوں نے کس طرح اور کتنی خدمات انجام دی ہیں .... رشتہ داروں کی خوشی یا غم میں شریک ہونا راحت بھائی کا معمول ہے۔ ایسے موقعوں پر انہوں نے کبھی نہ نہیں دیکھا کہ کون سا مشاعرہ چھوٹ رہا ہے یا اکسپوز Expose کا کتنا اہم چانس Chance ہاتھ سے جارہا ہے۔''(۱)

(۱) چھوٹے بھائی جان، عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء، ص ۴۲۹

راحت کے اخلاق اوران کی شرافت نفس پر روشنی ڈالتے ہوئے معراج فیض آبادی لکھتے ہیں:

''ایک ذاتی بات بھی .... میرے اپنے خاندان میں کتنے لوگوں نے مجھ سے اپنے بچوں کے لئے نام پوچھے لیکن رکھے کسی نے بھی نہیں، راحت کا بیٹا فیصل جب پیدا ہوا تو راحت نے یہ خوش خبری مجھے سنائی اور کہا کہ معراج بھائی اس بچے کا نام آپ کو رکھنا ہے، میں نے اس کا نام ''فیصل'' رکھا، میں جانتا ہوں کہ راحت کے اہل خاندان نے بہت سے نام اور تجویز کئے ہوں گے، ہوسکتا ہے اس نام کی مخالفت بھی ہوئی ہو مگر آج میرے قد سے کچھ اونچا وہ بیٹا فیصل ہو رہا ہے۔ خدا اُسے اپنے حفظ وامان میں رکھے، بظاہر یہ ایک بہت معمولی سی بات ہے مگر سوچئے تو راحت کی شرافتوں کی آئینہ دار ہے۔''(۱)

جوہر کانپوری اپنی راحت سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''..................اس دن مجھے احساس ہوا کہ جس کا نام راحت اندوری ہے وہ ایک عظیم فنکار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہے۔ رفتہ رفتہ قربتیں بڑھنے لگیں ان کے قریب آنے پر محسوس ہوا کہ ایک اچھا انسان ہونے کیلئے جو اوصاف ضروری ہیں وہ سب کے سب راحت اندوری میں موجود ہیں اپنے بزرگوں کا احترام جیسے ان کے جینے کا مقصد ہو اپنے چھوٹوں پر شفقت لٹانا جیسے ان کا محبوب مشغلہ ہو، مہمانوں کی مدارات کو وہ جیسے عبادت سمجھتے ہوں، ضرورت مندوں کی امداد کرنا وہ فرض اولین سمجھتے ہوں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اگر وہ بڑے بھائی بن کر ملیں تو آدمی اپنے حقیقی بھائیوں کو مل جائے، دوست بن کر ملیں تو دوستی ناز کرے، اپنے غم کو بھول کر دوسروں کے غموں کو سمیٹنا ان کے قلندرانہ مزاج میں شامل ہے اپنے آنسو پی کر دوسروں کی دلجوئی کرنا ان کی فطرت ہے۔ گرے ہوؤں کو سہارا دینا ان کی عادت ہے ان میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ دوست تو وہ ایسے ویسوں کو بنا لیتے ہیں، لیکن دشمن وہ اپنے معیار کا چاہتے ہیں۔ کسی نے ان سے دشمنی کی بھی تو انہوں نے یہ جنگ تلوار سے نہیں اخلاق سے جیتی ہے۔''(۲)

---

(۱) بائیں کاندھے کا فرشتہ، معراج فیض آبادی، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۵۴

(۲) میرا آئیڈیل راحت اندوری، جوہر کانپوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۳۷۶

راحت اندوری کے اخلاق اور دوستی نبھانے کے جذبہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور ناظم مشاعرہ انور جلال پوری کا یہ تاثر ملاحظہ کیجئے:

''راحت کا تعلق دوستوں سے عشق کی حد تک مضبوط ہے اسے وفاداری اور بے وفائی کی حدود کا علم ہے، وہ منزل آنے سے پہلے راستے میں کسی ہم سفر کے رویے پر تبصرہ کرنے کو بے وقت کی تنقید سمجھتا ہے، وہ دشمنی کا روپ اختیار کر لینے والی دوستی کو حالات کی ستم ظریفی سے تعبیر کرتا ہے۔ منافقت عیب جوئی سے اس کا مزاج کوئی سمجھوتا نہیں کرتا اس نے زندگی کو کھلی کتاب بنا رکھا ہے۔ اس کی میخواری پر تبصرے بھی عام تھے، اور اب اس کی ترک مے نوشی کے تذکرے بھی عام ہیں۔ اس نے پی، خوب پی، برسوں تک پی، جتنی خود پی اس سے زیادہ دوستوں کو پلائی، میکدے میں پی، ہوٹلوں میں پی، ریل گاڑیوں میں پی، ہوائی جہاز میں پی، زمین کے اوپر پی، آسمان کے نیچے پی، مگر جو کچھ کیا سے کسی سے چھپایا نہیں اس نے اپنے اصلی چہرے پر کوئی نقلی چہرہ نہیں لگایا اسی لئے تو بڑے اعتماد سے وہ کہتا ہے:

یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ بت خانہ ہے
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں (۱)

راحت اندوری صاحب ظرف ہیں اس لئے محسن کشی جیسی لعنتوں کا وہ کبھی شکار نہیں رہے اور پھر اس معاملے میں وہ کبھی کسی معیار کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر کسی نے ذرا سا بھی حسن سلوک کیا یا اس کا اظہار کیا راحت اس کی عنایت اور مہربانی کے قائل ہو جاتے ہیں اس رویے سے اکثر ان کو تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں کبھی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے اور کبھی خلاف امید درپیش ہونے والی مصیبتوں میں پھنس بھی گئے مگر اس کے باوجود ان کا پیمانہ ظرف کبھی چھلکا نہیں۔ اس کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی فطرت صلح کل کی طرف بقول حافظ شیرازی ہمیشہ مائل رکھتی ہے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام ● با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

---

(۱) راحت میرا یار، روشنی کے سفیر، انور جلال پوری ۲۵ رجون ۱۹۹۰ء ص ۱۹۲

راحت اندوری کے حلقہ احباب میں ایسے کئی افراد بھی شامل ہیں جو اعلیٰ ظرف کے حامل ہیں یا محسن کش ہیں لیکن راحت جان بوجھ کر بھی دونوں طرح کے لوگوں کو اپنائے رہتے ہیں۔ اچھے تو ان کے دل ودماغ کا ایک جز لاینفک بن کر ساتھ نبھاتے ہیں اور کم ظرف اپنا ظرف خود ہی چھلکا کر دور ہو جاتے ہیں لیکن یہ امر بھی تعجب خیز ہی ہے کہ یہی خامکار افراد جب دوبارہ راحت کے قرب کے خواہاں ہوتے ہیں تو راحت بغیر کسی شکوہ وشکایات کے ان کیلئے دوبارہ اپنا دل کھول دیتے ہیں یہی ایک اعلیٰ ظرف کی صفت کہی جاسکتی ہے۔ عربی کہاوت ہے "**الانسان مرکب من الخطاء والنسیان**" خطا اور بھول چوک انسان کی فطرت ہے۔ مشاعروں میں اچھے اور برے ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں ایسے ماحول میں رہ کر انہوں نے اپنے استقلال میں کبھی لغزش نہیں پیدا ہونے دی اور کبھی اگر کوئی بھول چوک ان سے ہو بھی گئی تو وہ فوراً سنبھل گئے اور اس کی اصلاح کر لی اور دام فریب سے باہر آ گئے، جہاں سے بیشتر حالات میں نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

راحت خوش گفتار وخوش اخلاق انسان ہیں، شوخی ان کی فطرت ہے مگر راحت کی شوخیاں حد سے متجاوز نہیں ہوتیں اور جب وہ اپنی فطرت کا اظہار کرتے ہیں تو ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے، ان کی حاضر جوابی ان کی گفتار کی دلیل بن جاتی ہے۔ لطیفے گڑھنا اور سنانا بھی راحت کی عادات کا ایک حصہ ہے۔ ایسے موقع پر بھی وہ پاس ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں دوسروں کی دل شکنی انہیں قطعی گوارا نہیں ہے خواہ وہ صرف زبانی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسروں کے ساتھ بھلائی کر کے بھول جانا ان کا خاصہ ہے اگر کوئی دوسرا یاد بھی دلائے تو اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔

خوش لباسی انہیں پسند ہے مگر بے جوڑ اور بے تکے لباس وہ زیب تن نہیں کرتے اسی طرح مرغن اور متلذذ غذاؤں کے بھی شائق ہیں مگر کبھی کبھی، اکثر سادہ کھانا ہی ان کی غذا ہوتی ہے۔

ہندوستان میں ہوں یا بیرون ملک اپنی زبان اور اپنی تہذیب کا ہمیشہ لحاظ رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ نامانوس تہذیبوں اور زبانوں سے اچھائیاں اخذ کرنا بھی نہیں بھولتے۔ اسی طرح دوسروں

کے مذاہب کا بھی احترام ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کی خوبیوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ مذہبی کٹّر پن یا ملائیت کے وہ قائل نہیں بلکہ خذ ما صفا اور دع ما کدر کے وہ خوگر ہیں۔ ایسے پہلوؤں کے وہ سخت مخالف ہیں، جنہیں مذاہب کی بنیاددوں پر نہیں بلکہ روایتوں کے سہارے مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہو۔

مطالعہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، ہر موضوع سے متعلق کتابوں کا گہرائی اور سنجیدگی سے مطالعہ کر کے اس کا تجزیاتی اظہار ان کی فکری وسعتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ شعر و ادب کی کتابوں کے ساتھ سماجی، سیاسی اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرنا بھی ان کا مشغلہ ہے۔ ایسی کتب جو محض روایتی بنیاددوں یا موضوعات کی حامل ہوں ان سے راحت کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ بلکہ بقول رواں اناوی:

مجھ سے کوئی کیوں کہے یہ کفر یہ اسلام ہے
میں وہ مے کش ہوں کہ ہر پیمانہ جس کا جام ہے

راحت اندوری گھر کی ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت کا ہمیشہ ان کے مدنظر رہتی ہے۔ اہلیہ کے خانگی معاملات اور ذمہ داریوں میں ان کی مطابقت کرتے ہیں۔ ان کی بیگم بھی ان کے شاعرانہ اور ادبی مزاج میں خود کو بھی ڈھالنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے بڑی خوش گوار رہتی ہے۔ والدین کی اطاعت ان کی فرمانبرداری کا خیال انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا ہے ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں ان کی مرضی اور خوشی سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ اسی طرح دوستوں اور احباب سے بھی ان کا معاملہ رہتا ہے۔ دوستوں کی خبر گیری کرنا ان کے متعلق دوسروں سے دریافت کرنا ضرورت مندوں کی حتی الوسع امداد کرنا ان کا اصول حیات ہے۔ طلباء و طالبات کے مستقبل کو شاندار بنانے اور روشن بنا سکنے کی فکر میں ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ ایک اچھے استاد کی حیثیت سے بھی وہ حلقہ درس و تدریس میں بھی مقبول رہے ہیں۔ ان کے شاگرد طلباء و طالبات دونوں ان سے مطمئن اور ان کی موجودگی کو اپنے حق میں بہت اہم اور مفید سمجھتے رہے ہیں۔ راحت کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے کہ ہمیشہ کسی ناگوار بات یا ماحول میں اپنی آواز کو بلند نہیں

ہونے دیتے۔ اگر کوئی اختلاف آراء بھی ہوا تو اسے بڑے نرم اور دھیمے لہجے میں سمجھانے یا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی کسی بدترین دشمن کے ساتھ بھی سازش نہیں کرتے اور نہ کسی سازش میں ملوث ہوتے ہیں۔ عملی طور پر وہ کبھی کسی کے نقصان کا خیال تک دل میں نہیں لاتے، بقول خود:

ہوں لاکھ ظلم مگر بددعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

غرض کہ راحت اندوری اخلاق و عادات کے اعتبار سے ایک ایسے شخص ہیں، جو اس غرض بھری دنیا میں خلوص اور اخلاق کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔

باب دوم

راحت اندوری کا عہد
اور اس کا
ادبی پس منظر

خوش وقت شعرائے کرام

(داہنے سے) انور جلال پوری، راحت اندوری، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، الطاف ضیاء، رئیس انصاری

یاران میکدۂ سخن

(داہنے سے) راحت اندوری، انور جلال پوری، منور رانا

دنیا کی تمام بڑی زبانوں کے ادبی اور شعری کارناموں میں ان کے عہد کے سیاسی، معاشی، اقتصادی، تہذیبی، معاشرتی اور تقاضوں کی عکاسی ضرور نظر آتی ہے۔ اردو کا دامن بھی اپنے عہد کے حالات و مسائل کے اذکار سے پُر نظر آتا ہے اور یہ حالات جیسے جیسے بدلتے گئے اردو شعر و ادب کی قدریں بھی تبدیل ہوتی گئیں۔ بہ الفاظ دیگر قدیم اقدار کی جگہ جدید اقدار شعر و ادب میں بھی پیدا ہونے لگے، جو اردو کی وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

راحت اندوری نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا اس عہد پر ہندوستان کی مختلف سیاسی، سماجی، ادبی اور شعری تحریکات کے اثرات تھے۔ انجمن پنجاب ۱۸۷۴ء کے ذریعے آزاد اور حالی نے سماجی حالات کے پیش نظر اردو شعر و ادب میں جو عظیم تبدیلیاں پیدا کرنے کی ان تھک فکر کی تھی وہ بتدریج ارتقائی سفر سے گزرتے ہوئے اس منزل پر آ گئی تھی، جہاں راحت اندوری نے عزم تازہ کے ساتھ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اگر ہم لکھنؤ کے عہد نوابی کے اس معاشرے پر نظر ڈالیں جس میں عیش پسندی، حد سے بڑھی ہوئی تلذذ پسندی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، جس کی وجہ سے اردو شاعری میں مبتذل خیالات مبالغہ آمیزی

پرمبنی اظہار بیان کی ایسی بدنما صورتیں پیدا ہوگئی تھیں، جن کی بنیاد صرف امراء ورؤساء کی خوشنودی اور پسندوں اور کذب آمیز تصورات پرمبنی تھی۔ ایسے ادب کے پس پردہ اس عہد کے سیاسی سماجی تہذیبی کار فرمائیاں تھیں اس لئے وہ عہد شاعری غیر متحکم غیر فطری اور غیر ضروری روایات کا رسیا ہونے کے باوجود مقبول ترین بن گیا تھا۔ تاریخ اردو میں ایسی منزلیں بھی نظر میں آتی ہیں کہ اپنے عہد کے بطن سے پیدا ہونے والے حالات مستقبل کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور انہیں تعلیمی علمی ادبی اور شعری سطحوں پر تبدیل کرنے کے امکانات کو تلاش کیا جاتا ہے، جس کا انحصار سیاسی، سماجی، اقتصادی تبدیلیوں سے متعلق صورتوں پر استوار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہ آبادی کے زمانے سے لیکر آج کے زمانے تک نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ حالی اور ان کے ہمنواؤں نے اردو شعر وادب کو جس اصلاحی اور عملی صلاحیتوں سے آشنا کیا اس نے آگے چل کر مغربی تصورات شعر وادب سے اثر پذیر ہوکر اردو شاعری صرف مقامی شاعری نہ رہ کر بلکہ بین الاقوامی شاعری بن گی، جس کی مثال اقبال کی آفاقی اور کائناتی شاعری ہے، جو ایک اعتبار سے حالی کی اصلاحی تحریک سے نشوونما پاکر آفاقیت کی منزلوں تک پہنچ گئی۔

اقبال کے تصورات شاعری میں انسانیت کی بہبود و بقا اس کے تحفظ محکومیت و حاکمیت غلامی اور حریت یا جو تصورات نظر آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے انسانی عظمت و وقار اور عمل کو وقار کائنات کے حصول کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ اس طرح پہلی بار نہایت وسیع پیانے پر انسان کو اس کی انفرادیت سے آشنا ہونے پر زور دیا ہے، جسے اکابرین نقد ونظر نے اقبال کی افادیت کو خودی کا نام دیکر اسے ان کی شاعری کا منفرد تصور قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اقبال کا یہی اندازِ فکر اردو شاعری کی تروتازگی کا ضامن بھی ٹھہرا، ان کے زمانے کے بہت سے شعراء اس نئی فکر سے متاثر ہوئے، بقول مجنوں گورکھپوری:

''خوش باش، ہماری شاعری کا بیشتر حصہ ہمارے لئے یا تو تفریح تھا یا ماتم۔ اردو شاعری نے

زندگی کی کائناتی اور اجتماعی حقیقتوں پر بہت کم دھیان دیا اس کو زندگی سے بہت کم واسطہ تھا اجتماعی یا جمہوری زندگی کا احساس تو اس میں سرے سے مفقود تھا۔ اقبال حالی اور آزاد کے بعد پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے ہماری شاعری میں آفاقی زندگی کا شعور پیدا کر کے نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا کئے۔'' (۱)

اقبال کی فکری وسعتوں نے اردو شاعری کی نئی نسل کو بے حد متاثر کیا اس نے انسانی عظمتوں سے روشناس کرانے کے ساتھ وطنی محبت کے جذبے کو بھی ابھارا، جس سے آگے چل کر آزادی وطن اور حریت کا جذبہ اردو شاعری میں فروغ پانے لگا، حالی سے اقبال تک اردو شاعری نے جن نئی جہات کا سفر کیا اس میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، برج نرائن چکبست، آنند نرائن ملا، ظفر علی خاں، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم جیسے شعراء شامل تھے۔ ان شعراء نے سیاسی، وطنی اور عملی پیچیدگیوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے کیلئے اپنی شاعری کو وسیلہ بنایا۔ اس طرح اردو شاعری کو ایک عظیم الشان عہد میں ڈھال دیا۔ ایسی شاعری کے ذریعہ غریب امیر کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی گئی، محنت کش تاجر اور دولت مندوں کے درمیان حائل اونچ نیچ کی دیوار کو منہدم کر کے ایک ہو کر زندگی گزارنے کا شعور پیدا کرنے کا اردو شاعری کو وسیلی بنایا گیا۔ چنانچہ مندرجہ مسائل کے حل کیلئے ایک عملی منصوبے کے تحت ایک ایسی سماجی تحریک کو اردو شاعری میں سمو دینے کی کوشش کی گئی، جس کی بنیاد کارل مارکس کے اقتصادی اور سماجی نظریات پر استوار کی گئی اور اس کا نام ترقی پسند تحریک تجویز کیا گیا۔ اس تحریک کے وسیلے سے اردو شاعری میں ایسے رجحان کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جس میں سماج کے پسماندہ افراد کے مسائل کو ترجیح دی گئی تھی۔ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف عوام الناس کو ڈھارس دی گئی بلکہ ان کیلئے عملی قدم اٹھانے کا بھی عزم پیدا کیا گیا اور ان ناانصافیوں کو اردو شاعری کے ذریعے روکنے کی کوشش کی گئی، جو ہندوستانی سماج میں طوفان کی مانند بڑھ رہی تھیں۔ اسی زمانے میں سماج میں در آئی ایسی غیر ضروری مروجہ روایات اور توہم پرستیوں کی بھی روک تھام کی گئی، جس کے جال میں بھولے بھالے ہندوستانی جکڑے ہوئے تھے۔ ذات پات کی بنیاد انسانوں

---

(۱) اقبال کا اجتماعی تبصرہ، مطبوعہ اقبال مذاکرے کے چند مقالات ناشر جواہر لال نہرو اور دہلی یونیورسٹی ۲۱ تا ۲۲ ر اپریل ۱۹۷۷ء ص ۶۱

کی تفریق وتقسیم کے خلاف بھی آواز بلند کی گئی، اس کا یہ ایک خوش آئند پہلو تھا کہ اردو ادب کا بیدار ذہن شاعر اور ادیب اس ضمن میں ذرہ بھر بھی سست روی سے نہیں بیٹھا بلکہ اپنے ادب کے ذریعے انہیں ابھارنے اور محبوس زندگی سے نجات دلانے کی فکر کی۔ ان تمام کارروائیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر اسی زمانے کے فنکاروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کی اور اس کا باقاعدہ لائحہ عمل ترتیب دے کر اس عہد کے شعر وادب کو بامقصد بنانے کی عملی جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں اختر حسین رائے پوری نے ایک زبردست اور خوش فکر وخوش آئند مقالہ تحریر کیا۔ سردار جعفری، انور عزیز احمد نے بھی دو تصانیف ترقی پسند تحریک کے عنوان سے لکھ کر اس فکر کو پروان چڑھانے کی سعی بلیغ کی۔ سید احتشام حسین، سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری نے بھی کھل کر ترقی پسند تحریک کو ابھارنے اور نیا روپ دینے کی ان تھک کوشش کی۔ پریم چند سے لیکر سہیل عظیم آبادی تک متعدد افسانہ نگاروں نے بھی اسی رویے کی اپنے اپنے طور پر تبلیغ کرنے میں دریغ نہیں کیا اور پھر تو آدمی آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ سردار جعفری، فیض احمد فیض، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، مجروح سلطانپوری، غلام ربانی تاباں، کرشن چند، خواجہ احمد عباس، راجیندر سنگھ بیدی سحر مہندر ناتھ وغیرہ وغیرہ نے اپنے شعری پیرائے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اس نظریہ کو فروغ دینے کی سعی مستحسن انجام دی، ساتھ ہی ایک ایسی ادبی وشعری فضا تیار کی، جس کے وسیلے سے نوجوان ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کیا گیا۔ خلیل الرحمان اعظمی، عمیق حنفی، شہریار، بلرام کومل، سریندر پرکاش، جوگیندر پال، باقر مہدی، قیصر جعفری، عزیز قیسی، ندا فاضلی، اختر راہی اور ظفر گورکھپوری وغیرہ نے بھی شروع میں بڑے حوصلے سے اس تحریک سے وابستگی کا اظہار کیا لیکن بعد میں تحریک کے کچھ آئینی رویوں سے کچھ لوگ منحرف سے ہونے لگے لیکن بہتوں نے اس نظریہ کہ کھل کر تائید کی ان کے نام ہیں: اختر سعید خاں، کیف بھوپالی، محمد علی تاج، شہریار، ظفر گورکھپوری اور قیصر حسین وغیرہ جنھوں نے اپنی ذہنی، عملی وابستگی کو ہمیشہ قائم رکھا، ترقی پسند تحریک کن ہی وجوہات کی وجہ سے ہر ایک کو یا ہر ذہن وقلب کو اپنی طرف راغب نہ کرسکی لیکن اس کی فنی

عظمت نے عوام کے دل و دماغ کو بڑی حد تک اپنی جانب متوجہ بھی کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایسے ذہن بھی پیدا ہونے لگے تھے، جنھوں نے ترقی پسند تحریک کو محض کھوکھلی نعرہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں دی، سماجی اصلاح، ملت پرستی، سماجی بغاوت، انقلابیت، اشتراکیت، جمہوریت جیسی فکروں سے گریز کر کے اس نے عرفان ذات کو اہمیت دینی شروع کی اور اس کے وسیلے سے اپنی ذات کے آئینہ میں کائنات کے جلوے دیکھنے کی کوشش کی۔ مشہور مثل ہے کہ آدمی پہلے گھر میں چراغ جلاتا ہے بعد میں مسجد میں اسی قول کے مطابق ذہن خارجیت سے داخلیت کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے اردگرد کے تمام روایات سے قطع تعلق کر کے داخلیت کی جانب اپنا رخ پھیر لیا جس کی طرف خلیل الرحمٰن اعظمی نے یوں اشارہ کیا ہے:

''اس کے منفرد نظریوں خانوں فارمولوں اور نعروں میں رہنا پسند نہیں کیا، اور نعرہ بازی سے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ وہ کسی وقتی یا ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کیلئے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر پاتا وہ زندگی کی تمام وحدتوں کو اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ دیکھنا پرکھنا اور برتنا چاہتا ہے۔'' (۱)

گویا اس نئی نسل نے وحید صبا کے اس قول کی تائید کی کہ:

''جدید شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ جدید شاعری ایک رجحان ہے جو تمثالوں اشاروں اور بیانات کے ذریعے ذاتی تجربات کی روشنی میں ایک ہمہ گیر معاشرے کے ساتھ فرد کے رشتے کی عکاسی کرتا ہے۔'' (۲)

اسی قسم کے خیالات شمس الرحمان فاروقی نے بھی ظاہر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''داخلی اور معنویت کے لحاظ سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف تنہا کیفیت انتشار اور ذہنی بے چینی کا (کسی نہ کسی نہج سے) اظہار کرتی ہو جو صنعتی اور مشینی میکانکی

---

(۱) ماہنامہ شبخون الہ آباد جون ۱۹۶۸ء ص ۸

(۲) جدید شاعری اس کے خدوخال اور وسائل۔ مطبوعہ ماہنامہ شب خون الہ آباد فروری ۱۹۶۸ء ص ۲

تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔'' (۱)

نئی شاعری کے اس رخ نے ایک الگ خیال اور لہجہ کو جنم دیا، جس نے سماجی ہنگامہ آرائیوں میں گم شدہ انسانی چہرے کی تلاش کرنی چاہی اس کا یہ عمل بڑا ہی اضطرابیت سے پر تھا۔ اس دور کا ذہن کشمکش بیزاری اور تشکیک کا شکار ہو گیا تھا اور اس طرح اسے سماج کے کھردرے مسائل سے منہ پھیر لینا پڑا اور اس کا انداز فکر غیر واضح اور محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اسی سبب سے اس عہد کی شاعری کا معتد بہ حصہ عورت کے تصور اور ذات انسانی کے تمام تر ہنگاموں سے خود کو نہ بچا سکا اور بڑی حد تک وہ شاعری کا حصہ ابتذال کی نذر ہو گیا۔ یہاں تک کھلے طور پر عریاں نگاری اشعار میں جگہ پا گئی مثال کے طور پر اس دور کے یہ اشعار دیکھئے جس کو آج صرف پھکڑ پن کا نام دیا جا سکتا ہے۔

دھرا کیا ہے بھلا الفت کے ان جھوٹے فسانوں میں
بھرم کھوٹے کھرے کا خود ہی کھل جائے گا راتوں میں

سخت بیگم کو شکایت ہے جہان نو سے
ریل چلتی نہیں گر جاتا ہے سگنل پہلے

شاعری کا یہ حصہ جدید شاعری کا مستحکم حصہ نہیں بن سکا اسے ہم صرف وقتی لذتیت کے تحت ابھرنے والے رجحان کا نام دے سکتے ہیں۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عزیز اندوری لکھتے ہیں:

''ایسے پرانے رشتوں سے جن حالات میں دور کر کے اپنی ذات تک پہنچانے تک سے محروم کر دیا گیا تھا ان حالات سے وہ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نیز اس نے اپنے حالات سے متعلق کسی بھی تحریک یا نظریے کو محض نعرہ بازی سے زیادہ اہم نہیں سمجھا۔ ان حالتوں میں وہ بعض صورتوں میں ذہنی انتشار اور تذبذب کا شکار بھی ہوا اور اس مستقبل سے بھی مایوسی اور محرومی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اسے یہ خیال ستانے لگا کہ اس طرح ہزاروں تعلیم یافتہ ماہرین صنعتی سندیں حاصل کئے ہوئے افراد بے

---

(۱) جدید شاعری ایک سمپوزیم ماہنامہ کتاب لکھنؤ سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۸

روزگاری کا شکار ہیں اس کا سبب اس کے نزدیک سماجی اجتماعیت ٹھہری۔ اس لئے اس نے اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کو انہی پہلوؤں کی طرف موڑ دیا جو اسے اجتماعی ہنگاموں کے بجائے ذاتی سکون سے قریب تر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہنگامی خلوص اور اخلاقی قدروں سے بھی انحراف کر دیا اور اس کی تخلیقات میں اس نوع کے خلوص اور اخلاق کے نشانات برائے نام پائے گئے۔''(۱)

نئی شاعری کے ذریعے ہمارے بعض شعرا نے خواہ قدیم روایات شاعری سے کھل کر انحراف کیا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ان شاعروں نے قدیم روایات شاعری کے بعض حصوں سے اثرات بھی قبول کئے خاص کر ہماری غزل ان اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکی۔

اسی کے ساتھ دبستان لکھنؤ میں لکھنوی تعیش پسندی نے مسلط ہو کر جس تصنع آمیزی کو داخل کیا تھا اس نے میر کی حقیقت پسندی اور غالب کی فکری گہرائیوں کو بڑی حد تک مجروح کر دیا تھا ایک خیالی معشوق کی تخلیق نے اردو شاعری کو بناوٹی اور مبتذل بنا دیا تھا۔ اس صورت حال نے حالی کو بے حد فکرمند کر دیا تھا اور اسی لئے انہوں نے اردو شاعری کیلئے ایک اہم منصوبہ تیار کیا، جو ۱۸۸۴ء میں انجمن پنجاب کے نام سے ظاہر ہوا۔ اسے ہم حالی کی اصلاحی تحریک کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں سچے واقعات اور فطری پہلوؤں کو شامل کرنے پر زور دیا گیا ہے، جس سے رفتہ رفتہ آگے بڑھ کر اردو غزل کو نئے میلانات اور خدوخال عطا کئے اور جو بڑھتے بڑھتے اقبال اور چکبست کے ذریعے پختگی پا گئے اسی لئے ان کی شاعری میں بڑی رومانی لذت مبتذل اور سطحی جذبات کے بجائے حسن وعشق کے مطہر جذبات اور فطری جمالیات حسن کو مقبول بنانے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر اردو غزل کو ارضیت کی سچائیوں تک پہنچانے کیلئے حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، شاد عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری نے ذہنی ہوشمندی کے ثبوت دینے شروع کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں حسن وعشق کے سوز وگداز کی زندہ جھلکیاں

---

(۱) اردو شاعری (ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک) مطبوعہ تنقیدی تحریریں ص ۱۳۵ ڈاکٹر عزیزی اندوری

نظر آتی ہیں۔ ان شعرا کی کوششوں کا یہ کرشمہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی اور آزاد نے اصلاح شعر وسخن کی جو جوت جگائی تھی حالی کا منصوبہ اپنی نوعیت کی شکل میں نمودار ہونے لگا تھا۔ ذکر جاناں اور تذکرہ عشق کے جو میلانات ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں ان کی ارتقائی شکلیں بعد کے شعرا کے یہاں سامنے آنے لگی ہیں، جنہوں نے سماجی کرب کے اظہار کے ساتھ ذکر جاناں کی طہارت اور تازگی کو بھی ملحوظ رکھا ہے ان شعرا میں فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، مجروح سلطانپوری، غلام ربانی تاباں اور ساحر کاظمی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن ابر بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

(مجروح سلطانپوری)

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

(فیض احمد فیض)

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہیں

(مجاز)

یہی نہیں بلکہ غزل کو ذکر جاناں کے ساتھ ہی دیگر موضوعات سے مزین کیا جانے لگا بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''ان میلانات کے دائرے میں رہ کر غزل نے اپنے آپ کو وسعت دی اور اپنے آپ کو وسعت دینے کا یہ عمل اس پر برابر جاری رہا ہے۔ اس لئے آج اس میں یہ تمام رجحانات نظر آتے ہیں جو موجودہ زندگی میں موجود ہیں۔ زندگی کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک بات کو اس نے اس طرح اپنے

دامن میں سمویا ہے کہ وہ زندگی کا صحیح آئینہ معلوم ہوتی ہے اس لئے تو وہ اس موج زندگی سے ہم کنار ہے۔''

بقول اصغر.................... ''بتوں میں حسن ہے اور شراب میں مستی''

اصغر غزل میں چاہئے وہ موج زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں (۱)

غرض کہ غزل نے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ مختلف منازل کو طے کرتا ہوا اس نسل جدید تک آ پہنچا جس نے سیاسی تشدد سامراجی استبداد اور ذہنی پابندیوں کے ساتھ ساتھ ایک آفاقی شعور تک خود کو پہنچا دیا، جس کی وجہ سے اردو غزل ایسے خارجی موضوعات سے قریب ہوگئی، جو زندگی کے مسائل کے ساتھ براہ راست وابستہ ہیں اور جس نے تحریکات سے وابستہ کر کے ان تمام پہلوؤں کو خود میں سمولیا جو زندگی کے تلخ اور شیریں معاملات اپنی فطری و معنوی علامت تسلیم کرتے تھے اور اس طرح ان ارضی تحریکات کی وجہ سے غزل جاذب نظر اور دلکش نظر آنے لگی اور غزل میں صرف تصوراتی عورت ہی نہیں بلکہ مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے والی عورت کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی سے کیا جانے لگا مثال کے طور پر:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئے

(فراق)

ہر ادا آب رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

(ناصر کاظمی)

ہر سو ترے وجود کی خوشبو تھی خیمہ زن
وہ دن کہ اپنا گھر بھی ترا گھر لگا ہمیں

(ظفر اقبال)

---

(۱) جدید شاعری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص ۲۵۲

رفتہ رفتہ شعرا نے غزل کو اپنے گرد و نواح کے مسائل سے بھی قریب کر دیا اور شنیدہ کے بجائے مشاہدات و تجربات کو اولیت دی جانے لگی اور ایسی جدید علامتوں کا غزلوں میں استعمال ہونے لگا، جن کی وجہ سے اردو غزل ایک نیا روپ دھار کر نمودار ہوئی۔ ان شعرا کی غزلوں میں پہاڑ، دریا، دھوپ، جنگل، سانپ، دھول، کبوتر، کھڑکی، برف، راکھ، سورج، آندھی جیسی علامتوں کا استعمال شروع ہوا، مثال کے طور پر دیکھئے:

جنگل کے سناٹے سے کچھ نسبت تو ہے
شہر کے ہنگامے میں پھرتا کون اکیلا

(باقی صدیقی)

دل کی باتوں میں آکے پچھتائے
سانپ پر پاؤں آگیا ہے

(شہزاد احمد)

فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

(ناصر کاظمی)

دھوپ کی لہر ہے تو سایہ دیوار میں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے ساتھ ہمیں

(شکیب جلالی)

خوشبو کی دیوار کے پیچھے کیسے کیسے رنگ جمے ہیں
جب تک دن کا سورج آئے اس کا کھوج لگاتے رہنا

(منیر نیازی)

یہ علامتیں ایسی ہیں، جن کا استعمال اردو غزل میں پہلی بار روا رکھا گیا۔ کچھ تلخ قسم کی علامات بھی ہیں لیکن ان کے استعمال سے بھی غزل میں دلکشی پیدا ہوئی، یہ ان شعرا کے ہنر کی کارفرمائی ہے، جنہوں نے ان علامات کو برتا ہے اور انہیں اردو غزل کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ اس نسل کے بعض شاعروں نے نئی حسیت کے ساتھ ان علامتوں کو باشعور اور حساس انسان کی طرح اپنی فکری گہرائیوں میں انہیں ڈھال کر ایک اعتبار سے اپنی لفظ شناسی کے ثبوت فراہم کئے ہیں، یہ مثالیں دیکھئے:

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے اسکوٹر کے دیوانے

(بشیر بدر)

ہم سے تپتے ریگ زاروں کی طرف آتی نہیں
اونچی اونچی بلڈنگوں پر سوگئی ہے چاندنی

(ڈاکٹر عزیز اندوری)

موجودہ نسل کے شعرا نے اپنے عہد کی سماجی یا معاشرتی تلخیوں کو اپنے قدما کی طرح کھلے دل و دماغ سے محسوس کیا ہے مگر اس کے اظہار کیلئے اپنے لئے ایسے لب ولہجہ کا انتخاب کیا ہے، جس پر قدما کے لب ولہجہ کی چھاپ نظر نہیں آتی ہے۔ اس وجہ سے اس موجودہ لب ولہجہ کو ہم جدید ترین لب ولہجہ ٹھہرانے میں قباحت کا شکار نہیں ہوئے، جس کے ذریعے ہم اپنے سماج کی ناانصافیوں نابرابری کے سلوک کے ساتھ انسانیت کشی کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہوئے ہیں ان شعرا نے ایسی علامت سازی کی طرف بھی توجہ دی ہے جن کو سمجھنے کیلئے ہم دشواری نہیں محسوس کرتے اور ان کے پس پردہ موجودہ حادثات واقعات تک ہمارا ذہن بڑی آسانی کے ساتھ پہنچ جاتا ہے اور یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ اس عہد کے سلگتے ہوئے حالات وواقعات نے اس عہد کے شاعر کو کس قدر متاثر کیا چند مثالیں دیکھئے:

گزروگے تو ہر موڑ پر مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈھوگے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد)

مذہبی مزدور سب بیٹھے ہیں ان کو کام دو
اک عمارت شہر میں کافی ویران اور ہے

(منور رانا)

ہماری نفرتوں کی آگ میں سب کچھ نہ جل جائے
کہ اس بستی میں ہم دونوں کو آئندہ بھی رہنا ہے

(معراج فیض آبادی)

قتل ہوئے تو مجھے شہر میں دیکھا سب نے
کوئی آیا نہ عدالت میں گواہی کیلئے

(رئیس انصاری)

تجھے غرور کہ تلوار تیرے ہاتھ میں ہے
مجھے یقین کہ مجھ کو خدا بچائے گا

(والی آسی)

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں اک مکاں بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

(بشیر بدر)

یہ ہے وہ ادبی اور سماجی پس منظر جس میں راحت اندوری کے ذہن وشاعری نے بالیدگی کی
منزلیں طے کیں اور ان سے متاثر ہوئے چنانچہ عہد حاضر کی ناگواریوں اور ناہمواریوں اور مسائل حیات

کیلئے اپنے فکر رسا کو ہمیشہ آمادہ رکھ کر اس کا ہر موقع پر بے دھڑک کھل کر اظہار کیا ہے لیکن ان کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ آواز میں احتجاج کی دھمک تو ہے لہجہ میں کڑک اور گھن گرج نہیں۔

عدالتیں نہ سہی جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں میرا حل ضرور نکلے گا

مشورہ ہے کہ اٹھو نہر پہ قبضہ کرلو
بھیک مانگو گے تو قطرہ بھی نہیں مل سکتا

اٹھو اے چاند تارو اے شب کے سپاہیو
آواز دے رہا ہے لہو آفتاب کا

زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پر نکلنا ہوگا
گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا

(راحت اندوری)

باب سوم

راحت اندوری کی شاعری

(الف) راحت اندوری بحیثیت شاعر

(ب) راحت اندوری بحیثیت غزل گو

احباب بے تکلف

(داہنے سے) گلوکار طلعت عزیز، کرکٹ سمراٹ سنیل گواسکر، مشہور شاعر منظر بھوپالی،
راحت اندوری، شہرۂ آفاق پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

ایک یادگار تصویر

(داہنے سے) قتیل شفائی، راحت اندوری، منظر بھوپالی، احمد فراز

راحتؔ اندوری بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں، یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انکی شہرت مشاعروں کی وجہ سے وجود میں آئی اور مشاعروں کے وسیلے سے ان کی غزلیں اہل ذوق تک پہنچ گئیں جہاں ان کو خاطر خواہ طریقے سے سراہا گیا۔ اردو شاعری کے سرمائے میں غزل ہی ایسی صنف ہے، جس کے کہنے والے کونے کونے میں ہیں اور اس طرح کے اشعار بھی لاتعداد ہیں، جن میں ہر طرح کے موضوعات پر خاطر خواہ روشنی دالی گئی ہے اس صنف نے مشاعروں کی بدولت یہ مقبولیت حاصل کی ہے اور آج بھی شعرا اس میں اپنے تجربات کے نت نئے گل بوٹے کھلا رہے ہیں۔ عہد حاضر کی غزل میں وسعت نظر، شعرا کے مشاہدات و تجربات، خیال کی رنگا رنگی، زبان کی سلاست اور شگفتگی معنوی گہرائی، اور احساسات کی صحت مندی لائق غور ہے۔ غرض کہ غزل عہد میر سے لے کر آج تک نئے تجربات، نئے اسالیب نئے موضوعات اور لفظیات اور اپنے اپنے متعلقہ عہد کی ترجمانیوں سے آراستہ ہوئی ہے۔

راحتؔ اندوری نے بھی غزل کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اردو غزل کے ایسے شعرا کی تعداد کم ہے، جن کے یہاں زبان و بیان کی سادگی اور برجستگی اور غزل کی نزاکت اور اس کے رکھ رکھاؤ کا لحاظ بھی ہو، جو شعر میں دلکشی اور اثر آفرینی نظر آتی ہو یہ سبھی خوبیاں

راحت کے یہاں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ کھلے اور بے باک لہجہ کے ساتھ موجود ہیں۔ برخلاف یہی نہیں بلکہ راحت اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے کلام میں خیالات کی نیرنگی افادیت معنیٰ آفرینی، زبان کی سلاست اور شگفتگی انداز بیان کا جوش بلکہ جوش جیسا لہجہ اور گھن گرج اور بے باک اظہار ذات وکائنات نہایت دھیمے پن کے ساتھ لفظی تکرار، جذبات کی گرمی اور جوش شباب سب کچھ ہے ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے عام بلکہ عوام فہم بنانے کی دھن میں اسے اس قدر آسان بنا دیا ہے کہ کم علم تک لوگوں کیلئے انہوں نے یہ گنجائش نہیں رکھی ہے کہ وہ لغت کا سہارا ڈھونڈھتا پھرے۔ یا اس کے مطلب سمجھنے کیلئے اسے دقت ہو۔ ان کی شعرخوانی کا انداز میر انیس جیسا دل پذیر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے جوش میں سچائیوں کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بولتے ہوئے اشعار اور جاگتا ہوا احساس ابل پڑتا ہے ان کی غزل کی نزاکت فراوانی غم و احساس سے نڈھال نہیں نظر آتی ہے۔ وہ نامانوس الفاظ نہیں استعمال کرتے بلکہ روزمرہ کی زبان میں شاعری کرتے ہیں جس میں سنجیدگی بھی ہوتی ہے تہذیب اور شائستگی بھی۔ روزمرہ کی تلاش میں بازاری پن کلام میں نہیں آنے دیتے۔ زبان و بیان کے فطری انداز نے ان کی شاعری کو صرف توازن ہی نہیں بخشا بلکہ ایک مانوس لب ولہجہ بھی دیا ہے۔ وہ پیچیدہ ترین جذبات نازک سے نازک اور شدید سے شدید احساس کو ایک مشاق فن کی طرح آسانی سے ادا کر دینے پر قادر ہیں۔

اشارہ وکنایہ: رمز وایما کی لطافتیں، ایمائیت، غزل کے اجزائے لاینفک ہیں۔ انہی اجزا کی بدولت غزل میں دلکشی شگفتگی اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے راحت کے کلام میں یہ عناصر وافر مقدار میں نظر آتے ہیں، جیسے:

دنوں کے بعد اچانک تمہاری یاد آئی
خدا کا شکر ہے کہ اس وقت باوضو ہم تھے

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھو
ایک اک حرف کو صدا بھی مان

حیات انسانی کا سلسلہ زندگی کے لگاؤ سے دنیاوی عشق تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر خلش عشق کی طرح سینے میں موجود ہوتی ہے لیکن خواہشات ہمیشہ پوری نہیں ہوتیں یہ سلسلہ برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ زندگی گل و خار سے عبارت ہے پھر بھی زندگی کی ناؤ برابر بڑھتی رہتی ہے کبھی آرزوؤں کی دلفریبیاں طلب کے جذبہ میں ہلچل پیدا کرتی ہیں اور بسا اوقات قلب انسانی کو پارہ پارہ بھی کر دیتی ہیں پھر بھی آدمی ہے کہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔

روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف
میری آنکھوں میں منور کون ہے
مجھ سے ملنے ہی نہیں دیتا مجھے
کیا پتہ یہ میرے اندر کون ہے

راحت اندوری کی غزل پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خلیل احمد لکھتے ہیں:

''تغزل میں ڈوبا ہوا شعر شدت احساس میں رچی ہوئی شاعری، خلوص و صداقت میں سموئے ہوئے جذبات، درد و غم میں ڈھلے ہوئے آنسو، نغموں میں سجا ہوا سنگیت گھن گرج میں ڈوبا ہوا شعر جو بھی ہو راحت کا اپنا رنگ ہے اس رنگ میں دکھ درد کی پرچھائیاں بھی ہیں اور عزم و حوصلہ کی روشنیاں بھی۔ راحت کی شاعری میں ہر قسم کے اشعار موجود ہیں۔''

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی کے مطابق:

''راحت کی شاعری حیات کو وہ نغمہ ہے، جس میں انسانی کرب چھپا ہے۔ یہ کرب انسانی تہذیب کے گوشے کو قوت گویائی عطا کرتا ہے۔ انسانیت کو جھنجھوڑتا اور رہ رہ کر انسان کو بیدار کرتا ہے۔ راحت کی سوچ انداز نرمی اور اسلوب کا دھیما پن قابل دید ہے۔''

راحت کی شاعری میں حسن و عشق کا روایتی انداز دیکھنے کو نہیں ملتا انہیں انسانیت سے لگاؤ ہے۔ وہ زندگی کی تلخی اور اس کے ردعمل کو بڑی ذہانت اور بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر واقعہ کو انتہائی قریب سے دیکھتے ہیں اور ایک حساس شاعر کی طرح ان کا ردعمل بھی شدید ہوتا ہے جو دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا سچ تو یہ ہے کہ شاعری میں انسانی احساسات و جذبات پر کمند لگانا آسان نہیں۔ ذرا گہرائی میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیقی استعارہ یا کارکردگی عمر کے ساتھ ساتھ معیار کی بلندیوں کو چھوتی ہے کیونکہ کسوٹی پر کھرا اتر کر ہی ایک اچھا شاعر بنتا ہے ہزاروں اہل قلم اپنی روشنیاں صرف کرتے ہیں تاہم دو چار ہی تخلیق کا رعمر جاوداں حاصل کرنے میں کامران ہوتے ہیں۔ ارفع تخلیق توانائی اور بھرپور صلاحیتوں کا حامل شاعر ہر زمانے اور ہر دور میں زندہ رہتا ہے ذہنی صلاحیت اور تخلیقی توانائی اگر شاعری سے ہم آہنگ ہے تو شاعر کو تخلیقی جست لگانے میں دیر نہیں لگتی۔ شخصیت کے داخلی خلا میں جنم لینے والے جذبات جب زمانے یا وقت کی زد میں آتے ہیں تب کہیں احساسات کے معدن سے انمول خزانے نکلتے ہیں۔ کاش راحت کی شاعری اس یافت سے محروم نہ ہو اور یہ سلسلہ سدا جاری رہے۔'' (۱)

راحت کی شاعری کے بغائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشعار میں آبشاروں کی مترنم جھنکار ہے، پہاڑی دریاؤں کی شورش اور شور بے ہنگام نہیں۔ ان میں جھیل کے کنارے کا پرسکوت تحیرافزا سکوت اور سحر آگیں بانسری جیسی مدھر آواز محسوس ہوتی ہے اور ایسے سماں کا اندازہ ہوتا ہے، جہاں قاری تنہائی میں محسوس کرے کہ اس کے قریب کوئی نہ کوئی شے سرسرا رہی ہو بے خبری میں کسی ذی نفس کی سسکیوں کا احساس بیدار ہو جائے۔ چند اشعار پیش ہیں۔ یقین ہے کہ قاری کو راحت کے اشعار میں وہ سب کچھ مل جائے گا، جن کا راقم نے ذکر کیا ہے اور یہ کہ ان میں ان کی پسند کے مطابق بھی یقینی اشعار مل جائیں گے۔

---

(۱) زندگی کی تخلیق کا شاعر، ص ۱۴۳ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

خوار پھرتے ہیں آئینہ ہوکر
جانے منھ دیکھنا ہے کس کس کا
ننھی منی سب چہکاریں کہاں گئیں
موروں کے پیروں کے پائل بھیجو نا
ہمارے طاق بھی بیزار ہیں اجالوں سے
دیئے کی لو بھی ہوا پر سوار رہتی ہے
کس نے دستک دی یہ دل پر کون ہے
آپ تو اندر ہیں یہ باہر کون ہے
میں سوچتا ہوں ایسے میں وہ نہ آجائے کہیں
جنوں بخیر یہ موسم تو انتظار کا ہے
اے میرے دوست تیرے بارے میں
کچھ الگ رائے تھی مگر تو بھی
اپنے دیوار و در سے پوچھتے ہیں
کیا یہ گھر تھا گھر سے پوچھتے ہیں
پیاس صدیوں کی لئے آنکھوں میں
دیکھتے رہتے ہیں بادل ہم تم
ایک دوزخ جو سب کو جلا ڈالے
ایک جگنو جو روشنی کردے
آج کل چھٹی کے دن بھی گھر پڑے رہتے ہیں ہم
شام ساحل تم سمندر سب پرائے ہوگئے

دوپہر تک تو ساتھ چلا سورج
تونے رستے میں شام کردی ہے
موسم کی من مانی ہے
آنکھوں آنکھوں پانی ہے
آتی جاتی چڑیاں روشندانوں میں
گھر آنگن کی خواہش ہوتی رہتی ہے
دروازوں نے اپنی آنکھیں نم کرلیں
دیواروں نے اپنا سینہ تان لیا

راحتؔ اندوری غزل کے شاعر ہیں اور وہ ہمیشہ چبھتے ہوئے نہایت تیکھے اور طنز سے بھرپور شعر کہتے ہیں ان کے اشعار براہ راست اپنے سامع کو اپیل کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ وہ فوری طور سے پریشان کن مسائل اور حالات پر اپنے زاویۂ خاص سے شعری تبصرہ کرتے ہیں لیکن وہ اپنے یک رخی زاویہ کی تہوں میں بھی ادبیت کی قندیلیں جلائے رکھے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی راحت کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''راحتؔ کی شاعری انسانی درندگی کی شاعری ہے، ہوسنا کیوں کی شاعری ہے، اقدار کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی شاعری ہے کہیں ان کی نظریں حالات کی ستم ظریفی پر پڑتی ہیں کہیں رومانیت کی مصنوعی دینا کی سیر کراتی ہیں اور کہیں مسائل و مصائب سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری عوام کے دل کی آواز ہے وہ قاری کا دل دھڑکانے اور اسے اپنی جانب متوجہ کرانے کا فن خوب جانتے ہیں ان کی زبان اور قلم سے نکلنے والے اشعار سیدھے دل میں اتر کر روح کو جھنجھوڑتے ہیں اور در غور وفکر کو وا کردیتے ہیں۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ جو بات ہمارے ذہنوں سے نکل کر زبان پر آنے سے تکلف کرتی ہے وہ ان کے لبوں پر اٹھکھیلیاں کرتی رہتی ہے اور ہم اسے سن کر بے چین ہوجاتے ہیں کہ گویا یہ

بھی میرے دل میں تھا:

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پہ بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہوگئے

اگر چہ یہ شعر سامنے کا ہے ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ راحت نے صوفہ بھیڑیا جنگل اور شہر صرف چار لفظوں کی جادوگری سے طبقاتی کشمکش انسانی استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی کے ساتھ نشاندہی کردی ہے۔ اگر یہ شعر کیفی اعظمی یا سردار جعفری کے قلم سے نکل کر ہم تک پہنچتا تو ترقی پسندی کا ڈھول پیٹتے پیٹتے خود کو بہرا کر لیتے اور ستر برس پرانی ترقی پسند تحریک کا حیات نو قرار دیتے اسی طرح:

روایتوں کا تحفظ بھی ان کے ذمہ ہے
جو مسجدوں میں سفاری پہن کے آتے ہیں

اس شعر کے حوالے سے ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کا یہ دعویٰ کہ ''اگر کلام پاک کی تلاوت کیلئے ٹوپی، وضو اور رحل کی شرط ختم کردی جائے تو تلاوت کرنے والوں کی تعداد میں بیک وقت اضافہ ہوجائے گا'' بلاشبہ درست ہے۔ اس بات سے کسی منصف مزاج کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ ایسی ہی بے ضرورت حد بندیوں نے نقصان پہنچایا ہے۔

ہے دھواں چاروں طرف بینائی لیکر کیا کروں
صرف آنکھیں ہی نہیں منظر بھی ہونا چاہئے

رومانی شاعری کیلئے مناظر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ دلدادگی کی متلاشی ہوتی ہے راحت کا کلام اسی دلدادگی سے عبارت ہے۔ وہ محض مناظر پر نظر نہیں ڈال کر رہ جاتے بلکہ ان کی گہرائیوں میں وہ جستجوئے حق بھی کرتے ہیں درج ذیل شعر میں وہ ہماری تاریخ ہے جس کی سچائیاں کلکتہ کی گلیاں بولادت اسٹریٹ ہو یا ہرن باری لین میں ان بچوں کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہیں جو مٹی کے تیل کا پیپار کھے تیل بیچتے ہیں جن کی بنیادیں سلطان میسور سلطان ٹیپو کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ راحت کی رومانی شاعری کا محور

صرف حسن وعشق کی موہوم یا زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں بلکہ اس کی تہہ داریوں میں وہ تلخ سچائیاں بھی پوشیدہ ہیں جن سے ہم صرف نظر کرتے ہیں۔ راحت اپنے گرد وپیش کے حقائق پر گہری نظر رکھتے ہیں تب ہی ایسے اشعار جنم لیتے ہیں۔

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری ہوگئے
باپ حاکم تھا مگر بچے بھکاری ہوگئے

اور اسی قبیل کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے لائق ہے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

ہر ایک کو مطمئن کرنے اور خوش رکھنے کیلئے بہت کچھ دنیا داری ضروری ہے اور اکثر دنیا داری کو قائم رکھنے کیلئے دوستی کے ساتھ خود کی قربانی بھی دینا پڑسکتی ہے کہا نہیں جاسکتا کہ اس سلسلے میں راحت کا کیا نظریہ ہے مگر ان کا شعری رویہ کچھ اسی طرف اشارہ کرتا ہے، مثلاً:

میری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
میرے بھائی میرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

ڈاکٹر اسعد بدایونی اپنے مضمون ''راحت اندوری کی شعری کائنات'' میں راحت کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری عام طور پر ان باتوں کا اظہار ہے جن کو زمانہ اور اہل زمانہ قبول کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، ہر شاعر کے ذہن میں ایک تخیلی دنیا ہوتی ہے، جو اس کے آس پاس کی دنیا سے مختلف اور زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے کیونکہ وہ ساری دنیا کو خوبصورت اور سرسبز دیکھنا چاہتا ہے۔ بدصورتی ناہمواری اور عدم مساوات جو جسمانی سطح پر موجود دنیا میں معمولی چیزیں ہیں شاعر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے خوابوں اور خیالوں میں ایک الگ دنیا تعمیر کر لیتا ہے کیونکہ وہ اپنے خوابوں میں دوسروں کو بھی شریک

کرنا چاہتا ہے اور یہ عمل شعر پیکر میں تشبیہوں استعارات اور علامات کی مدد سے ہوتا ہے اور الفاظ کا جامہ پہننے کے بعد ایک زندہ اور متحرک شعر میں تبدیل ہو جاتا ہے، کسی شعر کی تہہ داری یا معنویت کوئی خلائی چیز نہیں ہوتی بلکہ شاعر کے ذہن اور تخیل کے آس پاس کے ماحول میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حالات کے شیر و شکر ہونے کے پختہ نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہ ہوگا کہ شاعری کو فوری ردعمل یا نعرے بازی کے منصب پر اتر آنا چاہئے بلکہ حالات و واقعات کو معروضی انداز سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد ہی شعری تخیل کی آمیزش سے شعر گری کرنا ہمیشہ سے زیادہ بہتر اور مستحسن عمل رہا ہے۔ راحت اندوری نے اپنے آس پاس ہونے والے واقعات کو شعری پیکروں میں کچھ اس طرح منتقل کیا ہے کہ وہ لمحہ موجود سے ماورا بھی نظر آتے ہیں۔

بند کمرے کی امس اپنا مقدر بن گئی
چھت پہ جب پہنچا تو بادل سر اٹھانے لگ گئے

بلندیوں کا نشہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا
مرا جہاز زمیں پر اترنے والا تھا

اب میرے حال پہ شرمندہ ہوئے ہیں وہ بزرگ
جو مجھے پھولنے پھلنے کی دعا دیتے تھے

کیسے محفوظ رکھوں خود کو عجائب گھر میں
جو بھی آتا ہے یہاں ہاتھ لگاتا ہے مجھے(۱)

واقعہ کربلا یا حضرت امام حسین کی شہادت تاریک انسانی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے اور اس حوالے سے عربی فارسی ادبیات کے مقابلے میں اردو شاعری اور اردو شعرا نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری تو ماضی کی بات ہے آج بھی اس عظیم سانحہ کی بازگشت جدید شعرا کے کلام میں

---

(۱) لمحے لمحے بدایوں مضمون نگار ڈاکٹر اسعد بدایونی ص۱۵۲

پورے امکانات اور آب وتاب کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں غزل گوشعرا عرفان صدیقی اور افتخار عارف کے کلام کو پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے کربلا کے واقعات کو بطور استعارہ وعلامت بنا کر جدید حسیت کا اظہار کیا ہے۔ راحت کے یہاں بھی کچھ اشعار بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی واقعہ اور اس کے متعلقات کو پیش کرتے ہیں جیسے یہ اشعار دیکھئے:

یہیں حسین بھی گزرے یہیں یزید بھی تھا
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی زمیں ہوں میں
تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر
فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

مندرجہ دونوں اشعار انسانی رویہ کے غماز ہیں اسے اصطلاح میں حق وباطل کی جنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حق وباطل کے معرکے میں جن کا مرجانا بظاہر ہار جانے یا ختم ہو جانے کو موت نہیں سمجھتا کیونکہ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے مرنا دراصل زندگی ہے، جس کی عملی شکل شہادت حسین ہے حالانکہ یہ موضوع نیا نہیں ہے لیکن راحت کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ ان اشعار میں ایک طرح کی تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے اردو کے جدید شعرا نے داستانی کرداروں اور واقعات کو اپنی غزلوں میں پیش کرنے اور ان کو عصری حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ راحت اندوری کے شعری مجموعے ''پانچواں درویش'' میں اسی رویہ کی جھلک موجود ہے۔ افسانوی ادب میں انتظار حسین نے قدیم داستانوں اور قصوں سے جس طرح کا فائدہ اٹھایا ہے اکثر غزل گوشعرا کے یہاں یہ معیار مفقود ہے مگر ایک خاص طرح کی فضا سازی اور رنگ آمیزی کی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ راحت کے یہ اشعار اسی کوشش کی منہ بولتی تصویریں ہیں:

محل میں خاص مصاحب بھی جا نہیں سکتے
وہاں حرم کی کنیزیں ہیں شاہ زادہ ہے

شاعری آوارگی خوشبو وفالذت شراب
مختلف شکلوں میں شہزادے کو عورت چاہئے
شاہزادے سے ملاقات تو ممکن ہی نہیں
چلئے مل آتے ہیں چل کر کسی درباری سے
رنگ محلوں کے دریچے کھولئے عالم پناہ
ورنہ شہزادی کو جادوگر اٹھالے جائیں گے
کسی کنیز کی قسمت چمک بھی سکتی ہے
سویرے صاحب عالم کی واپسی ہوگی
کسی آہو کیلئے دور تلک مت جانا
شاہزادے کسی جنگل میں بھٹک مت جانا
رکھ دئے جائیں گے نیزے لفظ اور ہونٹوں کے بیچ
ظل سبحانی کے احکامات جاری ہوگئے
داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی

راحت تصنع، بناوٹی باتوں مصلحت پسند یا خوشامدانہ انداز، موقع پرستی کے قائل نہیں ہیں اس لئے جو بات کہتے ہیں وہ سچائی سے لبریز اور بانگ دہل ہوتی ہے ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ پورے طمطراق اور دبدبے سے بھرپور اور اس یقین سے مالا مال ہوتا ہے کہ اس خیال یا موضوع پر ان کو دسترس اور پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور اسلوب دلپذیر ہوتا ہے۔ عربی فارسی الفاظ کم ہی نظر آتے ہیں اس طرح وہ قدیم لب ولہجہ اختیار کرنے سے بھی دامن بچاتے ہیں لیکن وہ بات کو کھل کر اور برملا کہنے کے خوگر ہیں اور ان کو اپنی حق پسندی کے آگے اس بات کا چنداں لحاظ نہیں رہتا کہ ناقدین فن اس کو

کس انداز سے دیکھیں گے۔ اسی سبب سے ان کی الگ ہی پہچان ہے۔ راحت ظلم و تشدد، عدم مساوات نا انصافی کے خلاف ہمیشہ حق گوئی و بے باکی سے سینہ سپر ہو کر کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں مہاجرین کے حالات اور جذبات کا ترجمان راحت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

اب کہ جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

اسی طرح ان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے لائق ہے:

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

راحت اندوری اپنے گرد و پیش پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ موجودہ سیاسی بازی گروں کی دکھتی اور کمزور رگوں پر اپنے اشعار کے نشتر برابر لگاتے ہیں ایسا کہ اکثر وہ تلملانے کی مہلت بھی نہیں پاتے۔ ان کے فکر و فن کی یہی خوبی انہیں اپنے ہم عصروں میں فوقیت عطا کرتی ہے۔ بقول محسن بھوپالی:

''راحت کی شاعری ہمارے عہد کی ترجمان بھی ہے اور نقاد بھی''

ایک سچا فنکار جب اپنے ذہن کے دروازوں کو کھول کر سوچتا ہے تو اس کے تجربوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ گردش وقت و حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنے آئینہ دل کو گرد حالات سے صاف کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں اس کا لہجہ احتجاجی کاوش بغاوت بھی بن سکتی ہے۔ راحت کا یہی حال ہے ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل عہد حاضر کی ناانصافیوں سے اوب چکا ہے ایسے میں وہ کڑوی اور ناگوار باتیں کرنے پر تل جاتا ہے اور وہ کر بھی کیا سکتا ہے اس لئے کہ اس عہد نے حساس قلب و جگر والوں کو ایسی باتوں کیلئے مجبور کر دیا ہے، جیسے:

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے

روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں
چاند پاگل ہوگیا تارے بھکاری ہوگئے

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے ہیں جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بے وقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آ گئے

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں اک تنہا شہر ایسا تھا

بقول ڈاکٹر عزیز اندوری:

''راحت کی باتوں میں کھوکھلا پن نہیں ہے۔ وہ سماج کے کھوکھلے تصورات کے خلاف کھری کھری سنا دینے کا قائل ہے اس کے تیور میں ڈھیلا پن نظر نہیں آتا کہ وہ تمام ناانصافیوں اور عصبیت کے خلاف اپنے تیوریوں پر بل ڈال کر للکارنے کو اولیت دیتا ہے اس کا دل موم کی طرح پگھلنے اور وقتی طور پر روشنی پھیلانے والا نہیں کہ وہ لہجے کو تلوار کی کاٹ بنا کر پیش کرنے کو مقدم سمجھتا ہے۔ اسکے الفاظ مضمحل نہیں کہ وہ لفظوں کو تیزی سے دماغوں کو جھنجھوڑ دینے والا فنکار ہے۔ اس کی شاعری ان تمام تیز طرار صورتوں کے باوجود محض لفظوں کی گھن گرج تک محدود نہیں ہے بلکہ شور نشور جیسی کیفیت پیدا کر کے مردہ طبیعتوں کی افسردگی کو کسی حد تک مٹانے کا فرض بھی انجام دیتی ہے۔'' (۱)

راحت کو آج کے باشعور انسان اور ایک حساس فنکار کی طرح منقلب صورتوں یا حالات کا صرف احساس و عرفان ہی نہیں بلکہ حالات کی تخریبی صورتوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ جو تاریخی اعتبار سے غیر واجبی حقائق کے نام پر سچائیوں کو مٹا دینے پر آمادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راحت اپنی حق شناسی اور حق

---

(۱) مضمون تیکھے لہجے کا شاعر، ڈاکٹر عزیز اندوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

پسندی کے تحت ایسی منقلب صورتوں پر کھل کر طنز کرتے ہیں۔

اسی گلی میں وہ بھوکا فقیر رہتا تھا
تلاش کیجئے خزانہ یہیں سے نکلے گا

امیر شہر تری طرح قیمتی پوشاک
میری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

ہمیشہ سر پہ رہی اک چٹان رشتوں کی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اٹھایا ہے

ہمیں دربار میں آنے کی اجازت ہی نہیں
ہم نہ اعزاز نہ عہدہ نہ مراتب سمجھے

غزل اپنے لچکیلے پن اور وسعت بیان کی وجہ سے ہمیشہ مقبول اور بے مثال تصور کی گئی ہے۔اس لئے اگر آج غزل تشبیہات و استعارات، رمز و کنایہ ایمائیت اور اشاروں کے حصار سے باہر آ کر سیدھے سیدھے اپنے دل کی بات کہہ دینے پر آمادہ ہے تو راقم کے خیال سے اس کے استحقاق میں پابندی نہیں ہونی چاہئے۔راحت نادر تشبیہات بے مثل استعارات اور لاجواب قسم کی تلمیحات میں ادھر ادھر سرگرداں نہیں ہوئے۔ان کی غزلوں میں ایسے استعارے ضرور مل جائیں گے، جنہیں استعاراتی رویوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔راحت ان رویوں کو نادرالوجود بنانے کی فکر سے آزاد ہو کر کہنے کے خوگر ہیں اس لئے ان کا کہا ہوا شعر براہ راست سمجھ میں آتا ہے۔

دکھائی دیتا ہے جو بھیڑیوں کے ہونٹوں پر
وہ لال دودھ ہماری سفید گائے کا ہے

کیسے کیسے لوگوں نے اشنان کیا
حکم ملے تو ہم بھی نہالیں گنگا جی

بلندیوں کا نشہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا

میرا جہاز زمیں پر اترنے والا تھا

سیہ مٹی کی چڑیوں کے بدن پر

گلابی پر لگا کر بیچتا ہوں

راحتؔ کا ایک فن یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور کے مروجہ محاوروں میں گفتگو کرتے ہیں اس لئے انکے اشعار بہ آسانی ذہن وقلب میں اتر جاتے ہیں۔ راحت جدید ترین پیرایہ اظہار میں تلخ سے تلخ بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اس کام میں وہ اپنے پرائے کا تصور مٹا دیتے ہیں اور دوٹوک بات کہہ دیتے ہیں۔

کئی دن سے مرے اندر کی مسجد

خدا بیزار ہوتی جارہی ہے

بہت کانٹوں بھری دنیا ہے لیکن

گلے کا ہار ہوتی جارہی ہے

راحتؔ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار براہ راست عوام سے گفتگو کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انداز بیان سادہ زبان آسان اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اشعار از دل ریزد و بر دل افتد کے پورے مصداق ہوتے ہیں۔ وہ بات کو طول طویل بنانے یا گھما پھرا کر کرنے میں یقین نہیں رکھتے، جیسے یہ اشعار دیکھئے:

مجھ میں کتنے راز ہیں بتلاؤں کیا

بند ایک مدت سے ہوں کھل جاؤں کیا

عاجزی منت خوشامد التجا

اور میں کیا کیا کروں مرجاؤں کیا

ایک پتھر ہے وہ میری راہ کا
گر نہ ٹھکراؤں تو ٹھوکر کھاؤں کیا

راحت اندوری کے شعری کائنات ایک مہذب چیخ اور ایک احتجاج ہے، جس میں مجلسی آداب کا لحاظ قائم نہیں رہ سکتا۔ آزدی کی جنگ ہندو اور مسلمانوں نے مل کرلڑی اگر ہندو مارے گئے تو مسلمانوں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور تختہ دار کو چوم کر وطن عزیز پر جان نچھاور کردی۔ لیکن آزادی کے بعد اردو کی زبوں حالی اس کے ساتھ سوتیلا برتاؤ اور لسانی تعصب اس کے بولنے والوں کو جاسوسوں اور ملک دشمن ٹھہرانے کا بے بنیاد رویہ اور تقسیم ملک کا ذمہ دار قرار دینے کا الزام اقلیتوں کیلئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہونا، اور سب سے بڑا ستم یہ کہ کل تک جو ساتھ تھے ایک دوسرے کے ہمدرد اور دکھ درد کے ساتھی تھے وہ فرقہ وارانہ فساد میں جلتے ہوئے مکانوں اور بہتے ہوئے خون کے سیلاب میں اپنا اعتماد اور نقطہ نظر یقین اور ہمدردی سب بھول گئے۔ موسم کی طرح بدلتی حکومتیں، فروخت ہونے والے ووٹ اور رہنما ایسے کہ ''کسی طرح سے دھنی اَرجت ہو یہ اُدّیش'' رکھنے والے اور اپنی غرض اور مقصد کے عوام کو بے جان اشیا کی طرح استعمال کرنے والے سیاست دانوں کی بے ایمانی، رشوت خوری، غربت اور بھوک مری جیسے خوں فشاں حالات نے راحت کی شاعری کو ایک مہذب کرخت قسم کی چیخ نے نیا لہجہ، نیا انداز اور بے ساختگی دی ہے۔ وہ اپنے عہد کے حالات وشعری روایات اور ادبی تحریکات کا حالانکہ علم رکھتے ہیں پھر بھی ان کے مسائل اور ہیں اور اس کا اظہار وہ جس طرح کرتے ہیں وہ انداز فکر اور زبان کی آرائش پر توجہ نہیں دے سکتی نہ کوٹھے پر گائی جانے والی غزل بن سکتی ہے اور نہ سڑکوں بازاروں میں گنگنائی جاسکتی ہے۔ یہ ایک ایسی چیخ اور کراہ ہے، جو نہ نعرہ ہے اور نہ دیوانگی۔ جسے دیواروں پر سجایا نہیں جاسکتا۔ راحت کی شاعری مزاحمتی شاعری ہے جو سڑکوں گلیوں اور شہر در شہر پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف صدائے بازگشت ہے۔ راحت نے غزل کی تمام قدیم روایات کے برعکس اپنی روایت قائم کی اور اشعار کو نیا ذائقہ عطا کیا ہے، جو قطعی غزل کے دامن سے باہر کی چیز نہیں۔ انہوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں اور ہم پیشہ

ساتھیوں کے ساتھ یہ معجزہ دکھایا ہے اور اکثر ہم عصروں سے زیادہ اور فنکاری کے ساتھ۔

تیری دستار پہ تنقید کی ہمت تو نہیں
اپنی پاپوش کو قالین کہا ہے میں نے

میں قطرہ قطرہ مرتا رہا ہوں تمام عمر
جو زہر پی سکے وہ میرا جاں نشین بنے

ہمارے شہر کی بینائیوں پہ روتے ہیں
تمام شہر کے منظر لہولہان پڑے

اپنی ہر سانس کو نیلام کیا ہے میں نے
لوگ آسان ہوئے ہیں بڑی دشواری سے

ہے کبوتر جس جگہ تصویر میں
اس جگہ اک چیل ہونا چاہئے

کچھ دور میں بھی دوش ہوا پر سفر کروں
کچھ دور تو بھی خاک کی صورت بکھر کے آ

بلندیوں کے سفر میں یہ دھیان آتا ہے
زمین دیکھ رہی ہوگی راستہ میرا

اپنے سوکھے ہونٹ دکھا کر بستی والے لے آئے
ایک سمندر بانٹ رہا تھا دو دو مٹھی ریت

یہ سوچ سوچ کر شرمندگی سی ہوتی ہے
وہ حکم دے گا جو فریاد کرنے والا ہے

خدا دراز کرے عمر میرے دشمن کی
کوئی تو ہے جو مجھے یاد کرنے والا ہے

مندرجہ اشعار سیاسی سماجی معاشرتی حقائق کا صرف بیان نہیں بلکہ اپنے عہد سے وابستہ سوالوں پر تبصرہ اور انکے خلاف جھنجھلاہٹ ہے۔ راحت کی غزلوں میں فسادات کا ذکر کچھ زیادہ ہی موضوع بنا نظر آتا ہے۔ آنکھوں میں خواب ہیں اگر نظر آتے ہیں تو لہولہان، ناروا فضا، شکست و ریخت کی آواز کو عنقا ہو جانا، سیاسی ایوانوں میں اونگھتے ہوئے، سیاسی گرگوں کا گونگے کی طرح ہاتھ اٹھا دینا، جوانوں کی طرح جلتے رہنا اور گلی گلی دہشت بوتے رہنا اور زندگی کو جہنم یا آتش کدہ نمرود بنا دینا، نئے فتنے ایجاد کرنا بھڑکا کر انسانوں کا خون بہانا یہ صرف ایک شاعر کی آواز یا مصور کا برش ظاہر تو کر سکتا ہے لیکن اس روشنی کو ختم نہیں کر سکتا۔ راحت اندوری ان تمام حالات کو دکھاتے ہیں تو ان کے ہم زبان سیکڑوں ہو جاتے ہیں اور وہ نا انصافی، حق تلفی، ظلم و زیادتی، فسادات دنگے رشوت ستانی، عدم مساوات نا انصافی، حق تلفی، الزام تراشی اور منافرت کے زخموں میں زیادہ ٹیس، تپش، گہرائی، سوزش اور درد و بے چینی ضرور محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس طرح یہ وقتی طور پر سہی صرف راحت کا ہی کرب نہیں ان کا بھی درد بن جاتا ہے جو سن رہے ہوں، ان اشعار کی اثر آفرینی دیکھئے:

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں

بنا دیا ہے جسے شہر یار لوگوں نے
جو سارے شہر کو برباد کرنے والا ہے

اسلحے تو خیر پھر آجائیں گے
کرفیو میں ڈھیل ہونی چاہئے

بستی بستی دہشت کس نے بودی ہے

گلیوں کی بازاروں کی ہلچل بھیجو نا

چاند سورج کہاں اپنی منزل کہاں

ایسوں ویسوں کو منہ مت لگایا کرو

راحت کے شعری کینوس سے محض یہ کہہ کر ہٹ جانا کہ انہوں نے تلخ تیز اور طنز یہ لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کو بات کہنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی غزلوں میں ایک انفرادیت ہے، جن کا ذائقہ لہجہ اور کیفیت ان کا نام لئے بغیر بھی بتا دیتا ہے۔ دراصل ان کا طرز اظہار اور اسلوب ہی ان کی شناخت بن چکی ہے۔ ان کے کلام میں اچھے اشعار کی ہرگز کمی نہیں وہ کسی بھی اچھے اور پسندیدہ انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے عہد کی سچی تصویریں ہیں۔

شام ہوتی ہے تو پلکوں پہ سجاتی ہے مجھے

وہ چراغوں کی طرح روز جلاتا ہے مجھے

ہم اپنے شہر میں محفوظ ہیں خوش بھی ہیں

یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرتا ہے

موسم کی من مانی ہے

آنکھوں آنکھوں پانی ہے

راحت نے پوری دنیا کی سیر کی اور ہر ذرہ میں آفتاب دیکھنا بھی خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی بے باکی فکر کی الگ ہی راہ اختیار کی ہے۔ انہوں نے عصری کرب کو خندہ و استہزا کی شکل دے کر اس کی نہایت چبھتی ہوئی ترجمانی کی ہے۔ وہ ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی خاردار جھاڑیوں سے بعافیت گزرے اس طرح کہ ان کا دامن کہیں نہیں الجھا۔ ان کا رشتہ قدیم یا کلاسیکی غزل سے مربوط ضرور ہے لیکن ان کا اسلوب و لہجہ منفرد ہے جو بیک نظر پہچانا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ انہوں نے اپنے پیش روؤں کے اثرات قبول کئے مگر اس سیلاب میں وہ بہے نہیں۔ جمالیاتی نظام کو پوری طرح قائم رکھ کر عصر حاضر کی تصویر کشی مشکل کام ہے۔ ناہموار اور سفاک لمحوں کو خوش رنگ بنانا مشکل کام ہے یہ راحت نے بڑی خوش اسلوبی سے کر دکھایا ہے۔ راحت کی شاعری ایسا آئینہ ہے، جس میں مسائل گرد و پیش تہہ در تہہ نظر آتے ہیں۔

میں تجھ کو روشنیاں دے کے جاؤں گا اک دن
اندھیری رات سمجھ کر گزار دے مجھ کو

میں آج اپنے گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس ایک قمیض تھی جو میرا بھائی لے گیا

میں اپنا عزم لیکر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پر رکھی تھی قسمت گھر پر رکھی تھی

ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے ان میں خندہ اور استہزا بھی ہے اور عصری نظام کی جھلک بھی، یہی لہجہ راحت کی غزل کا منفرد اور نمایاں لہجہ ہے۔ راحت کی غزل میں ان کے حسی پیکروں نے بصری پیکروں کا روپ اختیار کر لیا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں رہ جاتا کہ ان کا مشاہدہ وسیع اور گہرائی لئے ہوئے ہے۔ یہی مشاہدے کی وہ گہرائی ہے، جس نے انہیں زندگی کے عرفان کا سلیقہ سکھایا اور ایک خوشگوار طنز آمیز لہجہ اور اسلوب بیان عطا کیا ہے جس میں سفا کی ہے دوا کی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

دولت بازو حکمت گیسو شہرت ماتھا غیبت ہونٹ
اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے

ترے سلوک تری آگہی کی عمر دراز
میرے عزیز میرا زخم بھرنے والا ہے

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

راحت کا مجموعہ ''پانچواں درویش'' ایک شاہراہ ہے، جس پر ان کی فکر کا قافلہ رواں دواں ہے ان کی فکر لامحدود میں ابھی اور جہانوں کا سفر وسیر ہے اسی لئے ایسے امکانات ہیں جن سے ابھی پردہ اٹھنا ہے۔ راحت کے عزم وحوصلہ کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ابھی اور بھی زمانوں کے چہروں کی نقاب کشائی کریں گے۔ انہوں نے اپنی غزل میں وہ سب کچھ سمویا ہے جس میں ان کا عہد کروٹیں لے رہا ہے جس میں ناگواریاں بھی ہیں ناہمواریاں بھی لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں نہ تلخی ہے نہ جھنجھلاہٹ اور نہ پسپائی ہے اور کج ہمتی اور نہ حوصلہ شکنی۔ اس مجموعے کے صفحہ اول پر ہی حضرت علی کا قول '' آدمی اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے'' درج ہے۔ جو نہایت پر مغز اور معنیٰ خیز ہے۔ اس قول زریں کے حوالے سے راحت نے اپنے کلام اور شخصیت کو سمجھنے کی کنجی ہمارے ہاتھ میں دے دی ہے اور مجموعہ کے دوسرے صفحہ پر خود ان کا یہ قول بھی ان کے کلام کو سمجھنے کا ایک روشن اور تابناک آئینہ ہے۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

شاعری انسان کے فکر وخیال، جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات کے تخلیقی اظہار کا نام ہے، چند لفظوں میں رواں کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود
دل کے جذبات کا اظہار بہ تائید و قیود

انسان کو خلق کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے قوت گویائی جیسی نعمت عظمیٰ عطا کر کے اسے صف حیواں سے الگ لا کھڑا کیا ہے اور شاعری بیان کی اعلیٰ وارفع صفت ہے، جس پر صحیح معنوں میں کلام کا اطلاق ہوسکتا ہے اور انسانی تقاضوں کے تحت کلام نطق کا محتاج ہے لہٰذا کلام کیلئے زبان اور بیان کا سلیقہ بیک مقام ہونا ضروری ہے اور یہ سلیقہ راحت میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

راحت کے جذبات واحساسات کی شدت اسے مشاہداتی شکل عطا کر دیتی ہے اور محسوسات بسا

اوقات بصری ہیولہ بن کر سامنے آتے ہیں راحت کی غزل میں بصری پیکر بہت زیادہ ہیں۔ یہ پیکر اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور توانا ہے۔ اسی مشاہدے نے ان کو عرفان حیات عطا کر دیا ہے ایک بے نمایاں طنز کا لہجہ دیا ہے اور طنز و مزاح چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مدافعت ہے جو ان کی شاعری میں نمایاں ہے زندگی کی انہیں تلخیوں نے انہیں سخن گستری کا ہنر عطا کیا ہے، بے خوف اور بیباکی دے کر اسے انفرادیت عطا کی ہے کچھ اسی طرح کی ناگواریوں کے خلاف وہ اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

دولت بازو گیسو حکمت شہرت ماتھا، غیبت [illegible]

اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے

ترے سلوک تری آگہی کی عمر دراز

مرے عزیز مرا زخم بھرنے والا تھا

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا

میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

راحت اندوری نے اپنی غزل میں وہ سارے نقوش ابھارے ہیں، جن میں ان کا عہد کروٹیں لیتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے لہجہ میں جھنجھلاہٹ نہیں ہے اور نہ مایوسی بلکہ ان کی غزلیں اپنے سارے لوازمات کے ساتھ نظر آتی ہے اور کتنے ہی جہانوں کی سیر کراتی ہیں۔ ہر فن پارے کا مقصد فراہمی تسکین اور انبساط ہے لیکن اکثر و بیشتر نوزائیدہ قسم کے نقادوں نے اس کی تہہ داریوں کو نہیں کھنگالا اس لئے اس کے معنوی پیکروں کو وہ وسعت نہ مل سکی جس کا اسے حق حاصل تھا۔ غم و خوشی کی کیفیات سے بے نیازی ہی اصل میں نشاط و انبساط ہے یہی وہ نقطہ انتہا ہے، جہاں سے ہر چیز کوتاہ نظر آتی ہے اگر کسی فن پارے کا مقصد سرخوشی و نشاط ہے تو راحت کی غزل اس میزان پر کھری اترتی ہے۔

یہ کہاں لے کے چلے آتے ہو پلکوں کے چراغ
تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہوا کیسی ہے
میں گرد گرد ہوں خود کو نہ دیکھ پاؤں گا
تو آئینہ ہے تو آکر سنوار دے مجھ کو

راحت اندوری کے کلام میں قوم کا درد اسی شدت احساس کا پرتو لئے ہوئے ہے، جس نے حقیقت نگاری کے ساتھ ان کو جرأت اظہار بھی عطا کیا ہے یہ درد و کرب ماضی کی ان عظیم یادوں کی دین اور حقائق کا عکس لئے ہوئے ہے ان کے احساس و اظہار میں ایسی قوم کا درد ہے، جو کبھی تخت و تاج کے ساتھ جاہ و حشم کی بلندیوں پر فائز تھی اور آج انقلاب زمانہ کے ہاتھ ذلت و پستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور جس کے پاس پدرم سلطان بود کے تصور سے دلبستگی کے سوا کوئی دوسرا وسیلہ زندہ رہنے کا نہیں ہے یہ قوم اپنے ماضی میں زندہ ہے اور حال سے بے نیاز ہے اس کا کوئی مستقبل نہیں اگر ماضی کی یادوں نے اسی کو تحریک عمل دی ہوتی تو یقین ہے کہ منظر ہی دوسرا ہوتا۔

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہاں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائیں دیں گے

راحت نے لفظ زمینوں کو علامت کے طور پر استعمال کر کے عالمی پیمانے پر قوموں کے عروج و زوال کی کہانی دہرائی ہے اسی طرح یہ اشعار دیکھئے:

داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی
ہمارے جسم کے داغوں پر تبصرہ کرنے
قمیضیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں

زوال رسیدہ قوم کا یہ عجیب و غریب المیہ ہے کہ دوسری قومیں جو سر بلند ہیں ان کی تہذیب و

ثقافت کو اپنا کر بھی دوسری قوموں کا وہ ہدف بنی رہتی ہیں۔

ہمارا نام نکلا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بٹیا

اپنی کم مائیگی، ذلت و پسپائی کی جملہ وجوہات کو مقدر کے حوالے کر کے راحت نے ہر زوال یافتہ فرد ہو یا قوم کی نفسیات کا دل میں چبھتا ہوا پہلو پیش کر دیا ہے۔ دوسرے دو اور اشعار ملاحظہ کیجئے، جس میں انہوں نے زبوں حالی کے حقیقی اسباب بیان کئے ہیں۔ ایسے اشعار بلاشبہ اسی وقت جنم لے سکتے ہیں جب شاعر کو مسلمانوں کے عروج و زوال کا نہایت گہرا مطالعہ ہو ورنہ ایسے اشعار صرف رواروی میں وجود میں نہیں آ سکتے۔

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے
بے حسی مردہ دلی، رقص، شرابیں، نغمے
بس انہیں راہوں سے قوموں پہ زوال آتے ہیں

راحت نے اپنی بے داراور چاق و چوبند اور منہ پھٹ اور بے باک غزل کے ذریعے مشاعروں کے حوالوں سے وہ کچھ دیا ہے جو ادبی رسائل نہیں دے سکے ہیں۔ انہوں نے لفظوں کی بازی گری کی ہے اور نہ اشعار کے گل بوٹے سجائے اور ندا فاضلی کی طرح صرف سمعی اور بصری پیکر پیش کر کے رہ گئے اور انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح بلند آہنگی گھن گرج اور بے باکی اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے لفظوں کو تیر و تبر بنا کر عصری خداؤں سے جیسی مبارز طلبی کی ہے یہ انہیں کا کارنامہ ہے۔

وہ دوہری شہرت رکھتا تھا اس سے کوئی کیا ملتا
کبھی دلی میں رہتا تھا کبھی چنبل میں رہتا تھا

گزشتہ سال کے زخمو ہرے بھرے رہنا

جلوس اب کے برس بھی یہیں سے نکلے گا

وہ پانچ وقت نظر آتا ہے نمازوں میں

مگر سنا ہے کہ شب کو جواگر چلاتا ہے

تھوڑا پیچھے نظر کریں جوش نے بھی اسی طنطنہ سے انگریزی بھیڑیوں کے مقابلے میں جرأت و جسارت کا مظاہرہ کیا تھا آج کے دور میں آزاد ہندوستان کے سیاسی بھیڑئے اسی روپ کو دھارے ہوئے ہیں۔ راحت نے انہیں سیاسی بھیڑیوں کی گھناؤنی سیاست کا پردہ چاک کیا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ بہانگ دہل کہہ دیا ہے۔ وہ اپنی ذات کو علامت بنا کر پیش کرتے ہیں:

میں ایک سچ ہوں اگر سن سکو تو سنتے رہو

غلط کہوں تو میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دینا

یہ راحت کی فنی مہارت اور چابکدستی ہے کہ انہوں نے سن لینا نہ کہہ کر سنتے رہو کہا ہے۔ سنتے رہو کیلئے بار بار کہنے والا یا کہتے رہنے والا ضروری ہے اور شاعر نے خود کو علامت کے طور پر استعمال کر کے کھلم کھلا کہنے کا جواز خود بنالیا ہے۔ حبیب ہاشمی اپنے ایک مختصر مضمون میں راحت اندوری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت وقیع بات کہتے ہیں:

''راحت چونکہ بہت اخلاق وضع داری اور بے باک شاعر ہیں اس لئے ان کی شاعری میں اخلاقیات وضع داری اور بے باکی بدرجہ اتم موجود ہے بقول ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد آج کے اس بے راہ روی اور قحط الرجالی کے دور میں ظالم سیاست دانوں اور ناانصافیوں کے خلاف جس سلیقہ مندی آرٹ طمطراق اور بے باکی سے کوئی شاعر شعر کہتا ہے تو وہ راحت اندوری کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ Genuine شاعر کسی نقاد کسی مبصر کے قلم و کامحتاج نہیں ہوتا، سچے شاعر کو غیر تخلیق کار کے ذہنی تحفظات یا تعصّبات کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ شاعر کے تخلیقی عمل کا بہاؤ رخ اور رفتار وفکری سمندروں میں پار

کرنے میں اس کے دست بازو بن جاتے ہیں۔ بقول حبیب ہاشمی:

''راحت پچھلی تین دہائیوں سے (اب چار دہائیاں ہوگئی ہیں) شعر کہتے اور مشاعروں میں سناتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی ان کے قلم میں موچ نہیں ہے۔ راحت ایک زود گو شاعر ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کی طرح تیزی سے شعر کہنے والے آج خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ آج مشاعرے کے اسٹیج پر راحت اندوری اپنے شعری پرفارمنس کی وجہ سے زیادہ مقبول ہیں۔

گھر سے یہ سوچ کے نکلا ہوں کہ مرجانا ہے
اب کوئی راہ دکھادے کہ کدھر جانا ہے
یہ الگ بات کہ پستی میں پڑے ہیں ورنہ
چاند تاروں کی تو ہم راہ گزر جانتے ہیں
تیشہ بردارو سمندر بھی ہے اس صحرا کے بعد
دن تو جوں توں کٹ گیا ہے رات بھاری آئے گی
خبر نہیں کہ ہوا کس طرف اڑالے جائے
ہماری نسل بکھرتا ہوا برادہ ہے
عجیب لوگ ہیں میری تلاش میں مجھ کو
وہاں پہ ڈھونڈتے ہیں جہاں نہیں ہوں میں'' (۱)

راحت اندوری شاعروں اور صاف گویوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے قلم کو سینہ باطل کیلئے نیزے کی طرح استعمال کیا ہے ان کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑے باطل پرست کے سامنے منہ پھٹ بات کرنے میں بھی ان کو ذرہ بھر ہچکچاہٹ نہیں ہوتی وہ ہر فیصلہ اپنے ضمیر کی آواز پر کرتے ہیں، بہ الفاظ شاعر جمالی:

---

(۱) ایک مختصر مضمون حبیب ہاشمی مشمولہ لمحے لمحے ۲۰۰۲، ص ۲۰۸

''یہ اعتراضات اسی گروہ کی جانب سے اٹھے جو ناحق پرستی میں آج بھی مبتلا رہے............
راحت اندوری ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔ وہ کینوس پر رنگوں کی آمیزش سے شاہکار تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر وہ صرف اسی فن کو اپنا وقت دیتے تو اہم ترین فنکاروں میں شمار کئے جائے۔''(۱)

اس میں شک نہیں کہ راحت اندوری کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ایک زبردست دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ کہ نقادوں نے انہیں مشاعرے کا شاعر قرار دے کر ان کے کمالات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ان کا یہ عمل ادبی دیانت کے خلاف ہے کیونکہ صرف اس لئے راحت کی شاعری کو سمجھنے سے گریز کیا جائے کہ مشاعروں کا مقبول اور معروف شاعر اور ایک عام بول چال کی زبان ہے اور مشاعروں کی عوامی اہمیت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں یہ مشاعرے ہی ہیں، جنہوں نے آزاد ہندوستان میں اردو کو ٹھکرایا گیا بلکہ اس پر بڑا نازک دور آیا تو یہ مشاعرے ہی تھے، جنہوں نے اردو کی مقبولیت کو برقرار رکھا لہٰذا راحت کی شاعری کے مرکزی تصور اور اس کی شاعری کو کما حقہ سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کی عینک اتار کر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے وہ پچھلے پچیس تیس سالوں سے اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں کئی برس تک اسی باغ و بہار کا یہ چوتھا درویش اپنی داستان غم سنا تا رہا ہے اور دیکھنے والے سمجھے کہ یہ درویش اپنا قصہ تمام کر کے خاموش ہو جائے گا مگر اسی اثنا میں اچانک یہ پانچواں درویش بھی آدھمکا اور اب وہ اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ اردو شاعری کا یہ پانچواں درویش کوئی اور نہیں راحت اندوری ہے یہ اپنے عہد کے عوام کے دکھ درد کی داستان اپنی طنزیہ اور احتجاجی لب و لہجہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے جسے زمانہ بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ ان کے کلام کے مرتکز آمیز مطالعہ سے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بقول علامہ اقبال:

ع- ''کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے''

---

(۱) مضمون جرأت انکار کا شاعر، شاعر جمالی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۲۱۴

ان کی شاعری کا مرکزی کردار بے روزگار فساد زدہ مظلوموں کے درمیان گھرا ہوا وہ نوجوان ہے، جس کے بزرگوں کے تاج آج بھی عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے سر کی پھٹی ٹوپیوں پر اور اس کی زبوں حالی پر طنز کے تیر برسائے جا رہے ہیں حالانکہ زیادہ دن نہیں گزرے اونچے اونچے محلات ان کے مسکن تھے اور غیر مفتوح قلعوں پر آج بھی اس کے بزرگوں کے نام کندہ ہیں، چند مثالیں دیکھئے:

کہاں وہ خواب محل تاج داریوں والے
کہاں یہ بیلچے والے تگاریوں والے
مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں
مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے
ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بٹیا

راحتؔ اندوری کی شاعری ماضی زدہ ضرور ہے مگر اس کا ماضی اس کے پاؤں کی بیڑیاں نہیں بن سکا بلکہ وہ اس سے خود احتسابی کا کام لیکر خود کو کسی کام کے لائق ضرور بنانا چاہتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ قوموں کے زوال کے کیا راستے ہیں وہ ان کو مسدود دیکھنا چاہتا ہے۔ اکثر اس کو اپنے سارے نظریات اور عقائد کھوکھلے اور بے آبرو بھی معلوم ہوتے ہیں۔

راحتؔ اندوری نے اپنے عہد کا مطالعہ بہت باریکی سے کیا ہے۔ وہ انسانی مزاج اور شخصیت کی گلیوں سے گزرنے کا ہنر جانتا ہے نئی زندگی کی مصلحت اندیشیوں کا اسے علم ہے اور وقتی طور پر رشتوں کے بننے بگڑنے کو خوب سمجھتا ہے۔

اب پھرتے ہیں ہم رشتوں کے رنگ برنگے زخم لئے
سب سے ہنس کر ملنا جلنا بہت بڑی بیماری ہے

شہروں شہروں گاؤں کا آنگن یاد آیا

جھوٹے دوست اور سچا دشمن یاد آیا

دلوں کا رشتہ ہی سب سے بڑی صداقت ہے

جسموں کی آرائش ہوتی رہتی ہے

کائی جمی رہتی ہے روحوں پر لیکن

جسموں کی آرائش ہوتی رہتی ہے

راحتؔ اندوری کی شاعری اس عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح محض فرد یا ذات کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ وہ انسانیت کی پیچیدگیوں تک محدود رہنا چاہتا ہے وہ اپنے زمانے کے نوجوانوں کو فعال اور متحرک دیکھنا چاہتا ہے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اس کا مسلک نہیں ہے اس کی شاعری کچھ کرتے رہنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ راحت زندگی کی حرمت کو برقرار اور وقار کو بچائے رکھنے کیلئے انہیں آگے بڑھ کر سڑکوں پر آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

سڑک پر وردیاں ہی وردیاں ہیں

کہ آمد پھر کسی تہوار کی ہے

یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے

کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے

اٹھو اے چاند تارو شب کے سپاہیو

آواز دے رہا ہے لہو آفتاب کا

زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پر نکلنا ہوگا

گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا

اے چراغو تمہیں جلنا ہے سحر ہونے تک
کہیں منہ زور ہواؤں سے چپک مت جانا

راحتؔ کی غزل زخموں کو کریدنے احساس کی آنچ کو بڑھانے اور سوچ کو بے چین کردینے والی شاعری ہے۔ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف رائج شعری پیرایوں سے ان کا گریز اور مروجہ غزل کے مانوس علائم سے دشمنی کی حد تک گریز ہے۔ اسی لئے وہ اپنے الفاظ لہجے اور اسلوب سے قاری کو ایک خوش گوار اور تحیر آمیز فضا خلق کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر پن اور انوکھے پن کا یہ عمل کچھ زیادہ ہی تیز ہے ان کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قافیہ کا استعمال میر انیس یا داغ دہلوی کی طرح کرتے ہیں۔ قافیہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ذہن سامع یا قاری پر دستک دیتا ہے۔ان کی شاعری بیانیہ کے باوجود اثر آفرینی سے بھرپور ہے۔ ہر فنکار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیقی فکر سے مناسبت رکھنے والے عطر کشید کرے اس میں ہرج نہیں کہ تنقید کی بصیرت اور مشورے سے جہاں کام نکلتا ہو فائدہ اٹھایا جائے لیکن ہر نقاد کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کر دینا بھی درست نہیں۔ راحت نے تنقید کو اپنا رہنما نہیں بنایا ان کے وجدان اور ذوق سلیم نے جو راہ دکھائی اسی کو انہوں نے اختیار کیا اور کامیاب بھی ہوئے اس ضمن میں ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

فن پر جتنی تنقیدیں ہیں
فن اتنا باریک نہیں ہے

راحت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔انہوں نے اپنے ہم عصر بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح زندگی کے حقائق اور تلخیوں اپنے عہد کی ضرورتوں کو اور عصری مسائل کے اظہار کو اپنا وسیلہ غزل ٹھہرایا ہے۔ حالات نے معاشرے اور سماج کو جن اختلافات و تضادات اور نابرابری کا شکار بنا رکھا ہے ان کے سارے نقوش راحت کی غزل میں ابھرے ہیں۔ انسانیت کو درپیش پیچیدہ مسائل الجھے سوالات اور زندگی کی تلخیوں کو بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی ایسے لمحات کا بھی فنکار کو سامنا ہوتا ہے جب اس کی خود

زبان فگار ہونے لگتی ہے۔ اسی بات کو راحت اپنے شعر میں یوں کہتے ہیں:

وہ اک سوال ہے پھر اس کا سامنا ہوگا
دعا کرو کہ سلامت میری زبان رہے

زبان کے سلامت رہنے کی فکر اور درد اس دور کے قریب قریب ہر فنکار کو ہے۔ لیکن دوسرے کے مقابلے میں راحت کا درد کچھ بڑھ کر ہی محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا لہجہ تلخ اور باغیانہ ہے۔ ان کے یہاں نشتریت اور زبان میں لوچ و لچک کی جگہ پر کھردراپن ہے۔ اپنے ماضی سے جڑے رہنے کی خواہش ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے عمداً غزل کے روایتی انداز لفظیات اور مزاج سے بسا اوقات انحراف بھی کیا ہے اور اپنی بات اپنے ڈھنگ اور انداز سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ خیال وفکر کے نئے پن نے ان کی غزل کو دلچسپ اور انوکھا بنا دیا ہے یہ ایسے اوصاف ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے لہجے اور اسلوب میں جو دھار اور کاٹ ہے وہ ان کے اسلوب کو نیا بنا دیتی ہے ان کا اظہار سلیقہ مندی لئے ہوئے ہے اور سب سے الگ تھلگ ہے۔ راحت آج کے انسان کی زندگی کو اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ آئینہ بنا کر ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔

ہرے بھرے کئی شہروں کا تجربہ ہے مجھے
کہیں بھی جایئے جنگل ضرور نکلے گا

اب میرے حال پہ شرمندہ ہوئے ہیں وہ بزرگ
جو مجھے پھولنے پھلنے کی دعا دیتے تھے

شکستہ کشتیوں سے کیا امیدیں
کنارے سو رہے ہیں پار ہو جا

رشتہ رشتہ سایۂ دیوار و در میں قید ہوں
میرا دکھ یہ ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں قید ہوں

یہاں تو موت کا سیلاب آتا رہتا ہے
بہت بچا تھا مگر اب کی بار میں بھی ہوں

میں جن کے بولتے الفاظ کو گونگا سمجھتا ہوں
وہ بوڑھے ہونٹ میرے واسطے جنت بناتے ہیں

روز ہم اشکوں سے دھو آتے ہیں دیوار حرم
پگڑیاں روز فرشتوں کی اچھال آتے ہیں

راحت کی غزلوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ زندگی کی کسی بہت اہم گرہ کو کھولنے کی کوشش میں ہیں لیکن ان کو کامیابی نہیں مل پا رہی ہے۔ تلاش و جستجو کی یہی کیفیت ان کے ہم عصروں کے یہاں بہت شاذو نادر ہی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بات کہنے کا ڈھنگ سب سے الگ اور منفرد ہے۔ راحت شعوری یا غیرارادی طور سے اس فکر میں ضرور رہتے ہیں کہ بات کچھ ایسی ڈھنگ سے کریں کہ قاری کو راحت کی بات اپنی بات محسوس ہو حالانکہ کہ تخلیقی عمل بہت ہی وقت طلب اور مشکل ہے مگر راحت یہ کام نہایت کلاسیکی رچاؤ سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو قاری کے تجربات اور مشاہدات سے اس طرح ملا دیتے ہیں کہ وہ اسے اپنی بات سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مخاطب پر ایسی نفسیاتی فضا تعمیر کر دیتے ہیں کہ ان کا قاری بھی خود کو اسی فضا میں محو گلگشت سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح اس کو نہایت انوکھی خوشی اور سرشاری محسوس ہوتی ہے۔ راحت کی غزلیں معاشرتی نظام کے تضادات زندگی کے تلخ حقائق، حالات کی بے ثباتی سنگینی بے یقینی خوف فسادات انسانیت کے مجروح ہونے آدمی کے فنا ہونے اور ماحول و حالات کے جبر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی لئے وہ عوام وخواص دونوں میں مقبول ہیں۔

کالج کے سب لڑکے چپ ہیں کاغذ کی ایک ناؤ لئے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی ہے بیکاری

یہ صرف عوام وغریب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ خواص اور امیرزادے بھی اسی کا شکار ہیں یہی کیفیت راحت کی شاعری کو ہمہ گیریت عطا کرتی ہے۔

سونے کا رتھ فقیر کے در تک نہ آئے گا
کچھ مانگنا ہے ہم سے تو پیدل اتر کے آ
یہاں تو چاروں طرف کوئلے کی کانیں ہیں
بچا نہ پائے گا کپڑے سنبھالتا کیوں ہے
خریدے ہیں میرے بچوں نے فاقے
میں سڑکوں پر مقدر بیچتا ہوں

راحت کی غزلوں کی زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے اس لئے ان کی تفہیم اور راحت کی بات کی ترسیل آسان ہے۔ وہ اپنی باتوں کو پیچیدہ نہیں بناتے لیکن اشارے اشارے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ علامتی پیرایۂ اظہار سے ان کے یہاں گریز کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ انہوں نے معنویت سے دامن کھینچ لیا ہے اور غزلوں میں ایک نئی پرکشش فضا تعمیر کرتے ہیں، جس کی زنجیر دور دور تک لے جاتی ہے۔ یہ ساری خوبیاں مل کر راحت کی غزلوں کو ایک نیا روپ نیا رنگ اور مزاج عطا کرتی ہیں۔

یہ کیسی روشنی ہے کہ احساس بجھ گیا
ہر آنکھ پوچھتی ہے کہ منظر کہاں گئے
میں سبک لفظ و معنیٰ کا امین
سنگ بھی آئے تو پانی کردوں
کٹی جاتی ہیں سانسوں کی پتنگیں
ہوا تلوار ہوتی جارہی ہے

بکھر چکا ہوں میں املی کی پتیوں کی طرح
اب اور لے کے کہاں تک غرور جائے گا

شاخ پر جتنے تھے پھل کوئی چرا کر لے گیا
اور ہم اخلاق کے پابند ہوکر رہ گئے

تو جو چاہے تو ترا جھوٹ بھی بک سکتا ہے
شرط اتنی ہے کہ سونے کی ترازو رکھ لے

ہمارا شوق ہے دارو رسن کی پیمائش
تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

یہ بھول مت کہ ابھی سر پہ آسمان بھی ہے
کسی کے سر کا دوپٹہ اتارنے والے

اندھیری رات کے گمراہ جگنوؤں کیلئے
اداس دھوپ کی ٹہنی پہ رات رکھ دینا

مجھے خبر نہیں مندر جلے ہیں یا مسجد
مری نگاہ کے آگے تو بس دھواں ہے یہاں

راحت کی خوبی یہ ہے کہ کسی بُنی سطح پر کوئی بڑا ہفت خواں سر کرنے کے مدعی نہیں ہوتے مگر زندگی کے تعلق سے ان سچائیوں، تصادمات اور کشمکش کو اجاگر کر دیتے ہیں، جن سے آج کا انسان جوجھ رہا ہے نیز یہ کہ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے ان چہروں کی نقاب اٹھانے کی فکر میں ہیں، جنہوں نے حیات انسانی کو ایک کربناک تماشا بنا دیا ہے اور اس کوشش میں وہ قدم قدم پر اپنے قاری کو اپنا شریک اور ہم خیال بنائے رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں درد و کسک کا اظہار صرف ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ سب کا درد ہے۔

یہ بوڑھی قبریں تمہیں کچھ نہیں بتائیں گی
مجھے تلاش کرو دوستو یہیں ہوں میں

سب ہی اپنی تیز گامی کے نشے میں چور ہیں
لاکھ آوازیں لگالیجے ٹھہرتا کون ہے

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک حرف کو صدا بھی مان

محبتوں کا سبق دے رہے ہیں دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے

کسی مکین کی آمد کے انتظار میں ہیں
میرے محلے میں خالی کئی مکان پڑے

ہوں لاکھ ظلم مگر بددعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

ابھی رنگوں کی زبان گنگ پڑی ہے لیکن
جب یہ تصویر بنے گی تو قیامت ہوگی

سورہی تھی اجلے کپڑے پہنے کالی آتما
کم سمجھ لوگوں نے ذرے کو ستارہ پڑھ لیا

ان کی غزلوں میں جا بہ بجا ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں، جو قاری کے ذہن وفہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اورانہیں حیات وکائنات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

کوئی بھی دور ہولے کر جہاد کی مشعل
میری طرح کوئی پاگل ضرور نکلے گا

وہ ایک تیر ہے جس کا شکار میں بھی ہوں
میں ایک حرف سہی دل کے پار میں بھی ہوں

موت لمحے کی صدا زندگی عمروں کی پکار
میں یہی سوچ کے زندہ ہوں کہ مرجانا ہے

بادشاہوں سے پھینکے ہوئے سکے نہ لئے
ہم نے خیرات بھی مانگی ہے تو خودداری سے

یہ کہاں لے کے چلے آئے ہو پلکوں کے چراغ
تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہو اکیسی ہے

راحت کی غزلوں میں حسن وعشق کی چھیڑ چھاڑ اور گھاتیں ہیں اور جمال یار سے مسرور ہونے کی حقیقت بھی۔ انسانی رشتوں کی شناخت ہے زندگی کا تقدس اور معصوم بچوں کی تصویریں ماں باپ بھائی بہن کے چہروں کی مسکراہٹیں ہیں اور اداسیاں بھی، جذبوں اور احساسات کی کسک۔ فساد زدہ لہولہان چہروں کے نقوش اور اپنی بے چہرگی کا درد اور المیہ۔ حق و باطل کا تصادم اور فرسودہ نظام حیات اور رسم و رواج سے انحراف بھی۔ ان تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں سمو کر انہوں نے غزلوں کو ایک نیا ذائقہ، کیف وسرور، اور نیاپن دیا ہے۔ انہوں نے غزل کو جو لہجہ اور آہنگ بخشا وہ ان کا اپنا ہے۔ انہوں نے غزل کو محدود فضاؤں سے گلوخلاصی دے کر وسیع تر امکانات اور کائنات سے متعارف کرایا۔ اس طرح غزل کو ایک کھلی فضا اور دنیا سے آشنا کر کے اسے ایک نیا ذائقہ دیا ہے۔

راحت کے بارے میں ایک خاص خیال یہ ہے کہ وہ مشاعروں کے شاعر ہیں اور مشاعرے کبھی ہیروشب کے تصور سے خالی نہیں رہے۔ لیکن آج کے مشاعروں کے بارے میں یہ خیال یقین کی حد تک راسخ ہے کہ مشاعروں میں پڑھنے والے اور مقبول ہونے والے شعرا کا کوئی ادبی مقام نہیں رہ جاتا اور اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مشاعروں میں عموماً ادبی ذوق رکھنے والوں کا فقدان ہوتا اور مجمع میں صرف

شعر وشاعری سے نابلد ہڑبونگ مچانے والوں کا مجمع ہوتا ہے، جہاں اچھا شعر بھی اپنی آبرو کھو بیٹھتا ہے۔ ایسے لوگ شعر کی فنی عظمت اور اس کے ادبی وقار سے ناواقف ہوتے ہیں، جن کی شمولیت کی وجہ سے عموماً اچھے پڑھنے والوں کو ان کے ذوق کی سیرابی کیلئے اوچھے اور برہنہ قسم کے بازاری اشعار بھی سنانا پڑتے ہیں ایسے بہت سے شعرا کی مثالیں سامنے ہیں جن کی فنی استطاعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب وہ مشاعروں میں اس قسم کے اشعار پڑھتے ہیں:

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا
مردانگی کی اس کے بڑا زور تھا مگر
آئی شب وصال تو مردار ہوگیا

تو لکھنؤ کے ان قدیم درباری مشاعروں کا نقشہ ذہن میں ابھر آتا ہے، جہاں درباری سامعین کے سامنے ان کے ذہنی معیار اور سطح کے تحت اکثر باشعور اور باصلاحیت شعرا بھی اپنا ادبی شعری اور فنی وقار کھو بیٹھے تھے اور جن کی ہرزہ سرائی پر میر نے جھنجھلا کر چوما چاٹی کا شاعر کہہ دیا تھا آج بھی ایسے شاعروں کا قحط نہیں ہے جو عوامی مشاعروں میں دل سے نکلی ہوئی بات کو دل میں اتار دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ایسے شاعروں میں راحت اندوری کا شمار کیا جا سکتا ہے، جو عہد حاضر کی عصبیت نابرابری، لوٹ کھسوٹ نیتاؤں کی کسی طرح سے دھن اور جٹ کرنے کے منصوبہ بند معاملوں کے خلاف نکل کر ببانگ دہل سچ بات کہہ گزرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتے۔ راحت کے ذہن وشعور میں انسان کشی کے خلاف آواز بلند کرنے کی بے پناہ تڑپ ہے اور اقتدار کے نشے میں ڈوب کر حق تلفی کرنے والوں کے خلاف جذبہ بغاوت ہے ان کے خلاف شعلہ افشانی کا حوصلہ ہے جس کا وہ کھل کر اظہار کرنے میں نہیں چوکتے۔ اسی لئے بڑی بلند آہنگی سے اپنا کلام سنانے اور موجود تمام سامعین کو دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔ وہ ایک انسان دوست کی طرح اپنی آواز کو مشاعروں کے وسیلے سے پھیلا کر ناسمجھوں کو ہوش اور حوصلہ دیتے ہیں۔

راحت اندوری نے ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر کے مشاعروں پر حکومت کی ہے۔ بعض لوگوں نے ان کے سر یہ الزام عائد کر رکھا ہے کہ وہ عوام کیلئے تفریحی چیزیں لاتے ہیں ان کے اس احساس میں بلا شبہ ان حضرات کا جذبہ تعصب کارفرما ہے۔ راحت اور مشاعروں کے تعلق سے شکیل گوالیاری اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''مشاعرہ میں شاعر کا تعلق عوام سے براہ راست ہوتا ہے۔ عموماً ایسے مضامین بیان کئے جاتے ہیں، جن سے دلچسپی عام ہو۔ شعر کی ادائیگی کو پرکشش بنانے کیلئے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر کا کام شعر کہہ کر ختم نہیں ہو جاتا شعر کی ترسیل کے آخری مرحلے تک اسے چوکنا رہنا پڑتا ہے، بین جانسن نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے:

"A poet has two hands as a drama has one for making the other repeating"

عہد موجود میں شعر کی زبانی خواندگی اور تحریری پیش کش میں فرق کیا جانے لگا ہے، جو بھی تخلیق تحریر میں آ کر طباعت کے مراحل سے گزر جاتی ہے اسے تو آنکھ بند کر کے ادب مان لیا جاتا ہے اور وہ زبانی خواندگی تک محدود رہ جاتی ہے خواہ اس کا حلقہ اثر کتنا وسیع کیوں نہ ہو اسے محض تفریح اور دل بہلاوا سمجھ لیا جاتا ہے .... میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری میں پیش کی جانے والی ہر تخلیق ادبی معیار پر پوری اترتی ہے اسی لئے کہ بیشتر تخلیقات میں تخلیقیت افسانویت اور خود اظہاریت کا فقدان ہوتا ہے تخیل کی کارفرمائی جو عوامی سچ کو شاعرانہ سچ میں تبدیل کر کے لافانی اور ناقابل تردید بنا دیتی ہے نام کو نہیں ہوتی۔ لیکن شاعری کے تمام عناصر ولوازمات ان تخلیقات میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں، جو آئے دن تھوک میں چھپا کرتی ہیں۔ راحت اندوری نے اپنی مشاعرہ گردی کا جواز اپنے ایک شعر میں پیش کر کے معترض کا منہ بند کر دیا ہے۔

کام جو کر نہ سکیں تحریر میں

مجھ سے کہئے تو زبانی کردوں (۱)

راحت اندوری کے مطبوعہ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں یہی ان کا انداز زبانی پن اکثر جگہ موجود ہے لیکن راقم کے خیال سے اس زبان میں شعری لوازمات سے چشم پوشی یا صرف نظر کرنے کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ خاص طور سے ان کا یہ شعر دیکھئے:

وہ مجھ سے کہہ کے گیا ہے کہ لوٹ آؤں گا

میرے عظیم خدا اعتبار دے مجھ کو

راحت کی مقبولیت ان کی آواز اور مشاعروں میں ان کی انوکھی پیش کش کی رہین منت ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کے بحر بیکراں یا ریگ زاروں میں اس قدر احتیاط اور حوصلے سے جم کر قدم رکھے ہیں کہ پھر کسی طرح کی ہوائے تند و تیز میں وہ بغیر ڈگمگائے گزر گئے۔ انہوں نے دو مصرعے جوڑ کر قلم کی آبرو کو وقار بخشا، الفاظ کی سادگی اور عظیم قسم کی معنویت کی تہہ داری اور گہرائی ان کا شیوہ ہے۔ راحت اپنے انفرادی طرز فکر اور مسحور کن انداز میں سنانے کے سبب اسٹیج مشاعرہ پر اکیلے دکھائی دینے کا ہنر رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کو سننے کیلئے ان کے مشاعروں میں دور دور سے کھنچ کر چلے آتے ہیں نہ موسموں کے مزاج کی برہمی مانع ہوتی ہے اور نہ تکان راہ۔ یہ ان کی خود کی کمائی کا فیضان کہا جاسکتا ہے بہت دن پہلے ایک مشاعرے کی نظامت کرتے ہوئے منور رانا نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ:

''صاحبو تاش میں چار بادشاہ ہوا کرتے ہیں لیکن مشاعرے کی ملکیت کا صرف ایک بادشاہ ہے اور وہ ہے راحت اندوری مشاعروں کا بے تاج بادشاہ''

بلاشبہ ایک مانے ہوئے شاعر کا یہ جملہ ایک زبردست خراج عقیدت ہے، احمد کلیم فیض پوری راحت کی شعرگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) علمہ البیان۔ شکیل گوالیاری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۱۹۷

''راحت کی شاعری بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے آج اس کی شاعری میں غالب کا رچاؤ بھی ہے، میر کی حلاوت اور اقبال کی عالمگیریت بھی۔ عصر حاضر نے جو گھاؤ دئے ہیں اس کی ٹیس راحت کی شاعری میں تحلیل ہو چکی ہے، جس زہرنا کی کی وہ تاب نہ لا سکا ہے اس کا قطرہ قطرہ اپنے شعروں میں انڈیل دیا ہے پھر کسی پہاڑ کی بلندی سے انہیں تو وادیوں اور ڈھلانوں میں بکھیر دیا ہے کہ شاعری کی آنچ میں تپ کر اس کی زہرنا کی نے اپنی خاصیت بدل لی ہے۔''(۱)

اسی ضمن میں عقیل نعمانی لکھتے ہیں:

''راحت کی مشاعرے میں آمد نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف ترنم بازوں کے ایوانوں کو زمیں بوس کیا بلکہ تحت پڑھنے والے بہت سے شعرا کو اعتماد کی دولت سے مالا مال بھی کیا۔ راحت کے انداز کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کے ڈپلی کیٹ بھی تیار ہونے لگے اور اب تو بقول شخصے:

''ہر شہر میں آدھا درجن راحت اندوری مل جائیں گے اس صورت حال کے باوجود راحت بھیڑ میں پہچانی جانے والی ایک منفرد آواز کا نام ہے۔ راحت کی نقل جاری ہے تقلید بھی اور تنقید بھی۔ مگر انہوں نے ایک بار اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو ''ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا'' کے مصداق گرم سفر رہنے کو اپنا نصب العین بنایا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آج وہ مملکت شعر وادب میں اسی منصب پر فائز ہیں جہاں شاعر کو یہ اعلان کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے ''ہم سے پوچھ کہ غزل کتنا لہو مانگتی ہے'' انہوں نے بہت سے نامانوس الفاظ کو اپنے اشعار کا زیور پہنایا کہ شعری فضا پر کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے بلکہ شائقین ایک نئے شعری ذائقے سے لطف اندوز ہوئے۔''(۲)

ان تمام خصوصیات کے باوصف تعجب خیز بلکہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اکثر نقاد حضرات صرف

---

(۱) مضمون .... کوئی صحرا چھپا ہے۔ از احمد کلیم فیض پوری مشمولہ لمحے لمحے بدایوں ص ۳۳۶

(۲) بے جگہ شعلہ بیانی مصنفہ عقیل نعمانی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۳۸

اس وجہ سے راحت کی شاعری کو نظر انداز کرتے ہیں کہ ان کی کامیابی کا راستہ مشاعروں سے ہوکر گزرتا ہے خواہ انہوں نے کتنی ہی اچھی اور معیاری شاعری کیوں نہ کی ہو، ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ سیکڑوں مضامین نقد چھپوانے اور سیمیناروں میں داد بٹورنے کے باوجود وہ اس منزل کو نہ چھو سکے ہوں جس پر راحت فائز ہیں۔ راقم کے اس خیال کو عقیل نعمانی کے اس تجزیے سے تقویت پہونچتی ہے کہ:

''راحت اندوری ایک کامیاب غزل گو، نغمہ نگار اور ہر قسم کی بناوٹ اور تصنع سے پاک انسان بھی ہیں، جہاں انہوں نے اپنی شاعری میں:

''یہ شعر وہ ہیں جو سرکس میں کام آتے ہیں''

قسم کے موضوعات کا ذکر کر کے مشاعروں میں ہنگامے برپا کر دیتے ہیں۔ وہیں:

''شاخ سحر پہ مہکے پھول اذانوں کے''

یا

''دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی''

جیسے معیاری کلام سے ادب کے ان ٹھیکیداروں کی بولتی بند کی جو انہیں صرف مشاعروں کا کامیاب شاعر ٹھہرانے پر تلے ہوئے ہیں''(۱)

یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ مشاعروں میں غزل گو شعرا تو کم ہی نظر آتے ہیں ہاں غزل گانے والے زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں راحت اسی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ نہایت بے باک لہجے میں مشاعروں کی ہیئت گدائی نہایت لطیف انداز میں یوں طنز کرتے ہیں:

ادب کہاں کا کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعروں میں تماشے مداریوں والے
مجھ سے دل کا حال کوئی کب پوچھتا ہے
غزلوں کی فرمائش ہوتی رہتی ہے

---

(۱) بے جگر شعلہ بیان از عقیل نعمانی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۳۴۰

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

شدت احساس کی دین یہ دل میں چبھ جانے والا طنز جس میں نہ لفاظی ہے کہ کرتب بازی بلکہ عام زبان میں مہذب قسم کی زہرناکی اور نشتریت ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''راحت اندوری مشاعروں کا مشہور شاعر ہے اس لئے اس پر اکثر برا وقت پڑتا ہے۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ وہ ناظموں کے جملوں، چٹکلوں اور لطیفوں کا اثر قبول نہیں کرتا اور نہ سامعین کے وقتی طور پر بگڑے ہوئے سطحی موڈ کو خاطر میں لاتا ہے۔ مشاعرے کے رومانی ماحول اور لذتیت کے مارے ہوئے ذہنوں سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ اسٹیج پر اپنے مقام سے کلام کرتا ہے۔ وہ اپنے غیر رومانی اشعار سے مشاعرے کی رومانی فضا کو بدل دیتا ہے اور سننے والوں کو خواب آور ماحول سے نکال کر زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے۔ مجھے راحت کی یہ خود اعتمادی اور سماجی ذمہ داری کا انداز پسند آتا ہے، مجھے کہنے دیجئے کہ مشاعروں میں غیر رومانی جدید غزل کو مقبول بنانے میں راحت اندوری بھی شامل ہیں۔'' (۱)

ادب سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے سماج کی سچی تصویر پیش کرنے میں موضوع سب سے اہم رول ادا کرتا ہے راحت کے یہ اشعار دیکھئے ان میں حالات حاضرہ کا عکس اور سماج کے نئے تقاضوں سے بھرپور نئے اسلوب سے مالا مال کیفیت موجود ہے۔

سب کے دکھ سکھ اس کے چہرے پر لکھے پائے گئے
آدمی کیا تھا ہمارے شہر کا اخبار تھا

تو کہاں گم ہے ترے ریشمی آنچل کی قسم
آنسو اب آنکھ میں کنکر کی طرح لگتا ہے

اخبار کنکر غزل کے الفاظ نہ ہونے کے باوجود راحت نے اس سلیقے سے انہیں باندھا ہے کہ بار

(۱) نئی غزل کا قلندر، پروفیسر عنوان چشتی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۱۰۳

سماعت نہیں ہوتے۔ اسی قبیل کا ایک اور دل میں گھر کرنے والا اچھا شعر ملاحظہ کیجئے:

حالانکہ دوستوں سے بہت کم ملے ہیں ہم
لیکن کبھی نقاب لگا کر نہیں ملے

کیا یہ آج کے دور کی سچائی نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے چہرہ بدل کر ہی ملاقات کا خوگر ہے۔ حقیقت میں یہ اللہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے جس سے کسب فیض کر کے ہی ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں۔ سورہ بقر آیت ۲۱/ارشاد باری تعالیٰ ہے ''جب یہ لوگ مومنین کی محفل میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں لیکن جب اپنے زمرہ شیاطین میں پہنچتے ہیں تو ان کا روپ بدل جاتا ہے کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم ان سے استہزا کر رہے تھے'' یہ سچائی آج زندہ جاوید ہے جدھر دیکھو جس رشتے کو بھی ٹٹولو یہی چہرہ نظر آئے گا اسی سلسلے میں راحت کا یہ کرب بھی ملاحظہ کیجئے:

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

مشاعرے کے تعلق سے عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ انور جلال پوری کانپور کے مرچنٹس چیمبر ہال کے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں ان کی ملاقات راحت اندوری سے ہوئی تھی انور جلال پوری کی راحت سے دوبدو یہ پہلی ملاقات تھی۔

''ابھی تک راحت کی تعریفوں سے کان آشنا تھے، ملاقات کے وقت اس کی بے ترتیب مگر پرمغز گفتگو سنی تھی لیکن اس کی شاعری کے تیور سے ناواقف تھا۔ اس کے لہجہ کی شدت اور صلاحیت کا اندازہ نہیں تھا، اس کے ایک ایک مصرعے میں فرہاد کے تیشے کی تیزی ہے اس حقیقت سے میں بالکل بے خبر تھا نہیں معلوم تھا کہ اس کی دست نگاہ میں سارا دشت امکان بس مسافت یک قدم ہے.......... میں نے صرف پانچ چھ شاعروں کے بعد راحت کو دعوت سخن دے دی.......... راحت مائیک پر کھڑے ہوئے نہ جانے کیوں اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف کے اوپر باندھے ہوئے تھے سامعین میں سے کسی منچلے نے آواز لگائی

ہاتھ کھولو.........راحت نے بڑی برجستگی سے ہاتھ کھولتے ہوئے جواب دیا ''جی شکریہ! آپ جو جو کہیے میں کھولتا جاؤں'' راحت کے اس برجستہ جملے نے ایک لمحے میں اس منچلے کی فتح کو شکست میں تبدیل کردیا۔ سامعین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہے میں تو شعرائے کرام بھی شریک ہوئے راحت کی ذہانت کی یہ پہلی چھاپ تھی جو ہم لوگوں کے ذہنوں پر پڑی راحت نے شعر سنانا شروع کئے:

ترے نام پر میں نے ہر آفت سر پر رکھی تھی
نظر شعلوں پر رکھی تھی زباں پتھر پہ رکھی تھی
انہی سانسوں کے چکر نے ہمیں وہ دن دکھائے تھے
ہمارے پاؤں کی مٹی ہمارے سر پہ رکھی تھی
سحر تک تو جو آجاتے تو منظر دیکھ سکتے تھے
دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد، اس طرح کے توصیفی کلمات نے مرچنٹس ہال کی چھت کو سر پر اٹھالیا تھا، چند منٹ کی اشعار نوازی نے راحت کو مشاعرے کا ہیرو بنادیا۔ راحت کے انداز اور اس کی شاعری نے لوگوں کو چونکا دیا تھا اس میں آگے بڑھنے ترقی کرنے اپنی پہچان بنانے اور اپنا نقش قائم کرنے کی صلاحیت تھی خاص بات یہ کہ یہ صلاحیت اب تک قائم ہے اس کے تخلیقی ذہن میں اب تک تھکن نہیں پیدا ہوئی غزل کے مضامین اور موضوعات اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔'' (۱)

راحت کے مزاج میں ایک خاص قسم کی خوداعتمادی ہے وہ جب سامعین مشاعرہ سے کہتے ہیں کہ مجھے غور سے سنئے میرا بھروسہ نہیں کہ میں کب اچھا شعر سنادوں بات یہ مزاحاً ضرور ہوتی ہے مگر ہر ایک اسے ان کی ایک ادا سمجھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کا یہ انداز سنجیدگی سے معمور ہوتا ہے۔ مشاعرے میں سامعین شائقین اور ناظرین پر مشتمل جو بھیڑ ہوتی ہے اس میں باذوق حضرات

---

(۱) تعارف سے تعلق تک۔ مضمون انور جلال پوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۲۹۲

کی تعداد کم ہی سہی اگر ان کی مدارات کا لحاظ شاعر نہ برقرار رکھ سکا تو یہ اس کی بے خبری ہوگی ورنہ وہ ایسے اشعار سنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

بہت سے لوگ کہ جو حرف آشنا بھی نہیں
اسی میں خوش ہیں کہ تیری کتاب رکھتے ہیں

ترا بھلا ہو مسافر کو لوٹنے والے
میں تجھ کو خضر علیہ السلام سمجھا تھا

راحت کی دھڑکن جب تک جاری رہتی ہے
سوتے نہیں ہم ذمہ داری رہتی ہے

اسی خود اعتمادی نے راحت کو دنیائے اردو کی شاعری کے مشاعروں کے ڈائس سے ڈاکٹر اندوری کی منزل تک کا سفر طے کرتے دیکھا ہے۔ ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ غرض کہ جہاں اردو مشاعروں کی محفلیں سجتی ہیں ہندوستان کا یہ نمائندہ شاعر سوال کرتا نظر آتا ہے۔

گلاب خواب دوا زہر جام کیا کیا ہے
میں آگیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے

اور اسی وجہ سے ان کی یہ شاعرانہ تعلّی دل میں جگہ کر لیتی ہے۔

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

راحت کی غزل تصنع اور بناوٹ کے الزام سے پاک ہے وہ چاہے سیاسی رنگ محل ہو یا غریب کا آنگن جہاں جو بھی دکھائی دیتا ہے وہ ویسے ہی اپنے لفظوں سے ایک تصویر بنا دیتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا انوکھا پن ہے جو صرف مداحوں کو نہیں نقادوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ زندگی سے قریب تر ہونے کی وجہ سے ہی ان کے اشعار کا اثر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تجھے کیا درد کی لذت بتائیں
مسیحا آ کبھی بیمار ہوجا
مگر اندر کوئی صحرا چھپا ہے
بظاہر ہم سمند لگ رہے ہیں

راحت کی غزلوں میں کرب اور بے چینیوں کی الگ ہی شناخت ہے۔

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

نقادوں کی سطحی تنقید اور اچھے اشعار کا بخیہ ادھیڑنے والے بلکہ فن کے ساتھ کار قصابی کا انجام دینے والوں کی طرف راحت اشارہ کرتے ہوئے ان کی بے بضاعتی کا یوں پردہ فاش کرتے ہیں۔

''ایک مشہور تنقید نگار نے ایک نئے شاعر پر مضمون تحریر کیا اور جن اشعار کا حوالہ دیکر شاعر کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش کی ان میں کئی اشعار خاکسار کے تھے۔ جو ان کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے کسی دوسرے شاعر کے کھاتے میں چلے گئے ایک بات اور کہنا چاہوں گا صرف اس وجہ سے کہ میں رسائل میں چھپنے چھپانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا صرف مشاعرہ ہی میرے اشعار کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کئی بزرگان نقد ونظر تو مشاعرے کو ہی قبول نہیں کرتے افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ میں جب مشاعرے میں پڑھتا ہوں۔

بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یاتراؤں سے کچھ نہیں ہوگا

تو میری شاعری متعصب اور تنگ نظر ہوجاتی ہے اسی شعر کا چربہ اتار کریا اس سے متاثر ہوکر ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''تمہاری رتھ پر تو مریادہ پرشوتم کا پرچم تھا تو ادب بن جاتا ہے میں نے ایک غزل میں موجودہ

تجھے کیا درد کی لذت بتائیں
مسیحا آ کبھی بیمار ہوجا
مگر اندر کوئی صحرا چھپا ہے
بظاہر ہم سمند لگ رہے ہیں

راحت کی غزلوں میں کرب اور بے چینیوں کی الگ ہی شناخت ہے۔

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

نقادوں کی سطحی تنقید اور اچھے اشعار کا بخیہ ادھیڑنے والے بلکہ فن کے ساتھ کار قصابی کا انجام دینے والوں کی طرف راحت اشارہ کرتے ہوئے ان کی بے بضاعتی کا یوں پردہ فاش کرتے ہیں۔

''ایک مشہور تنقید نگار نے ایک نئے شاعر پر مضمون تحریر کیا اور جن اشعار کا حوالہ دیکر شاعر کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش کی ان میں کئی اشعار خاکسار کے تھے۔ جو ان کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے کسی دوسرے شاعر کے کھاتے میں چلے گئے ایک بات اور کہنا چاہوں گا صرف اس وجہ سے کہ میں رسائل میں چھپنے چھپانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا صرف مشاعرہ ہی میرے اشعار کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کئی بزرگان نقد و نظر تو مشاعرے کو ہی قبول نہیں کرتے افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ میں جب مشاعرے میں پڑھتا ہوں۔

بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یاتراؤں سے کچھ نہیں ہوگا

تو میری شاعری متعصب اور تنگ نظر ہوجاتی ہے اسی شعر کا چربہ اتار کر یا اس سے متاثر ہوکر ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''تمہاری رتھ پر تو مریادہ پرشوتم کا پرچم تھا تو ادب بن جاتا ہے میں نے ایک غزل میں موجودہ

ہے دھواں چاروں طرف بینائی لیکر کیا کروں
صرف آنکھیں ہی نہیں منظر بھی ہونا چاہئے
ہم بھی اب جھوٹ کی پیشانی کو بوسہ دیں گے
تم بھی سچ بولنے کو سزا دیتے تھے
زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پہ نکلنا ہوگا
گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا
ہم دیا رکھ کے چلے آتے دیکھیں کیا ہو
اس دریچے پہ تو پہلے سے ہوا رکھی تھی
پھول جیسی مخملیں تلووں میں چھالے کردیئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کردئے

مشاعروں سے وابستہ شاعروں کی فہرست میں ایسے چند انے گنے نام ہی نظر آئیں گے، جو ادبی معیار کی میزان پر کھرے اترتے ہیں۔ ان میں ایک نام راحت اندوری کا ہے۔ مثال کے طور پر راحت کی شاعری سے چند اشعار جو زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور نہ صرف زندگی کو روداد یا زندگی کے معنیٰ متعین کرتے ہیں بلکہ ہمارے احساسات و جذبات کی پوری مفاہمت کے ساتھ ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈھنے میں زندگی برباد کی
اپنے ہونے کا ہم اس طرح پتہ دیتے تھے
خاک مٹھی میں اٹھاتے تھے اڑادیتے تھے

ہوم منسٹر لال کرشن اڈوانی کو نشانہ بنایا ہے:

اس کونے سے اس کونے تک دعویداری سائیں کی
آسانی سے ٹھیک نہ ہوگی یہ بیماری سائیں کی
کھیت لہو سے ہم نے سینچا اور فصلوں پہ حق اس کا
روزہ رکھنے والے ہم ہیں اور افطاری سائیں کی

یہ غزل الہ آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی وہاں علی سردار جعفری تشریف رکھتے تھے انہوں نے مجھ سے یہ غزل لکھوالی اور اس کے بعد جب بھی مشاعروں میں گیا تو فرمائش کر کے یہ غزل سنی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں میری اس غزل کا حوالہ دیا اور میرے انداز کو سراہا۔'' (۱)

زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی راحت اندوری کا شعار ہے وہ اپنے محسوسات کھل کر بیان کرنے میں کبھی تذبذب کا شکار نہیں ہوتے'' ہوتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' اہل نظر کیلئے یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ راحت کے اشعار کہ تہہ میں فنی اور فکری بصیرت کی جوزیریں لہر ہولے ہولے بہہ رہی ہے وہ تپتے میدانوں میں نسیم سحر کے خوشگوار جھونکوں کا لطف دیتی ہے۔ راحت شعر گوئی اور شعر سنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ سہل اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں ادق مضامین اور اضافتوں سے گریز کرتے ہیں۔ جرأت اور بے باکی ان کی فطرت ہے۔ پاکستان میں مہاجرین کے جذبات کا ترجمان راحت کا یہ شعر بن چکا ہے۔ خندہ پیشانی اور انکساری ان کا خاصہ ہے غرور اور تمکنت کا شائبہ نہیں وہ شعر یہ ہے۔

اب کے جو فیصلہ ہوگا یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

راحت کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اسے چوری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کے

---

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۴۳

انداز کے شعر کہنا ہر کس و نا کس کے بس بات نہیں ہے۔ راحت نے اپنی شاعری کو عہد حاضر کی تاریخی دستاویز بنا دیا ہے یہ آئندہ بھی اسی طرح ضوفشاں رہے گی جیسے آج ہے۔ ایسی ہی سچی شاعری ہمیشہ اپنے خالق کے نام کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔

باب چہارم

دیگر اصناف پر طبع آزمائی

اور

شاعری کے موضوعات

ایک یادگار ملاقات میں

راحت اندوری، گیت کار مجروح سلطانپوری

راحت اندوری اپنا کلام سناتے ہوئے۔ تصویر میں کیفی اعظمی بھی نظر آ رہے ہیں

تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر
فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

راحت اندوری نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی اور رفتہ رفتہ غزل ان کے مزاج ذوق اور فکر سے اتنی ہم آہنگ ہوگئی کہ انہوں نے کسی دوسری صنف سخن کی طرف نظر ہی نہیں گھمائی اوراس میدان میں ایسی منفرد راہ اپنے لئے استوار کی کہ ابھی تک نہ ان کے انوکھے طرز تک کسی کی رسائی ہوسکی اور نہ ان کے سلیقہ اظہار کی تقلید ہی ممکن ہوسکی جہاں تک ان کی انوکھی فکر اور تخیل کا تعلق ہے اس میں وہ گہرائی اور گیرائی ہے کہ از دل افتد ہر دل ریزد کا معاملہ سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے صرف غزل میں اپنے فن کے جواہر جگمگائے اور اپنی غزل کو وقت کی ضرورت زمانے کی آواز اوراحساسات کے شکست وریخت کی واردات بنادیا۔ اسی طرح وہ بس Jake of all trades نہ رہ کر یہ کمی بھی اپنے دامن میں بٹور سکے But master of none اب ان کے بارے میں بیانگ دہل راقم کہہ سکنے کی ہمت کرتا ہے کہ جیک آف آل ٹریڈس ہوں نہ ہوں لیکن ماسٹر آف غزل ضرور ہیں یہی ان کی عظمت ہے۔

راحت نے شاگردی استادی کی دنیا خدا معلوم کن وجوہات کی بنا پر ترک کی اور فلمی دنیا کی سیر کو نکل پڑے حالانکہ انہوں نے شہرت اور ناموری جو فلم سے باہر رہ کر حاصل کر لی وہ ہر ایک کے حصے میں

نہیں آتی۔ راحت نے اس دنیا میں پہنچ کر فلمی گانے یا گیت ضرور لکھے جو باکس آفس ہٹ بھی ہوئے اور عوام کے دلوں کو گرما بھی گئے لیکن راحت کا پیرایہ بیان یا اسلوب ادب سے ہٹ کر فلمی رنگینیوں میں گم نہیں ہوسکا یہاں بھی راحت کی آوازااوران کی شاعری کا زیروبم غزل سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اس لحاظ سے ہم ان گانوں یا گیتوں کو غزل ہی کہہ سکتے ہیں کسی دوسری صنف سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

راحت کے کلام کا بھرپور مطالعہ کرنے کے سلسلے میں راقم کو ان کی ایک حمد ونظم نما غزل کے پیرائے میں نظر آتی ہے ورنہ راحت اندوری غزل کے ہی شاعر ہیں، حمد کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

کیا تونے نہیں دیکھا دریا کی روانی میں
بہتے ہوئے پانی میں تیور بھی تو اس کا ہے
تو نوح کا بیٹا کچھ بس میں نہیں تیرے
کشتی بھی تو اس کی ہے لنگر بھی تو اس کا ہے
سورج کے نکلنے سے تاروں کے بکھرنے تک
موجوں کے تھپیڑوں سے طوفاں کے ٹھہرنے تک
غنچوں کے مہکنے سے کلیوں کے چٹکنے تک
کیا تو نے نہیں دیکھا پیکر بھی تو اس کا ہے
عظمت سے حقیقت سے منہ موڑنا چاہا تھا
کچھ ہاتھیوں والوں نے گھر توڑنا چاہا تھا
کیا تونے نہیں دیکھا کمزور پرندوں نے
کس طرح حفاظت کی وہ گھر بھی تو اس کا ہے
کیا تونے نہیں دیکھا کیا دیکھ لیا تونے
اس کے ہی اشارے پر یہ سارے تماشے ہیں

وہ دھوپ کا مالک ہے وہ چھاؤں کا خالق ہے

آنکھیں بھی اس کی ہیں منظر بھی تو اس کا ہے

کیا تو نے نہیں دیکھا وہ خاک کے ذروں سے

سورج بھی بناتا ہے تارے بھی بناتا ہے

میں کیا ہوں مرا کیا ہے مٹی ہی سمجھ مجھ کو

پتھر ہی سہی لیکن پتھر بھی تو اس کا ہے

یہ پوری غزل نما حمد وحدت الوجود کی معرفت اس کی وحدانیت اس کی ہر شے پر قدرت، ہر سانس کی آمدورفت، پھولوں کے چٹکنے مہکنے اور پھول بننے تک ساری کارفرمائیاں اس لم یزل ولایزال طاقت کی ہیں، جو بظاہر نظر سے اوجھل ہے لیکن ان سارے مناظر آسمان کہکشاں چاند تاروں کی چمک سورج کا طلوع وغروب، نوح کا طوفان بلاخیز میں ایک ادنیٰ سی کشتی کی کیا بساط بس اور صرف اس کی طاقت اور قدرت ہی تو ہے کہ سب کو پار لگاتی ہے۔ ان تمام مناظر میں اس واحد وقدوس کا دیدار صرف اور صرف دیدۂ بینا رکھنے والوں کو ہوسکتا ہے شرط ہے ہوس دنیا ہم کو دیکھ سکنے کی مہلت دے اسی طرح کا خیال نہایت مختصر طور پر اقبال نے بھی ظاہر کیا تھا اور برگ سبز کے حوالے سے ہم تک پہنچایا تھا، ملاحظہ کیجئے:

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

مگر ہم غور وفکر کرنے کی طرف مائل تو ہوں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے انہوں نے بھی چہرے کی نظر ونگاہ کو بھی اہل نظر کے ساتھ مختص کر کے پیش کیا ہے۔ صرف دیدہ بینا اور نگاہ بصیرت آموز سے کام لیکر ہی کی اس مالک حقیقی جو گھٹ گھٹ میں رام کی طرح موجود ہے کا دیدار میسر ہوسکتا ہے جوش کا شعر ہے:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کیلئے

اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

راحت کی حمد پورے طور سے معرفت الٰہی کا سرچشمہ اوران کے اعتراف حق کا ثبوت فراہم کرتی ہے اگر ہم بھی انہیں نگاہوں سے کام لیں تو قرب الٰہی کی توفیق بھی وہ ہمیں غیب سے عطا کر دے گا۔ ایک موقع پر راحت اندوری نے لال کرشن ایڈوانی کو مخاطب کرنے اور للکارتے ہوئے ان چار مصرعوں کو دہرایا تھا، جن کو ہم ان کا محررہ قطعہ کہہ سکتے ہیں لیکن راحت نے خود اسے اپنی غزل کے اشعار کہا ہے۔ ورنہ ان مصرعوں کو ایک قطعہ کہہ سکنے میں راقم کے نزدیک چنداں قباحت نہیں ہے، ملاحظہ کیجئے:

اس کونے سے اس کونے تک دعویداری سائیں کی (۱)

آسانی سے ٹھیک نہ ہوگی یہ بیماری سائیں کی

کھیت لہو سے ہم نے سینچا اور فصلوں پر حق اس کا

روزہ رکھنے والے ہم ہیں اور افطاری سائیں کی

حقیقت یہ ہے کہ راحت نے غزل کو اپنایا اور اس پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو مختلف پیرائے بیان یا صنف سخن میں سبھی شعرا بیان کرتے ہیں۔ راحت نے معشوقہ غزل کو گلے لگایا اور اسی کے ہوکر رہ گئے پھر اس سے نظر گھما کے ان کو دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور غزل کی تعریف ان کے نزدیک یہ ہے:

''اب غزل زندگی اور حالات سے گفتگو کرنے کا نام ہے اگر زندگی عورت ہے اور حالات بھی عورت کے اردگرد کے ہوں تو بھی غزل کی تعریف میرے نزدیک یہی ہے۔ فارسی کی قدیم تاریخ کو موجودہ غزل پر تھوپنا ناانصافی ہے۔ اس دور میں جو غزل لکھی جارہی ہے اور ہندو پاک کے تمام بزرگان نقد و نظر جسے غزل مان رہے ہیں ان میں زیادہ تر شاعری ایسی ہے جس نے عورت کی خوشبو سے بھی گریز کیا

---

(۱) سائیں سندھیوں کو کہا جاتا ہے۔

ہے۔ میں جو شاعری کرتا ہوں اس سے میں مطمئن ہوں اور میرے سامعین بھی جن کیلئے میں شاعری کرتا ہوں میری غزل یا تو میرے لئے ہوتی ہے یا میرے سامعین کیلئے۔ قارئین (سکہ بند رسالوں والے) سے میرا رشتہ کچھ خاص گہرا نہیں ہو پایا جس کا مجھے افسوس نہیں'' (۱)

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۵۳

باب پنجم

راحت اندوری کی مجموعی علمی
اورادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ
اورقدر و قیمت کا تعین

راحت اپنی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں بھوپال کے مشاعرے میں
سپاسنامہ حاصل کرتے ہوئے ،۸؍نومبر ۱۹۹۹ء

جناب ارجن سنگھ وزیر برائے انسانی وسائل وترقیات ،راحت اندوری،
عارف عقیل صاحب ایم ایل اے اور مسلم کمیٹی کے صدر جناب خرم صاحب

اتر پردیش کے گورنر جناب وشنو کانت شاستری کے ساتھ

راحت اندوری، محترمہ شیما رضوی، سابق وزیر اور دیگر شعراء

راحت اندروی نے اندور کی اس فضا میں آنکھیں کھولیں، جہاں کلاسیکی غزل کی مقبولیت کی وجہ کسی دوسرے آہنگ سے شاعروں سے گوش آشنا نہ تھے اور نہ نظریں شناسا۔ ایسے ماحول میں راحت تنہا تنہا سے تھے یہ ان کیلئے آسان تھا کہ وہ اپنا مزاج بھی اہل اندور کے مزاج میں ڈھال کر ان کے صف بہ صف کھڑے ہو جاتے۔ انہوں نے اپنے ماحول اور عہد کو بخوبی پرکھا تولا اور خوب اندازہ کرلیا کہ ان کا مزاج اور فطرت انہیں اس سانچے میں ڈھال نہ سکے گی اسلئے کہ ان کے یہاں ایسا بیدار اور شعوری جذبہ موجود تھا جو اندور کی فضا میں اجنبی ضرور تھا لیکن اپنی طرف متوجہ کر سکنے کا ہنر بھی رکھتا تھا۔

راحت نے ابتدا ہی سے اپنے عہد کے تقاضوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور پرکھا اور اپنی خود راہ استوار کر کے اپنے ہم عصروں سے سبقت لے گئے۔ ان کی یہ تیز روی ایک ہدی خواں کی صورت میں ان کی راہ ہموار کرتی رہی اور ان کی آواز وقت کی آواز بن کر اندور کی شعری فضاؤں میں گونج اٹھی اور لوگ اس طرف متوجہ ہونے اور کھنچنے لگے اور جب راحت نے اندور کی فضا میں ایسے اشعار پیش کرنا شروع کئے:

ڈوبے ہوئے جہاز پر کیا تبصرہ کریں
یہ حادثہ تو سوچ کی گہرائی لے گیا

مگر ستاروں کی فصلیں اگا سکا نہ کوئی
مری زمین پر کتنے ہی آسمان رہے

پیڑ سب ننگے فقیروں کی طرح سہمے ہیں
کس سے امید یہ کی جائے کہ سایہ دے دے

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں
یہیں یہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

فرصتیں چاٹ رہی ہیں میری ہستی کا لہو
منتظر ہوں کہ مجھے کوئی بلانے آئے

جھوٹ کے نرک میں نہ ڈال مجھے
لوگ کہتے ہیں میں یدھشٹر ہوں

راحت کے یہ اشعار حقیقت میں لطیف اشارے ہیں جن میں اس عہد کی تصویریں منہ بولتی ہیں اور یہی اس دور کے ایک طبقہ خاص کا کرب بھی ہے یہ اشعار ان کے ابتدائی دور کے ضرور ہیں کہ لفظیات کا نیا پن، اظہار کی انفرادیت اور شدت اور ہم سے اشاروں اشاروں میں ہماری بات کہہ دینے کا ہنر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایسے اشعار سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ راحت نے اپنے منفرد انداز سے اپنے پیغام کے ذریعے اندور کی مقامی فضا کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس شعور و سلیقہ کے پس پشت ان کی گہری نگاہ اور دوررس ذہن تھا، جسے انہوں نے نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھا کر فکر و شعور کی وسعت دینے کی پوری دل جمعی سے کوشش کی۔ راحت کو اس فرسودہ مزاج کے رسیا اور وقت کے تقاضوں کا گہرا احساس تھا اور ساتھ ہی ان کا عزم و حوصلہ جس نے ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں ہونے دی اور اس طرح انہوں نے تشکیک کی راہوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنی منفرد فکری اور شعوری منزل تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ نتیجہ ہے ان کی اس حقیقت کا جسے انہوں نے ایک سچے فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ تر و تازہ اور بارآور رکھا ہے

جسے انہوں نے نجی مشاہدات تجربات ،فکر وشعور کی وسعتوں اور احساس کی روشنی میں شگفتہ دل ودماغ سے پرکھا اور دیکھا ہے وہ محض مطالعہ اور کتب بینی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ حالات کا بغائر جائزہ لیکر ان کا اظہار اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ ان کی آواز لاکھوں لوگوں کی دلوں کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ راحت احتجاج بھی کرتے ہیں تو اس میں محض نعرہ بازی کا حسن نہیں ہوتا بلکہ اس میں ان کے خلوص کی شدت کی کارفرمائی ہوتی ہے اس لئے ان کا لہجہ گھن گرج سے دامن بچائے ہوئے تراشیدہ سنگ کی وہ دیوی بن کر روپ دھار لیتا ہے جو لائق عبادت اور پیروی ہوتی ہے اور جسے حالات زمانہ کی تیشہ زنی زک نہیں پہنچا سکتی بلکہ ان کا احتجاج لہجہ حالات کے اندھیروں سے نکال کر روشنی دکھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے ویسے تو شاعری میں ناگواریوں کے خلاف احتجاج کرنے کی روایت بہت قدیم ہے اور اس احتجاج میں صرف وہی شعراء کامیاب ہوسکے جن کے طریقہ احتجاج میں جذبات کی شدت کے بجائے شدت فکر شامل ہو اور جو اپنے احتجاج کو وقتی ابال کی مانند نہ بہا کر اس میں استقلال اور ٹھہراؤ لانے کا ہنر رکھتے ہوں اور جب سے اپنی فکری جہتوں کے یقین میں بھول چوک یا بے اعتدالی نہ ہو۔ چند اشعار دیکھتے ہیں، جن میں راحت نے الفاظ کی ندرت اور شائستگی اور خلوص کے ساتھ آواز احتجاج بلند کی ہے:

معصوم پتیوں کا لہو پی کے سرخ ہے
یہ پھول اب چمن میں کوئی گل کھلائے گا

جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
ان چراغوں کو بجھا دو تو اجالے ہوں گے

پچھلے دنوں کی آندھی میں گنبد تو گر چکا
اللہ جانے سارے کبوتر کہاں گئے

کھڑکیاں بند نہ ہوتیں تو جھلس ہی جاتا
آگ ہوا سورج مرے گھر آیا تھا

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں

ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے

گر ہوا کے رخ کا اندازہ لگانا ہے تجھے

ریت پر کاغذ کی اک کشتی بنا کر چھوڑ دے

ان اشعار کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راحت کا احتجاجی رویہ محض جذبات کا کھوکھلا اظہار نہیں ہے کیونکہ انہوں نے حالات کی بے ترتیبی اور ناہمواری سے ابھرنے والے حالات پر جس سلیقہ سے ضرب لگا کر اور اس طرف متوجہ کیا ہے یہ انہیں کا حوصلہ ہے۔ ان اشعار میں نہ سپاہی کی کڑک ہے اور نہ مولوی کا خطیبانہ انداز بلکہ لطافت کے ساتھ انہوں نے اشاروں اشاروں میں ہم کو ہمارے حالات کا آئینہ دکھایا ہے اور ان کی لہجے میں ترشی اور تندی کی جگہ شیرینی اور دلکشی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی۔ راحت کا یہ لہجہ وقت کی سچائیوں کے ساتھ ساتھ زیادہ شگفتہ اور دلپذیر ہوتا گیا مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے ہیں جو شجر

یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے

قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن کی خوشبو

خار صحرا کہیں بھولے سے مہک مت جانا

ان سے پہلے کے جو قاتل بہت اچھے تھے

قتل سے پہلے وہ پانی تو پلادیتے تھے

پیاس اب کیسے بجھے گی ہم نے خود ہی بھول سے

میکدے کم ظرف لوگوں کے حوالے کردئے

مندرجہ بالا اشعار میں راحت نے اپنے احتجاج کو استعاراتی انداز اور دلکش لب ولہجہ میں بلند کیا ہے جسے ہم ان کے فنی شعور کی تازگی اور بالیدگی کا نام دے سکتے ہیں۔ راحت طنز کی تمام خوبیوں

اور ان کی زود اثری سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں ان کو اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہے کہ طنز میں ذرا سی لغزش اس کی عظمت کو مٹا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ بڑی احتیاط سے اپنی خداداد فکری تازگی سے اپنا کلام پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں جہاں بھی ایسے رنگ کی آمیزش ہوتی ہے وہ دلکش اور زود اثر ہو جاتا ہے۔ راحت کی طنزیہ ضربیں ان مسائل اور حالات پر زبردست پڑتی ہیں، جن پر قدما پہلے بے باک اظہار خیال کر چکے ہیں راحت نے بھی اسی طنز کو اپنے یہاں جگہ دی ہے مگر نہایت شگفتہ اور پسندیدہ اسلوب و انداز میں:

دلوں میں آگ لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
سب اپنے چہروں پر دوہری نقاب رکھتے ہیں

کہیں شریف نمازی کہیں فریبی پیر
قبیلہ میرا نسب میرا سلسلہ میرا

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

اپنی سانسیں بیچ کر میں نے جسے آباد کی
وہ گلی جنت تو اب بھی ہے مگر شداد کی

ٹوٹ کر بکھری ہوئی تلوار کے ٹکڑے سمیٹ
اور اپنے ہار جانے کا سبب معلوم کر

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

سب نے مل رکھا ہے چہروں پر تعصب کا غبار
آئینہ ہم بن بھی جائیں تو سنورتا کون ہے

داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی

یہی عقیق تھے شاہوں کے تاج کی زینت
جو انگلیوں میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

عدالتیں نہ سہی جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں میرا حل ضرور نکلے گا

نمازیوں کے تقدس پہ طنز کرتا تھا
وہ بدمعاش کئی دن سے اعتکاف میں ہے

میں ہر بتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہوگئے

شاعری آوارگی خوشبو وفا لذت شراب
مختلف شکلوں میں شہزادے کو عورت چاہئے

گھروں کی راکھ پھر دیکھیں پہلے دیکھنا یہ ہے
گھروں کو پھونک دینے کا اشارہ کون کرتا ہے

گاؤں کی بیٹی کی عزت تو بچالوں لیکن
مجھے مکھیا نہ کہیں گاؤں کے باہر کردے

گزشتہ سال کے زخم ہرے بھرے رکھنا
جلوس اب کے برس بھی یہیں سے نکلے گا

مسجد خالی خالی ہے ● بستی میں قوالی ہے

وہ پانچ وقت نظر آتا ہے نمازوں میں
مگر سنا ہے کہ شب میں جوا چلاتا ہے

راحت کی طنز ہواؤں میں گرہ نہیں لگاتی بلکہ ہمارے بیچ کی سچائیاں ایک خوبصورت پیرائے اظہار میں ڈھل کر ایسی مہ درآتشہ بن جاتی ہے کہ تلخ ہوکر بھی ہمیں بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور وہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر سرشاری کی کیفیت پیدا کردیتی ہے۔ راحت کے یہی بلیغ اشارات ان کے ضمیر کی یہ تڑپ آج کے سماجی مسائل کے حل کی شکل میں ناگزیر ہے۔ وہ کام جو مصلحان ملک وقوم، رہنمایان ملت کیلئے بعض وجوہ کی بنا پر مشکل نظر آتا ہے راحت نے احتجاجی لہجہ اور طنزیہ اسلوب میں اسے آسان بنادیا اور بنارہے ہیں راحت کا یہی وہ وصف ہے جس کی طرف ندا فاضلی یوں اشارہ کرتے ہیں:

''سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں انسان کے خارجی باطنی کشمکش کے عینی گواہ بھی ہیں ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو غزل کے اشاروں اور کنایوں میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعی مزاج طنزیہ اور باغیانہ ہے جو بیک وقت حالات کا شعری تبصرہ بھی ہے اور اس کا شخصی تجزیہ بھی۔ ان کی شعری زبان بھی ان کے افکار کی طرح ذہنی مسائل کی آئینہ دار ہے۔ مستعمل لفظیات سے گریز اور اظہار کے رائج معماتی پیرایوں سے پرہیز نے ان کی تخلیقی جسارتوں کا دائرہ بنایا ہے۔ نجی مشاہدے اور تجربے پر ان کا یہی اعتماد ان کی شعری ذہانت بھی ہے اور ان کی فنکارانہ دیانت بھی۔''(۱)

اس میں شبہ نہیں کہ آج ہم بھوک اور افلاس کے جس ناگفتہ بہ دور سے گزر رہے ہیں راحت اندوری جیسے دیدہ ور اور حساس شاعر کی زبان پر یہ شعر آجانا ناگریز سا ہوجاتا ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

راحت کے کلام میں بلا کی برجستگی معنی آفرینی اور دور حاضر کا عکس ہے۔ بدامنی اور ناانصافی کی جو ہوا آج کل چل رہی ہے قدم قدم پر خونچکاں اور لہولہان مناظر کا سامنا ہے اس سے راحت جیسے بیدار انسان کے احساسات لطیف کو اور اس کے کردار کو جو ٹھیس پہنچتی ہے وہ اشعار

---

(۱) پانچواں درویش۔ راحت اندوری اور لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۸۲

کا پیکر بن کر راحت کی زبان پر آجاتی ہے۔

راحت اندوری نے لفظیات کے استعمال میں بھی بڑی جرأت مندی سے کام لیا ہے اس سلسلے میں بھی ان کا شعور اختراعی نظر آتا ہے، بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔

''ان کے یہاں بے جان اور گونگے الفاظ بھی بول پڑتے ہیں۔''(۱)

اسی طرح لفظوں کے امتزاج نادر تشبیہات اور جدید ترین استعارات کے استعمال سے بھی وہ بیان کا نہایت دلکش پہلو نکال لینے کا ہنر رکھتے ہیں، مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ اکیلا تھا نہتا تھا جو بازی لے گیا
اور ہم اپنے جواں فرزند گنتے رہ گئے

شکست کھا ہی گیا میرا حاکمانہ مزاج
کسے خبر تھی کہ وہ میرے خواب مانگے گا

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک لفظ کو صدا بھی مان

سو رہی تھی اجلے کپڑے پہنے کالی آتما
کم سمجھ لوگوں نے ذرے کو ستارہ پڑھ لیا

اپنی کاغذ کی حویلی بھیگنے سے رہ گئی
عقلمندی کی کہ موسم کا اشارہ پڑھ لیا

ہیں خوشبوؤں کے تعاقب میں رینگتے کچھوے
مگر وہ مشک ابھی تک ہرن کی ناف میں ہے

---

(۱) پانچواں درویش۔ راحت اندوری اور لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۸۰

پھول جیسے مخملی تلوؤں میں چھالے کر دئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کر دئے

اب اور تاش کے پتوں کی سیڑھیوں پہ نہ چڑھ
کہ اس کے آگے خدا کا عذاب ہے بیٹا

راحت اندوری کی فنی عظمت اور اس کی بلندیاں ان کی بعض غزلوں کی ردیف میں نظر آتی ہیں۔ ردیف کی بنا پر شعر خود بول اٹھے یہ مشکل ہنر ہے، بہتوں کے یہاں ان کی فکری بلندیوں کا اظہار اسی سلیقہ انتخاب ردیف کی بنا پر ہے بعض اوقات طول طویل ردیف بھی غزلوں کو چمکا دیتی ہے۔ جیسے مومن خاں مومن ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''

اسی سلیقہ سے راحت اندوری نے بھی اپنی بیشتر غزلوں کو ردیفوں کے ذریعے یوں بالیدگی عطا کی ہے ملاحظہ کیجئے:

تمہارے نام پر میں نے ہر آفت سر پر رکھی تھی
نظر شعلوں پہ رکھی تھی زباں پتھر پہ رکھی تھی

تو تو اپنے مشوروں کے زخم دے کر چھوڑ دے
مجھ کو زندہ کس طرح رہنا ہے مجھ پر چھوڑ دے

تمہیں کہو کہ ٹھکانہ مرا کہاں میاں
زمیں سے بھاگ بھی جاؤں تو آسماں ہے میاں

میں جب چلوں تو یہ دولت بھی ساتھ رکھ دینا
مرے بزرگ مرے سر پہ ہاتھ رکھ دینا

ہنستے رہتے ہیں مسلسل ہم تم
ہو نہ جائیں کہیں پاگل ہم تم

سمندروں میں موافق ہوا چلاتا ہے
جہاز خود نہیں چلتے خدا چلاتا ہے
کوئی موسم ہو دکھ سکھ میں گزارا کون کرتا ہے
پرندوں کی طرح سب کچھ گوارا کون کرتا ہے
قطرہ قطرہ خوب اچھالیں گنگا جی
ہم پیاسوں پر ہاتھ نہ ڈالیں گنگا جی
چراغ ڈستی ہوئی آندھیاں بھی آئیں گی
اگر سفر ہے دشوار تو دشواریاں بھی آئیں گی

راحت کی غزلوں میں بعض اچھوتی اور نادر تشبیہات کی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں قدیم تلمیحات اور تشبیہات کے پردے میں راحت نے اپنے عہد کے مسائل اور حالات کا عکس بھی دکھایا ہے، جیسے:

آنکھ پیاسی ہے کوئی منظر دے
اس جزیرے کو بھی سمندر دے
اپنی سانسیں بیچ کر میں نے جسے آباد کی
وہ گلی جنت تو اب بھی ہے مگر شداد کی
ہم نے دوسو سال سے طوطے گھر میں پال رکھے ہیں
میر تقی کے شعر سنانا کوئی بڑی فنکاری ہے
گرجا میں اک موم کی مریم رکھی تھی
ماں کی گود میں گزرا بچپن یاد آیا

جھوٹ کو اپنے مرے سچ کے برابر کردے
سامری تو ہے تو آجا مجھے پتھر کردے

میں سب کو رام سمجھ لوں تو یہ بھی ٹھیک نہیں
یہاں ہر ایک کے کاندھے پہ ایک کماں ہے میاں

کسی آہو کیلئے دور تلک مت جانا
شاہزادے کہیں جنگل میں بھٹک مت جانا

یہاں لچھمن کی ریکھا ہے نہ سیتا ہے مگر پھر بھی
بہت پھیرے ہمارے گھر کے اک سادھو لگاتا ہے

یوں صدا دیتے ہوئے ترے خیال آتے ہیں
جیسے کعبہ کی کھلی چھت پہ بلال آتے ہیں

شہ کا نوکر نہ کہے شہ کر مصاحب سمجھے
اس کی خواہش ہے کہ دنیا مجھے غالب سمجھے

کسی کنیز کی قسمت چمک بھی سکتی ہے
سویرے صاحب عالم کی واپسی ہوگی

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

روٹی کی سختیوں نے ہمیں سخت کردیا
سنتے ہیں اب بھی ڈھاکے کی ململ نہیں ہے

حرم میں خاص مصاحب بھی جا نہیں سکتے
وہاں حرم کی کنیزیں ہیں شاہزادہ ہے

بزرگ مٹی کی عظمت کے اعتراف میں ہے
یہ مقبرہ ہے مگر ریشمی غلاف میں ہے

راحت نے غزل کی ایک قدیم روایت یعنی تذکرہ حسن وعشق کو بھی بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے یعنی ذہنی بے باکی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ ان معنوں کو دہرایا ہے۔ راحت معشوقانہ تصورات کو کم دوستانہ فضا کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لئے تذکرہ حسن کرتے وقت وہ محض خیالی تصورات میں گم نہیں ہوتے بلکہ ارضی حقائق کے پیش نظر وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی انفرادی سوچ وفکر کا کرشمہ ہے کہ اس کے باوجود یہ بھی حسن برقرار رہتا ہے کہ ان کی گفتگو محض برائے گفتگو ہے اسی لئے جب وہ اپنے دوست کے بارے میں لب کشا ہوتے ہیں تو حسن کی تمام عظیم ترین روایات ان کے روبرو ہوتی ہیں اور کہیں بھی ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ وہ تعریف کرتے کرتے تصنع اور بناوٹ کی بے کیف وادیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ ان کا تخیل براہ راست ان منازل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جن میں ارضی حقائق بہ تمام وکمال موجود ہوں اور تب وہ ان سچائیوں کو صاف سادہ اور سچے انداز میں جب بیان کرتے ہیں تو ان کا تصور جگمگا جاتا ہے، یہی وہ عزم ہے جو راحت کو دوستوں کی قصیدہ خوانی (تعریف بیجا) پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ راحت کا تصور حسن، حسن ذاتی کے حصار سے باہر نہیں قدم رکھتا وہ قبائے گل میں گل بوٹے تلاش کرنے کے قائل نہیں بلکہ فطری لب ولہجہ میں حسن ذاتی کے بیان میں ان کی زبان تصنع اور بناوٹ کے بیانات سے آلودہ نہیں ہوتی، مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

جی چاہتا ہے بس اسے پڑھتے ہی جایئے
چہرہ یا ورق ہے خدا کی کتاب کا

دیکھ کر تجھ کو کوئی منظر نہ دیکھا عمر بھر
اک اجالے نے میری آنکھوں میں جالے کر دئے

پھول ہی پھول پاؤں سے سر تک
نا م اس کا بہار ہونا تھا

جھیل اچھا ہے کنول اچھا ہے یا جام اچھا ہے
تری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے

اک کلی مسکرا کے پھول ہوئی
یہ قصیدہ بھی تیری شان میں تھا

مدتوں سے تلاش کرتا ہوں
اک غزل تیرے بانکپن جیسی

میرے آنگن میں آ کے ٹھہری تھی
چاندنی تیرے ہی بدن جیسی

کل ترا ذکر چھڑ گیا گھر میں
اور گھر دیر تک مہکتا رہا

کچھ کم نہیں ہیں تیرے محلے کی لڑکیاں
آواز دے رہی ہیں مجھے تیرے نام سے

چھوڑیئے بھی دکھوں سکھوں کا حساب
آپ ملتے ہیں یہ غنیمت ہے

پنگھٹوں کے سارے منظر اب ڈ سیلے ہو گئے
گاؤں کی کچھ لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

وہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اسے چھو بھی سکیں
ہاں اگر نام ہی رکھنا ہے تو خوشبو رکھ دے

سورج کے نکلنے سے تاروں کے بکھرنے تک
موجوں کے تھپیڑوں سے طوفاں کے ٹھہرنے تک
غنچوں کے مہکنے سے کلیوں کے چٹکنے تک
کیا تونے نہیں دیکھا پیکر بھی تو اس کا ہے

پانچ بندوں کی اس نظم میں اسی طرح کے سوال ابھارکر راحت نے وجود خالق کائنات کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری مسلسل غزل میں عظمت وحدت الوجود کے ذکر کیلئے اپنے کو کم تر بتاتے ہوئے اپنی عاجزی ظاہر کی ہے، ملاحظہ کیجئے خاص کر یہ اشعار:

جو کتابوں نے لکھا اس سے جدا لکھنا تھا
لکھ کے شرمندہ ہوں تجھ کو سوا لکھنا تھا
چاند لکھا کبھی سورج کبھی موسم لکھا
بات اتنی تھی مجھے نام ترا لکھنا تھا
پانیوں اور زمینوں کو قدم لکھا ہے
آسمانوں کو مجھے تیری قبا لکھنا تھا
تیرے اوصاف رقم ہوں یہ کہاں میری بساط
صرف اک رسم ادا کرنی تھی کیا لکھنا تھا
میں نے کاغذ پہ صدا دل کی بکھر جانے دی
مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا لکھنا تھا

اس کے علاوہ بھی انہوں نے عشق حقیقی کی طہارت کو اور بھی زیادہ پاکیزہ جذبات و تصورات کا اظہار کیا ہے۔ وہ تقرب خداوندی کیلئے براہ راست وسیلہ عجز ودعا واستغفار کو ہی صحیح اور مناسب ٹھہراتے ہیں۔

مسجد میں ہوں گی کلیسا نہ شوالے ہوں گے

اتنا نزدیک ترے چاہنے والے ہوں گے

راحت جستجوئے حق کیلئے اس کے مظاہر کو دیکھنے کی دعوت دیتے۔ انداز نہایت سادہ سبک ہوتے ہوئے بھی بحر معنی کی بیکرانی اس میں موجود ہے۔

سایہ سایہ ڈھونڈھ اسے

جس نے دھوپ نکالی ہے

راحت کو سرشاری عشق کا احساس ہے اور اس عشق میں ڈوب جانے والوں کو بلند مرتبہ والا اور عظمتوں کا حامل سمجھتے ہیں۔

ستارو آؤ میری راہ میں بکھر جاؤ

یہ میرا حکم ہے حالانکہ کچھ نہیں ہوں میں

اس عشق حقیقی کے تعلق سے ان کی پیش کردہ تلمیحات کا حسن دیکھئے:

ہونٹوں پہ اپنی پیاس کا دوزخ کھنگال لے

یا ایڑیاں رگڑ کوئی چشمہ نکال لے

یوں صدا دیتے ہوئے تیرے خیال آتے ہیں

جیسے کعبہ کی کھلی چھت پہ بلال آتے ہیں

راحت کو اپنے جذبہ عشق خداوندی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جلوہ حق سے ایک نہ ایک دن اپنی آنکھوں کو منور کر لیں گے۔

ہزار پردے میں خود کو چھپا کے بیٹھ مگر

تجھے کبھی نہ کبھی بے نقاب کردوں گا

اور اسی کے ساتھ خدائے قدوس کے تصور کو اس جذبہ فکر ونظر سے پیش کرتے ہیں:

کچھ لکیریں سی ہواؤں میں بنا دیں اس نے
میں نے پوچھا تھا کہ تصویر خدا کیسی ہے

راحت اندوری کا کلام فکری بالیدگیوں سے پوری طرح مزین ومرصع ہے اور ساتھ میں حقیقت پسندانہ رویوں کا عکاس بھی ان کو اپنے گردوپیش کے حالات کا بخوبی علم وادراک ہے جس کا اظہار وہ بڑی بے باکی سے نڈر ہوکر کرتے ہیں۔ایسی مثالیں ان کے مجموعے کلام دھوپ دھوپ، پانچواں درویش اور میرے بعد (دیوناگری میں) بڑی وافر تعداد میں نظر آتی ہیں، ملاحظہ کیجئے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

آج سڑکوں پہ تصاویر بناتے رہئے
انگلیاں ٹوٹ چکیں جب یہ ہنر آیا تھا

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں
ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے

میں اپنا عزم لے کر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پر رکھی تھی قسمت گھر پہ رکھی تھی

پردیس جارہے ہو تو سب دیکھتے چلو
ممکن ہے واپس آؤ تو یہ گھر نہیں ملے

جن زمینوں کے قبالے ہیں مرے پرکھوں کے نام
ان زمینوں پر مرے جینے کے لالے پڑ گئے

سانسوں کی سیڑھیوں سے اتر آئی زندگی
بجھتے ہوئے دیے کی طرح جل رہے ہیں ہم

راحت نے حرمت غزل کے تحفظ کیلئے اپنا سب کچھ خون کے آنسوؤں کی شکل میں نچھاور کردیا ہے اور فارسی زدگی سے محفوظ اردو کے سبک لفظ ومعنیٰ کی امانت سنبھالتے ہوئے پتھروں کو بھی پانی کردیا ہے۔ نیز جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو غزل کا نام دے کر رات بھر کی کروٹوں کا ذائقہ منظوم کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی راحت کے کلام کے حوالے سے اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

''جب (راحت اندوری نمبر) راحت اندوری شخص اور شاعر کے باب یکے بعد دیگرے وا ہوتے ہیں اور صفحہ صفحہ شعر در شعر، مصرعہ در مصرعہ سطر در سطر، فقرہ در فقرہ، لفظ اور ان کی تصانیف سے گزرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو منزل گام بہ گام، لمحہ بہ لمحہ ایک جہان حیرت واستعجاب کا سامنا ہوتا ہے۔ راحت اندوری کے تعلق سے قائم کردہ اپنے پچاس سالہ نظریاتی قلعوں کو یکے بعد دیگرے انہدام پذیر ہوتے محسوس کرتا ہوں۔ جب راحت کے گلستان شعر سے روش در روش گزرتا ہوں تو ہر شعر کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہوں۔'' (۱)

راحت بلند فکر کی خواہش اور پرواز تخیل کی بیکرانی کے باوجود ان کی غزل اپنے گردوپیش کے روزمرہ کے معاملات اور معمولات سے وابستہ زمینی مسائل سے انہیں جوڑے رکھتی ہے۔

میں چاہتا تھا غزل آسمان ہوجائے
مگر زمین سے چپکا ہے قافیہ میرا

زمین سے وابستگی اور زمینی مسائل سے پیوستگی کے باوجود انہیں زمینی غزل کی بے حرمتی گوارہ نہیں ہے اور انہیں مستی اور بازاری شاعری اور عوامی انداز سے گھن آتی ہے، یہ اشعار دیکھئے:

میں جاہلوں میں کچھ لہجہ بدل نہیں سکتا
مری اثاث یہی شین قاف ہے جانی

---

(۱) راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک، ڈاکٹر محبوب راہی، امکان لکھنؤ ماہنامہ نومبر دسمبر ۲۰۱۰، ص ۸۳

لے تو آئے شاعری بازار میں راحت میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

راحت اندوری کی شاعری کی مقبولیت کے کچھ پہلو یہ بھی ہیں کہ ان کے اشعار کے بارے میں روزنامہ آئینہ عالم مرادآباد نے اپنے چند اداریے تحریر کئے مثال کے طور پر ان کے اس شعر کے حوالے سے:

سمندر بار ہوتی جارہی ہے
دعا پتوار ہوتی جارہی ہے

اس شعر کو پیش نظر رکھ کر ۲۱رجون ۱۹۹۳ء کے شمارے میں محررہ اداریہ کا عنوان تھا ''جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' جس میں نرسمہا راؤ کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی تھی، جو انہوں نے بابری مسجد کے انہدام، سورت کے قتل عام، مہاراشٹر اور گجرات کے فسادات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی۔

اسی اخبار نے ۲۵ردسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں راحت اندوری کے مشہور شعر:

تری دستار پہ تنقید کی ہمت تو نہیں
اپنی پاپوش کو قالین کہا ہے میں نے

کے حوالے سے بعنوان ''لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل'' کے تحت اپنے اداریہ میں وی پی سنگھ، چندر شیکھر اور اجیت سنگھ کی تثلیث کو امام بخاری کی انتخابی حمایت وتائید کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔

اسی طرف راحت اندوری کے شعر اشارہ کرتے ہیں:

تم اپنے بوڑھے درختوں پہ خوب اترائے
اور اس کو بھول گئے جو ہوا چلاتا ہے

اسی اخبار کے شمارہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۳ء میں اپنے اداریے بعنوان ''راؤ کے زہریلے سانپ'' نرسمہا راؤ اور ان کے ہمنوا ایک وزیر کے غیر ذمہ دارانہ رویہ پر احتجاج کیا گیا ہے۔

اسی اخبار کے شمارہ مطابق ۲۹ر ستمبر ۱۹۹۳ء کے ایک اداریہ: مولا فقیر کے تحت راحت اندوری کے اس مصرعہ کو پیش کیا تھا۔

ع۔ جاہل ڈھور گنوار سب ہیں قوم کے سردار   اللہ بادشاہ

اور اس کی مناسبت سے انتخاب کیلئے امیدواروں کے نام کے اعلان پر امیدواروں کی نااہلی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ راحت اندوری کی ہمت جہت عالمی مقبولیت ان کی شعری عظمتوں سے متاثر ہو کر ایس ایم حسن نے راحت کی غزلوں پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد ان کی چند غزلوں کے مختلف اشعار کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، چند نمونے ملاحظہ کیجئے:

راحت کا شعر:

اپنا چہرہ تلاش کرتا ہے
گر نہیں آئینہ تو پتھر ہے

ترجمہ دیکھئے:

I have lost my face O sweet heart.

I am searching it in vain,

O let me have a mirror to reflect,

Or other wise let it be lynched to death.

راحت کا شعر دیکھئے:

مجھے زمین کی گہرائیوں نے داب لیا
میں چاہتا تھا مرے سر پہ آسمان رہے

ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

Yeeh, the earth has buried me deep,

Deep among dead and forgotten,

Fair did I have the aspiration,

To enjoy sky flights over here.

راحت کا شعر:

میں بہت جلد ہی گھر لوٹ کے آجاؤں گا

میری تنہائی یہاں کچھ دنوں پہرہ دیدے

ترجمہ دیکھئے:

Rest arsured O dear,

My return would not be long,

Till then O my solitude,

Guard the precints ofmy home.

راحت کا شعر دیکھئے:

آپ اس شخص سے واقف تو ہیں کم واقف ہیں

وہ مسیحا ہے مگر زخم لگانے والا

ترجمہ دیکھئے:

You may know the man but,

Yoy know him not full well,

He is massiah but you know,

He heals with cuts and wounds.

راحت اندوری نے اپنا شعری سفر جس اعتماد اور ذہنی بیداری سے شروع کیا تھا آج ان کے یہ رویے اس منزل تک پہنچ چکے ہیں، کہ انہیں ہماری موجودہ شاعری کے تروتازہ کارآمد اور زندہ حقائق کو پیش کرنے کا مکمل شعور حاصل ہو گیا ہے۔ شاعر جمالی اپنے ایک مکتوب بنام راحت اندوری میں ان کی شعری استعداد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میرے تجزیے کے مطابق تمہاری شاعری کے تین دور ہیں ایک وہ جب تم ایک جھنجھلاتے ہوئے عاشق تھے پھر جب احتجاج کو اپنا پرچم بنایا اور پھر آج جب تم نے اس وادی میں قدم رکھا جہاں پائندگی تابندگی اور آئے والی نسل کیلئے ادبی زندگی کے واضح نشانات نظر آنے لگے۔''(۱)

یا پھر بقول طارق سبزواری:

''راحت کی شاعری میں جدت طرازی اور ترسیل و ابلاغ کے پیش نظر اثرات یا شعوری تجربے تو نہیں بلکہ وہ فکری شعر کاری اور ذہنی شاخ تراشی کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے معاشرے کے تمام ناسوروں کو اپنی شاعری کے پیراہن میں ڈھانپنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی ان کے فن کی معراج ہے۔''

اپنے شعری رویوں کے لحاظ سے خود راحت اندوری کا یہ احساس بہت اہمیت رکھتا ہے ملاحظہ کیجئے:

''مسلسل سفر میں ہوں پیروں میں لغزش اور دل میں خوف پہاڑوں کی طرح راستہ روکے ہوئے الفاظ و معنی لیکن مجھے چلتے رہنا ہے بیساکھیوں کے بغیر راستہ بھی تو خود میں نے چنا ہے، ہتھیلی پر بکھری ہوئی لکیروں کی طرح الجھا ہوا راستہ، میری رفتار سے کچھ لوگ چیں بہ جبیں ہوا کریں میں تو مطمئن ہوں اپنی لہولہان زندگی سے۔''(۲)

---

(۱) مکتوب شاعر جمالی بنام راحت اندوری

(۲) مجموعہ کلام دھوپ دھوپ راحت اندوری ص ۷

ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنے ایک مضمون میں راحت کی شعری عظمتوں کو سراہتے ہوئے بڑی وقیع بات کہی ہے، ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری کو محض مشاعروں کے شاعر کی تہمت لگا کر ٹاٹ باہر نہیں رکھا جا سکتا کہ انہوں نے ادب پڑھا ہی نہیں پڑھایا بھی ہے۔ وہ بڑبولے پن کے خمار میں ''وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے'' کہہ کر تالیاں نہیں پٹواتے میر و غالب جیسے یگانہ روزگار سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی فنی جہتوں میں نو بہ نو وسعتوں اور اضافوں کے امکانات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، مثال کیلئے راحت کے اشعار دیکھئے:

ساری دنیا حیرتی ہے کس لئے
دور تک منظر بہ منظر کون ہے

یارو معاف میر کا میں معتقد نہیں
ایسی بھی کیا غزل کہ کلیجہ نکال لے

اور مرا دل وہی مفلس کا چراغ
چاند تیرا ہے ستارے تیرے

بجھ گئے چاند سب حویلی کے
جل رہا ہے چراغ مفلس کا

میر جیسا تھا دو صدی پہلے
حال اب بھی وہی ہے مجلس کا

ہم نے دو سو سال سے طوطے گھر میں پال رکھے ہیں
میر تقی کے شعر سنانا کون بڑی فنکاری

غالب تمہارے واسطے اب کچھ نہیں رہا
گلیوں کے سارے سنگ تو سودائی لے گئے

غالبوں کو رکھو دماغوں میں
دل یگانہ مثال رکھا کرو

غالب بھی ہے بچپن بھی ہے شہروں میں
مجنوں بھی ہے لیکن پتھر غائب ہیں

کون وہ مرزا اسداللہ خان
مجھ سے وہ تنہائی میں اکثر ملا

یہ تو میر و غالب یگانہ وغیرہ کی ادبی روایت سے وابستگی یا استفادہ کا نام بہ نام راست اظہار ہوا۔ راحت نے اپنی شاعری میں جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت تجربات کی کثرت فکر ونظر کی بلوغت اور نتائج اخذ کرنے میں ان کی ذہانت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ عالم بالخصوص تاریخ اسلام کے مد و جزر عروج و زوال اور فتح و شکست کے تمام مناظر گویا ان کی نظروں کے سامنے تیرتے رہتے ہیں، جنھیں حسب موقع و محل وہ اپنے اشعار میں منعکس کرتے رہتے ہیں محض ایک مصور اور کیمرہ مین کی طرح نہیں بلکہ ان میں ان کی شدت احساس کے لہو ریز رنگوں کی بھی شمولیت ان کی تاثر انگیزی کو دوبالا کر دیتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری پڑ گئے
باپ حاکم تھا مگر بیٹے بھکاری ہو گئے

چلو دیوان خاص اب کام آیا
پرندوں کا ٹھکانہ ہو چکا ہے

حاشیے پر کھڑے ہوئے ہیں ہم

ہم نے خود حاشیے بنائے تھے

میری گم گشتگی پر ہنسنے والو

میرے پیچھے زمانہ چل رہا ہے

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں

یہیں یہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

کوئی وارث ہو تو آئے اور آ کر دیکھ لے

ظل سبحانی کی اونچی چھت میں جالے پڑ گئے

انہیں سانسوں کے چکر نے ہمیں وہ دن دکھائے تھے

ہمارے پاؤں کی مٹی ہمارے سر پہ رکھی تھی

وہ آج چلے گئے پائینچے اٹھائے ہوئے

کبھی چڑھا ہوا دریا اتارنے والے

کہاں وہ خواب محل راجداریوں والے

کہاں یہ بیلچے والے تگاڑیوں والے

مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں

مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے

ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر

مگر ہمارا مقدر خراب ہے بیٹا

یہ الگ بات کہ پستی میں پڑے ہیں ورنہ

چاند تاروں کی تو ہم راہ گزر جانتے ہیں

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

ہمارے جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیصیں لوگ ہماری پہن کے آئے ہیں

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہیں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائیں دیں گے

اسلامی تاریخ کے عروج وزوال اور ملت اسلامیہ کے حالات کی اتھل پتھل کے علاوہ راحت کی شاعری کا ایک اہم موضوع سیاست بالخصوص ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کی لعنتوں پر نشتر زنی بلکہ شمشیر زنی کی ہے، ملاحظہ کیجئے:

ورنہ اوقات کیا تھی سایوں کی
دھوپ نے حوصلے بڑھائے تھے

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

سڑک پر دوریاں ہی دوریاں ہیں
کہ آمد پھر کسی تہوار کی ہے

یہ سارے لوگ تو شامل تھے لوٹنے میں مجھے
سنا ہے اب میری امداد کرنا چاہتے ہیں

مرے سچ سے انہیں کیا لینا ہے میں جانتا ہوں
ہاتھ قرآن پہ رکھو کہ وہ کیا پوچھیں گے
یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے
بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یاتراؤں سے کچھ نہیں ہوگا(۱)

راحت اندوری کی کثیر الجہات شاعری کو کسی ایک خانے میں رکھ کر پرکھا نہیں جاسکتا ان کی شاعری بیک وقت تاریخ، سماجیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، مدحیات وغیرہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے ان تمام اجزائے ترکیبی کے متوازن امتزاج سے ایک بالکل نیا لب وہ لہجہ اور اچھوتا رنگ و آہنگ ایجاد کیا ہے، جس پر میرؔ، غالب، یگانہ اور شاد کی انانیت پسندی آتش کے سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ اقبال کی مقصدیت آمیز داخلی اور مسائل حیات و کائنات کے اشتراک باہمی سے رچے بسے بے تکلف اور واشگاف انداز اور اپنے ہم عصروں میں مظفر حنفی کے طنز سے مملو منفرد لب ولہجہ کی چمک دمک دکھائی دیتی ہے۔ راحت نے اپنا ایک ایسا لہجہ وآہنگ اختیار کیا ہے جو ان کا اپنا لہجہ اور آہنگ ہے، جس کا تلخ کھٹا میٹھا ذائقہ ان کو اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ تھلگ ایک منفرد پہچان عطا کرتا ہے۔ راحت نے اپنے دامن فکر ہر ہنگامہ، تحریک وقتی رجحان یا گروہی نظریہ سے محفوظ و مامون رکھتے ہوئے اپنے گردوپیش اپنے روزمرہ کے معاملات ومعمولات پر مبنی مسائل کی ترجمانی کے وسیلے سے اپنی تخلیقی وجود کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے راحت اندوری کی مجموعی تخلیقی شناخت پر ارباب نقد ونظر کی موقر و معتبر آرا اپنے ایک مضمون میں بہت ہی مفصل طور پر پیش کی ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''مظفر حنفی نے راحت کو فراق کے بعد اسٹیج پر شعر کی تصویر بن جانے والے دوسرے شاعر سے

(۱) راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک ڈاکٹر محبوب راہی ماہنامہ امکان لکھنؤ نومبر دسمبر ۲۰۱۰، ص ۲۹

موسوم کیا ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس ان کی شاعری کو نئی کمان کا تیر سے مشابہ قرار دیتے ہیں جو جدید میزائلوں کی طرح اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتا ہے۔وسیم بریلوی نے انہیں میزائلی لہجے اور تیزابی تیور کا فنکار کہا ہے، جو اپنی شعلہ بیانی سے طمطراق اقتدار کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت رکھتا ہے۔اختر نظمی انہیں تلخ اور درشت لہجے سے خود اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے والا بتاتے ہیں، جبکہ نظام صدیقی انہیں نئے عہد کی غزلیہ تخلیقیت کے آبنوسی گلاب سے موسوم کرتے ہیں۔ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے راحت کو غزل کا جیون ساتھی قرار دیا ہے جبکہ اسعد بدایونی کو ان کے بنیادی مزاج میں عصری صداقتوں اور سفاکیوں کی بیباکانہ اظہار کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔ڈاکٹر عزیز اندوری راحت کی شاعری میں عصبیت کے خلاف اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر للکارتے لہجے کو تلوار کی کاٹ بنا کر لفظوں کی تیزی دماغوں کو جھنجھوڑ دینے، مردہ طبیعتوں کی افسردگی دور کرنے، شعلہ بیانی بلند آہنگی، احتجاجی روش اور برہنہ گفتاری جیسے نمایاں اوصاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔صلاح الدین ہنر نے انہیں شعلے اگلنے والا، آتش زیرپا، منہ زور آندھی کی طرح فضا کو تہہ و بالا صبا رفتار سیلاب، تیغ آبدار، طمطراق دبدبانہ اور باغیانہ بانکپن والے امڈ امڈ کر برسنے والے بادل برق و باراں جیسی کیفیات کا حامل شاعر قرار دیا ہے، جبکہ اقبال مسعود ان کی احتجاج کی آواز کو ایک مسلسل چیخ سے تعبیر کرتے ہیں، جو نعرہ ہے نہ پاگل پن یہ چیخ مزاحمتی شاعری کی صورت میں شہر شہر گلی گلی پھیلی ہوئی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔عشرت ظفر ہر محاذ پر شمشیر بہ کف راحت کی غزل کو عصری نظام کا کرب اور خندہ واستہزا قرار دیتے ہیں۔شکیل گوالیاری نے راحت کی غزل کو چاق و چوبند پھرتیلی اور منہ پھٹ سے تعبیر کیا ہے۔شاعر جمالی نے راحت کی غزل کو سینہ باطل کیلئے نیزے کی طرح استعمال کرنے والا جرأت انکار کا شاعر کہا ہے۔سعید عارفی نے انہیں ایک نئے ذائقے کا شاعر قرار دیا ہے، جو معاشرتی نظام کے تضادات، زندگی کی تلخیوں، حالات کی سنگینیوں، بے ثباتی اور بے یقینی کے خلاف نبرد آزما ہے۔معراج فیض آبادی نے انہیں بائیں کاندھے کا فرشتہ جبکہ طارق شاہین نے قدیم اور جدید رویوں کا نقطہ اتصال قرار دیا ہے۔ڈاکٹر خالد حسین راحت کو اپنے عہد کے ساتھ آنے والے وقتوں کا بھی سرمایہ قرار دیتے

ہیں۔ واجد قریشی نے انہیں عصری حسیت کا شاعر اور ان کی شاعری کو ساعتوں اور جسارتوں کی شاعری سے تعبیر کیا ہے، جو تمام معیاروں پر کھری اترتی ہے۔ واصف فاروقی نے ان کی شاعری کو ہوش و حواس اور وجدان کو مسخر کرنے والی آواز کہا ہے، اثر صدیقی انہیں عبقری اور منفرد غزل گو نیز اردو کا ایک غیور اور نابغۂ روزگار سخنور کہتے ہیں۔ احمد کلیم فیض پوری معنویت کی گہرائی کو راحت کو شیوہ شاعری قرار دیتے ہیں، جبکہ جوہر کانپوری انہیں اپنا آئیڈیل تسلیم کرتے ہیں۔

سید محمد عقیل کی رائے میں ان کی شاعری میں برہنہ گفتاری کے ساتھ ساتھ تہہ داریاں بھی ہیں، جو کیفیت اور حالات کی بے رحمیوں کو سمیٹ کر راحت کی شاعری میں متحرک ہوگئی ہیں۔ ایسی شاعری محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوا کرتی اس کیلئے زندگی کی سخت راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سرخیل علی سردار جعفری نے راحت کا شعری رشتہ قرون وسطیٰ کی شاعری سے ملایا ہے اور آخر میں طنز و ظرافت کے نابغۂ روزگار شاعر مرحوم ساغر خیامی کی سنجیدگی اور متانت کی حامل اس رائے کو بجائے مقطع پیش کرتا ہوں کہ اس صدی میں جینے والے قابل تحسین و مبارکباد ہیں کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے، جس میں راحت اندوری جیسا شاعر اپنی پوری ادبی تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔''

اختتام کلام سے قبل جی چاہتا ہے راحت کے مزید چند خوبصورت اشعار ضیافت طبع کیلئے پیش کردئے جائیں، ملاحظہ کیجئے:

آنکھوں میں آنسوؤں کو اگر ہم چھپائیں گے
تاروں کو ٹوٹنے کی ادا کیسے آئے گی

ندی سے دھوپ نے کیا کہہ دیا روانی میں
اجالے پاؤں پٹکنے لگے ہیں پانی میں

میں ہوں یہ گم تو نہیں ہے ترے ہونے کی دلیل
میرا ہونا ترا احساس دلاتا ہے مجھے

قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن خوشبو کا
خار صحرا کہیں بھولے سے مہک مت جانا
شاخ سحر پر مہکے پھول اذانوں کے
پھنک رضائی آنکھیں کھول اللہ بول (۱)

جہاں تک راحت کے ادبی مرتبہ کا تعلق ہے اثر صدیقی نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ ''راحت کی شاعری مشاہدات و تجربات کی سنگلاخ وادیوں سے گزرتی ہے۔ انجان پتھریلی زمینوں میں خیالات کے دلفریب کیکٹس اگ آتے ہیں ان کا تیشہ شعور فلک پیا چٹانوں پر ترسیلات کا اجنتا تراش کر تخلیقاتی نروان ڈھونڈتا ہے۔ راحت شعروادب کی ریڈی میڈ شاہراہوں کا قائل نہیں وہ اس پگڈنڈی کا عاشق ہے، جو خود اس کے اپنے نقوش پا سے ابھر آئی ہے۔ اسے قافلوں کی آواز جرس سے زیادہ اپنے پیروں کی آہٹیں پیاری ہیں۔ غزل میں راحت کی پیکر تراشیاں، قلندرانہ شان، نادر تشبیہات تابندہ اسلوب، انفرادی زاویہ نگاہ، عمیق مشاہدہ اور شاعرانہ اخلاص بدرجہ اتم ہے، جو اسے معاصرین اور متوسلین اور ناقدین میں ممتاز و منفرد کرنے کیلئے کافی ہے۔'' (۲)

---

(۱) مشاعروں سے شہر ادب تک (راحت اندوری) مضمون محررہ ڈاکٹر محبوب راہی۔ امکان ماہنامہ لکھنؤ نومبر دسمبر ۲۰۱۰۔ ص ۳۰۔
(۲) عبقری اور منفرد غزل گو از اثر صدیقی راحت اندوری شخص اور شاعر، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۳۳۲

باب ششم

راحت اندوری کی فلمی زندگی

لیکن ان کی پیشانی پر فکر و ملال کی شکنیں کبھی نہیں دیکھی گئیں اس ضمن میں ایم این غوری نہایت تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری فلم ''سب سے بڑی بازی گر'' جس کی موسیقی دے رہے تھے مرحوم لکشمی کانت (لکشمی کانت پیارے لال) اور گیت کار کی حیثیت سے راحت بھائی کا نام تھا پہلے گانے کی نشست میں جب وہ لکشمی جی گھر گئے اور دو تین مکھڑے سنائے تو انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا کچھ دیر بعد یہی کہا'' کچھ مزہ نہیں آیا'' واپسی میں راحت بھائی نے مجھ سے کہا یہ فلم آنند بخشی سے لکھوالیں۔ شاید لکشمی کانت میرے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے، میں نے کہا ایسا نہیں ہے آپ کچھ اور لکھیں'' تب راحت بھائی نے مجھ سے پوچھا آپ میوزک ڈائرکٹر کو ایک گانے کا کتنا پیسہ دیتے ہیں، چونکہ لکشمی جی کا بیٹا میری فلم میں ہیرو تھا اس وجہ سے مجھے انہوں نے کافی رعایت دی تھی۔ صرف ریکارڈنگ کا خرچ لیتے تھے۔ لکشمی جی کا پے منٹ اسٹوڈیو کا کرایہ گلوکاروں اور میوزیشین وغیرہ کے اخراجات کل ملا کر سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں ایک گانا تیار ہو جاتا تھا۔ میں پھر بھی اعزازیہ کے طور پر گیارہ ہزار روپیہ کا لفافہ لکشمی کانت جی اور گیارہ ہزار روپیہ کا لفافہ پیارے لال جی کو ہر گانے کے طور پر دیتا تھا میں نے راحت بھائی سے فرمائش کی کہ میرے لئے دس ہزار روپیہ میں ایک گانا لکھیں۔ دو چار روز بعد پھر جب ہم لکشمی کانت جی کے گھر جانے لگے تو راستے میں راحت بھائی نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے غوری صاحب آج انہیں اگر میرا لکھا ہوا گانا پسند نہیں آیا تو میں ان سے اور آپ کی فلم سے اپنے کو الگ کرلوں گا اگر وہ میوزک ڈائرکٹر ہیں تو میں بھی شاعر ہوں۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک ہزار روپیہ کا فرق ہے۔''(۱)

راحت کا خود شناسی کا یہ جو ہر کہا جائے یا اللہ کی دین کہ ان کا گیت تو پسند کرلیا گیا لیکن ''ظلمتیں بھی ہیں یہاں قندیل زر کی لو کے ساتھ'' فلم مکمل نہ ہو سکی ورنہ اچھے گیت ضرور سامنے آتے۔ اسی لئے دئے پن کے ساتھ وہ آج فلمی دنیا سے وابستہ ہیں لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے آہنگ کو

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، ایم این غوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۱۶

بیٹھتے۔ اس کا تصور محال ہے ان حالات میں راحت اندوری اگر اپنے پروقار ذہن اور ادبی وشعری بلندیوں کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یقین ہے کہ ان کے ذریعے فلم انڈسٹری میں ایک زبردست تبدیلی اور ایک عظیم انقلاب پیدا ہو سکے گا اس خیال سے فلم کی ان کا سفر لائق تحسین ہے۔ اس لئے انہوں نے اب تک جو فلمی نغمات لکھے ان میں شعری حسن بھی ہے، فکری گہرائی بھی ہے اور قبول بھی کئے گئے ہیں، مثلاً فلم خوددار کا یہ گیت:

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے
کیا چیز ہو تم خود تمہیں معلوم نہیں ہے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ راحت کی یہ پہلی فلم تھی اور یہ بھی فیل ہو گئی لیکن فلم میں کام کرنے والوں کو حالات سے بہت کچھ سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے، مثلاً موسیقی کی دھنوں پر گیت ہو، منظر چاہے جیسا ہو شاعر کا ذہن اس طرف رجوع نہ ہوا دبیت دم توڑ رہی ہو پھر بھی گیت کار انہیں قید سلاسل میں رہ کر لکھنے پر مجبور ہوتا ہے یعنی فلم آمد سے تہی دست ہو کر صرف آورد ہی آورد ہوتی ہے اور یہ کام اس وقت اور بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے جو سچا یعنی وہی شاعر اور اچھا شاعر ہو۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ ایسے افراد کیلئے لکھے جو شاعری یا شعر کے شین سے بھی نابلد ہوتے ہیں۔ راحت اندوری کو فلم میں کام کرتے ہوئے ان مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، اکثر انہوں نے یہ دل میں ٹھان لی کہ اب وہ فلم سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ جس ناؤ پر وہ بحر جہات پار کر رہے تھے اسے توڑ چکے تھے یعنی کالج کی پروفیسری جیسی باوقار ملازمت یہ ان کی بے بسی تھی، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس تھوپی ہوئی شاعری اور مسلط کردہ موضوع پر شعر کہنا دشوار ضرور ہے پھر بھی ان کے گیتوں میں شاعری کی خوشبو الگ سے محسوس ہوتی ہے۔

راحت کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے فلموں کے لئے گیت پھکڑ پن، بازاری اور پھوہڑ قسم کے گیت لکھنے سے ہمیشہ انکار کر دیا۔ فلم کی اس کاروباری زندگی میں راحت نے اپنی شرافت نفس کا کبھی سودا نہیں کیا ان کی فطرت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، جس کا ان کو بسا اوقات مزہ بھی چکھنا پڑا

آج ہم نے دل کا ہر قصہ مکمل کردیا
خود بھی پاگل ہوگئے ان کو بھی پاگل کردیا

شعری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہوا اور فلمی منظر کے عین مطابق لیکن فلم سرمایہ دار پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی بدمزاقی بدذوقی اور کج فہمی کا بھلا ہو اس بھرپور مطلع میں اس طرح انہوں نے تبدیلی کی کہ شعر بحر سے ساقط ہوکر اپنا سارا حسن کھو بیٹھا، ترمیم ملاحظہ کیجئے:

آج ہم نے دل کا ہر قصہ تمام کردیا
خود بھی پاگل ہوگئے ان کو بھی پاگل کردیا

تمام کی تقطیع یوں ہوگی، پہلا رکن ساکن، دوسرا رواں، اور تیسرا پھر ساکن اس طرح اور پاگل میں دو رکن رواں ہیں پا اور گل یعنی:

ساحر نے فلمی گیت بھی لکھے ہیں لیکن آج کا کج فہم اور کوتاہ نظر مالک یقین ہے کہ ان کو کوڑے دان Dust bin کے حوالے کردے گا فلم ساز کی خوشی تو ہو جائے گی لیکن ادب کا قلع قمع ہو جائے گا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ساحر کے وہ گیت جو اپنے عہد میں مقبول ہو چکے ہیں آج کا فلمی آقا ان میں کیسی کیسی اور کیا کیا تبدیلی کرتا۔

خدائے برتر تری زمین پر زمین کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے
ہر ایک فتح وظفر کے دامن پہ خون انساں کا رنگ کیوں ہے

یا یہ شعر:

یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبر ملک و قوم بتا

یا ان پرانے گیتوں کے کٹھن الفاظ جن کو فلم دیکھنے والا اپنے دور میں قبول کرتا رہا تھا کہیں ایسے اشعار آج کے فلم گروں کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ان کو چودہ نہیں چودہ سو برس کا بن باس دے

اندوری فلمی دنیا رہے تھے ان دنوں وہ اندور کے ایک کالج میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے مکمل طور پر وہ ممبئ کے ہوکرنہیں رہ گئے تھے وہاں ایک فلم پروڈیوسرانو ملک کے یہاں راحت اندوری لگے ہوئے ممبئ جاتے تو باندرہ کے ایک اچھے ہوٹل میں ان کا قیام ہوتا جہاں چار چھ دن کا کرایہ ہزاروں روپیہ ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ پیسہ فلم کا پروڈیوسر ہی ادا کرتا تھا لیکن راحت صاحب اس خرچ کو پروڈیوسر کے سر ایک بوجھ سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے غوری صاحب کے ساتھ رہنا شروع کردیا غوری صاحب نے کسی نہ کسی طرح راحت کو بھی اپنے ساتھ کام پر لگالیا تھا حالانکہ وہ فلم کامیاب نہ ہوسکی تھی یہ الگ بات ہے لیکن بقول غوری صاحب:

''وہ یہ حقیقت ہے کہ جس وقت راحت بھائی کو پردے پر ایک جیل میں شعر پڑھتے دکھایا جاتا تھا تو سارا ہال تالیوں سے گونج جاتا تھا۔''(۱)

ایسے کلمات تحسین کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ راحت اندوری ایک حساس ذہین خوددار فنکار ہیں موجودہ نغمات فلم سے زیادہ وہ شعری حسن ولطافت اور گہرائیوں کا بھی ان کو عرفان حاصل ہے ادبی روایت اور فلم کے باہمی روابط پر بھی ان کی نگاہ گہری ہے۔ فلم کی عرفانیت اور پاکیزگی میں تمیز کرنا انہیں بخوبی آتا ہے یعنی وہ ایک بیدار مغز ذہن لیکر فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے ہیں اس ضمن میں پروین شاکر کا شعر پیش کرنا یقین ہے کہ حسب حال ٹھہرے گا۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو

ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

کم ہی یقین ہے کہ پرکاش نے جوان سے امیدیں وابستہ کررکھی ہیں ان پر وہ کھرے اتریں گے آج کی فلمی بے ترتیبی کبھی پوری ہونے دے گی جس کی ایک دلیل تو یہی ہوسکتی ہے۔ فلم سرکیلئے راحت نے ایک گیت لکھا گیت شعری نغمگی سے بھرپور تھا ادبی وقار سے بھی مزین گیت، گیت کا مطلع تھا:

---

(۱) لمحے لمحے بدایوں راحت اندوری نمبر ۲۰۰۲ ص ۳۱۳ مضمون ایم این غوری

فلمی دنیا کی چکاچوند اور مسحوریت میں وہ کشش اور جاذبیت ہے کہ بہتیرے اس کی طرف کھنچ جاتے ہیں اور یہ ایسا مایا موہ کا پھندہ یا مہابھارت کا چکردیو ہے، جس میں ارجن کے بیٹے ابھیمنو کی طرح جو بھی پھنسا اس کا بچنا محال ہو جاتا ہے یعنی وہ چاہ کر بھی دامن نہیں چھڑا پاتا۔ راحت اندوری کو بھی یہی چمک دمک کھینچ لائی اس ضمن میں این ایم غوری اپنا قصہ بیان کرتے ہیں۔:

''میں ایک کاروباری آدمی بھلا سلولائیڈ کی چمک سے متاثر ہو گیا اور فلم انڈسٹری میں اپنی قسمت آزمانے کیلئے ۱۹۹۲ء میں اندور سے یہاں آ گیا اور یہاں میں نے لاکھوں کا نقصان اٹھانے کے بعد بھی اس امید پر کہ اپنا کھویا ہوا سرمایہ یہیں سے واپس لینا ہے، دو اور فلمیں ایک ساتھ شروع کیں۔'' (۱)

این ایم غوری صاحب پہلے سے فلمی دنیا میں قدم جمائے ہوئے تھے لیکن سب سے پہلے ان کو دلبر نامی فلم میں کام ملا تھا فلم تیار ہونے کے بعد فلاپ ہو گئی تھی اس میں ان کو کافی خسارہ برداشت کرنا پڑا لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انہوں نے پھر دو اور فلمیں ایک ساتھ شروع کیں اسی زمانے میں راحت

(۱) لمحے لمحے راحت اندوری نمبر ۲۰۰۲ ص ۲۱۳، مضمون راحت بھائی اور فلم مضمون نگار ایم این غوری

لکھنؤ کے مشاعرے میں غزل پیش کرتے ہوئے راحت اندوری

کسی آہو کے لئے دور تلک مت جانا
شاہزادے کسی جنگل میں بھٹک مت جانا

اپنے گیتوں میں پوری طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فلمی گیتوں میں غزلیہ آہنگ کو برقرار رکھنے والوں جیسے مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، ندا فاضلی، جاوید اختر، جاں نثار اختر وغیرہ کی فہرست اس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گی جب تک راحت اندوری کا نام اس فہرست میں نہ درج کیا جائے۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ راحت اندوری کو فلموں کی وجہ سے شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہوئی بلکہ فلم والوں نے ان کی شہرت کا فائدہ حاصل کیا ہے۔ راحت کی فلمی دنیا تک رسائی کا ذکر کرتے ہوئے ایم این غوری لکھتے ہیں:

''مرحوم گلشن کمار نے انہیں پہلی مرتبہ ممبئی آنے کی دعوت دی یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے اندور کے کسی ٹرانسپورٹر نے انہیں کالج میں آ کر گلشن کمار کا فون نمبر دیا اور کہا کہ وہ فوراً ان سے بات کرلیں لیکن راحت بھائی کو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس وجہ سے انہوں نے بات نہیں کی۔ دو چار روز بعد دوبارہ فون آیا تب یہ سوچ کر کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے، انہوں نے ممبئی بات کی۔ گلشن جی نے کہا آپ پہلی فلائٹ سے یہاں آجائیں آپ سے ایک گانا لکھوانا ہے۔ راحت بھائی نے جواب دیا کہ مجھے پنجاب کے مشاعرے میں جانا ہے گلشن جی نے کہا کہ مشاعرہ چھوڑ دیں جتنا بھی نقصان ہوگا وہ دینے کو تیار ہیں۔ لہٰذا راحت بھائی ممبئی کے سفر کیلئے تیار ہوئے یہ پہلا سفر تھا جو راحت بھائی نے فلمی دنیا کیلئے کیا۔ گلشن جی نے ان کا شاندار استقبال کیا اس زمانے میں وہ ایک فلم بنا رہے تھے جس کا نام جانم تھا۔ اس فلم کی ایک سچوایشن پر راحت کی یہ غزل شامل کی گئی:

جھیل اچھا ہے کنول اچھا ہے جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے(۱)

جس زمانے کا یہ ذکر ہے ان ہی دنوں میں راحت کے دیرینہ دوست ٹی سیریز کے مشہور قوال اختر آزاد بھی وہیں کام کرتے تھے ان کی فرمائش پر گلشن کمار نے راحت کو ممبئی بلایا تھا۔ گلشن پہلی

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، ایم این غوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

میں دراز، یارانہ، ہمالیہ پتر، جنٹل مین، اوزار، ناجائز، تمنا عشق اور ناراض وغیرہ بے حد مقبول اور کامیاب فلمیں کہی جاسکتی ہیں۔ قریب آٹھ سال قبل جاوید اختر نے بھی انو ملک کے ساتھ گیت لکھنے کی کوششیں کیں اور وہ بھی آخر کار کامیاب گیت کار بن گئے۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر انو ملک اور جاوید اختر میں بگاڑ پیدا ہوگیا اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ مطلب نکلنے کے بعد آدمی احسانات بھول جاتا ہے جب تک ابتدا تھی تب تک ساتھ رہا پھر الگ الگ ہو گئے۔ جب انو ملک نے یہ دیکھا کہ جاوید اختر نے ساتھ چھوڑ دیا ہے تو انہوں نے راحت سے رجوع کر کے ان سے گانے لکھوانے شروع کئے اور اس فلم کے دو جو باقی گیت رہ گئے تھے راحت اندوری نے لکھے:

راج کمار سنتوشی کی فلم گھاتک کے گیت کار مجروح سلطانپوری تھے اور اس فلم کے میوزک ڈائرکٹر راہل دیو برمن کی وفات کے بعد سنتوشی کو ایسے گانے کی فکر لاحق تھی جو فلم کو صرف کامیاب ہی نہیں بلکہ ہٹ کرادے۔ انہوں نے راحت اور انو ملک کو منتخب کر لیا۔ راج کمار کی یہ فلم گھاتک تھی اور یہ فلم کامیاب رہی اس کا گانا ممتا کلکرنی پر تھا، اس گانے کا یہ بند دیکھئے:

کوئی جائے تو لے آئے
میری لاکھ دعائیں پائے
میں تو پیا کی گلی جیا بھول آئی رے

راحت اور انو ملک کے اس گیت کی بدولت فلم ہٹ ہوگئی۔ کیونکہ اس گیت میں ہی پوری فلم کی روح کا راز مضمر تھا۔ اسی طور پر مشہور پروڈیوسر این چندرا کی فلم بے قابو میں راحت داخل کئے گئے حالانکہ اس فلم کے گانے ندا فاضلی کے لکھے ہوئے تھے لیکن اس کے دو گانے راحت نے تحریر کئے تھے اور انہیں گانوں کی بدولت بلکہ درج ذیل گیت کی وجہ سے فلم کامیاب ہوگئی وہ گانا تھا۔

عمر تیری سولہ نخرے تیرے سترہ
سترہ نخروں والی تیرا ہر نخرہ ہے خطرہ

ہی ملاقات میں راحت کے کلام ان کی بات چیت وغیرہ سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے راحت سے ایک البم کیلئے کچھ گانے بھی لکھوائے۔ اس البم کی موسیقی توصیف اختر نے دی تھی اور گلوکار انورادھا پوڑوال کے تھے۔ یہ البم بہت شہرت پا گیا۔ راحت ممبئی سے آتے وقت کچھ گانے وہیں ٹی سیریز کے دفتر میں چھوڑ گئے تھے۔ جن میں ایک گانے کو مہیش بھٹ کی فلم سر کیلئے انو ملک نے چن لیا تھا۔ دوسرے تمام گانے اس فلم کے شہرت یافتہ قتیل شفائی کے محررہ تھے۔ لیکن راحت اندوری کا گانا سب سے زیادہ پسند کیا گیا اس گانے کا مکھڑا تھا:

خود بھی پاگل ہو گئے مجھ کو بھی پاگل کر دیا

لیکن اس زمانے میں ٹیلی ویژن پر اتنے چینلوں کی آسانی نہیں تھی، سب سے پسندیدہ پروگرام امین سیانی کا مرتبہ گیت مالا ہی صرف ہوا کرتا تھا۔ سر فلم کا راحت کا گانا اول نمبر پر شمار کیا گیا لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ راحت کا یہ گانا قتیل شفائی کے نام غلطی سے منسوب کر دیا گیا اور راحت کا ظرف یہ کہ انہوں نے اس طرف کچھ توجہ ہی نہیں دی احتجاج کیسا۔ لیکن احباب کے بار بار اصرار پر انہوں نے Venus کمپنی والوں سے کہا اور انہوں نے اس بھول کو سدھار دیا اس طرح حق بہ حقدار رسید۔ اس گانے کی مقبولیت کے بعد انو ملک نے منوج ڈیسائی کی فلم رام کیلئے گانے لکھنے کی فرمائش راحت سے کی، اس فلم کو سہیل خاں ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ سلمان خاں ہیرو تھے۔

مشہور اسٹوڈیو محبوب میں اس فلم کا پہلا گانا ریکارڈ کیا گیا لیکن کن ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ فلم رک گئی، کچھ دنوں کے بعد پھر انو ملک کی کوششوں سے ونود راٹھور کی آواز میں یہ گانا سنجے گپتا نے اپنی فلم رام شاستر میں داخل کیا، جہاں اس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد سے راحت اور انو ملک کئی فلموں میں لگاتار کام کرتے رہے۔ پریم شکتی سکنز، غنڈہ راج وغیرہ کیلئے گانے لکھنے کے بعد ہی Venus کمپنی کی فلم ''میں کھلاڑی تو اناڑی'' میں راحت کے گانے شامل ہوئے اور پسند کئے گئے۔

اب سے کچھ دن قبل تک راحت نے قریب دو درجن فلموں کے لئے گیت تحریر کئے ہیں، جن

میں رہ پڑتے تو یقین ہے کہ وہ اور زیادہ کامیاب ہوتے یہ بات بھی راحت کے سلسلے میں بے خوف ہو کر کہی جاسکتی ہے کہ راحت فلم کی بدولت نہیں شہرت پذیر ہیں بلکہ دنیا کو ان سے جو کچھ ملا ہے لائق ستائش ہے، ہوتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

اپنی فلمی دنیا سے وابستگی اور ادبی صلاحیتوں کے تعلق سے حبیب سوز سے ایک ملاقات میں راحت نے یہ وضاحت کی ہے۔

''یہ صحیح ہے کہ فلموں سے ہمارے ملک کی بہترین صلاحیتوں کا تعلق رہا ہے لیکن میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ فلم ہمارے ادباء وشعرا کیلئے معراج ہے ہاں بیس برس پہلے تک جب میڈیا نے اپنے پر اس حد تک نہیں پھیلائے تھے جتنے آج پھیلے ہیں، فلم سے متعلق لوگوں کو شہرت اور پیسہ بٹورنے کا شاندار موقع ملا، آج حالات دوسرے ہیں فلم کے علاوہ بھی دولت اور شہرت کمانے کے ان گنت راستے ہیں، جس سے لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر کے دور میں فلم کی شاعری میں اوچھا پن نہیں آیا تھا جو آج ہے۔ فلم ساز ہدایت کار یہاں تک کہ فلم بیں بھی شاعری کے ذائقے سے واقف تھے۔ ہمارے ان شعرا نے فلموں کے حوالے سے بھی بہترین شاعری عوام تک پہنچائی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ساحر لدھیانوی کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہوں نے فلم والوں سے بہت کم سمجھوتے کئے۔ راجہ مہدی علی خاں، راجیندر کرشن شیلیندر وغیرہ کی مثالیں اس سلسلے میں دی جاسکتی ہیں، جنہوں نے خوبصورت نغمات ہماری شاعری کو دیئے۔ شکیل بدایونی کے یہاں حالانکہ اتر پردیش کے علاقائی گیتوں کی بھرمار رہی لیکن انہوں نے بھی فلموں میں بہت نام کمایا۔ موجودہ دور میں فلموں کی موسیقی اور شاعری میں کافی گراوٹ آگئی ہے اس کا سب سے بڑا سبب ہے Western music جو ہمارے نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ شاعری کی گنجائش ہماری فلموں میں کم بچی ہے۔ پھر بھی جاوید اختر، گلزار، آنند بخشی وغیرہ ایسے گیت ضرور لکھ دیتے ہیں، جو گانوں کو بھلے لگنے کے ساتھ ساتھ اپنے میں تھوڑی بہت شاعری لئے ہوئے ہیں۔ فلموں میں مقبول ہونے

کمپوزر کلیان جی آنند جی تھے اور اس البم کا Music arrangement ان کے بیٹے جو موسیقار بھی ہیں یعنی وجو شاہ تیار کررہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی پرائیوٹ البم میں راحت کا کلام جگ جیت سنگھ، وین سچد یو، روپ کمار راٹھور، سونا می راٹھور، انورادھا پوڑوال اور دوسرے گلوکاروں نے گایا ہے۔ راحت کی فلمی زندگی کا کچھ اور ذکر این ایم غوری نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا۔ حالانکہ یہ مضمون بہت پہلے کا ہے لیکن اس سے راحت کی فلمی زندگی کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے:

''گزشتہ دنوں راحت بھائی کی چند فلمیں اور ریلیز ہوئی ہیں ان میں خوف، اگر تم نہ آتے، دیوانہ تیرے پیار کا، مشن کشمیر وغیرہ ہیں۔ مشن کشمیر نے ملک کے کئی شہروں میں گولڈن جوبلی کی اس فلم کا ایک نغمہ بومبرو بومبرو مال کے بہترین نغمات میں Nominate ہوا۔ اس زمانے میں راحت بھائی وونود چوپڑہ کی فلم Chess مقبول فدا حسین کی فلم مینا اور راج ببر کی فلم کاش آپ ہمارے ہوتے کیلئے نغمات لکھ رہے ہیں۔ ان فلموں کے موسیقار حسب ترتیب عدنان سمیع، اے آر رحمٰن اور آدیش شریواستو ہیں۔'' (۱)

اس میں شک نہیں کہ راحت نے کم وقت میں جتنا کام کیا ہے وہ ریکارڈ کام کہا جاسکتا ہے اور ان کی لگن یہ کہ جو زبان نہیں آتی تھی اس میں خاطر دسترس حاصل کر کے صرف دو ہی ہفتہ میں خود کو اس قابل بنالیا کہ اس میں بخوبی گیت لکھ سکیں یہ بھی ایک ریکارڈ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ورنہ اگر دیکھا جائے تو لوگوں کے تلوے گھس جاتے ہیں کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں کہ راحت کبھی جم کر ممبئی میں نہیں رہے مشاعروں میں جانا ان کی روح میں داخل ہے اور مشاعرے کہیں نہ کہیں آئے دن ہوا ہی کرتے ہیں اور راحت سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن مشاعرہ ترک نہیں کر سکتے وہ ان کی روح کی غذا ان کے جسم ودماغ کی توانائی اور فطری ذوق ہے اسے کوئی کیسے ان سے چھین سکتا ہے۔ ویسے وہ یا ان کی موجودگی عہد حاضر میں مشاعروں کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اگر وہ مستقل طور سے ممبئی

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، این ایم غوری ص ۴۲۵

گانے کیلئے ونود چوپڑہ نے گلزار کا نام سوچ رکھا تھا لیکن جب اس گانے کے لکھنے کا وقت آیا تو ونود چوپڑہ نے راحت سے کہا کہ راحت تم چونکہ پنجابی سے نابلد ہو اس لئے میں یہ گانا گلزار سے لکھوانا چاہتا ہوں۔ راحت کو یہ بات بری لگ گئی اور اس میں تھی بھی راحت کی ہتک۔ راحت نے ونود چوپڑہ سے پوچھا یہ گانا آپ کو کب چاہئے۔ انہوں نے بتایا کہ ریکارڈ ہونے میں ابھی دو ہفتہ کا وقت ہے۔ راحت کا یہ کمال ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس قلیل مدت میں پنجابی کی کافی کتابیں جو وہاں کی شاعری ثقافت سماج اور اس کے رسم و رواج سے تعلق رکھتی تھیں، پڑھ ڈالیں اور خود کو اس لائق کر لیا کہ وہ پنجابی لکھ سکیں ایک مہینہ کے بعد ونود چوپڑہ کو انہوں نے وہ دکھایا جو انہوں نے پنجابی میں لکھا تھا اور اس طرح یہ آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا یہ گانا پنجابی تاثر لئے ہوئے اپنی خوشبو بکھیرتا ہے۔

ونود کی فلم قریب کے بعد بھی راحت کی کئی فلمیں ریلیز ہوئی ہیں، جن میں ہیرو ہندوستانی اور پریم اگن قابل ذکر فلمیں ہیں حالانکہ یہ فلمیں زیادہ نہیں چل سکیں لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ ان کے گیت بہت پسند کئے گئے ویسے کسی گیت کار کے پاس ایسا کوئی نسخہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ پوری فلم کو ایک زندگی دے سکے لیکن جہاں تک اس کے تعلق سے بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ راحت کے گانے کافی مقبول ہوئے اور آج بھی ان کے لکھے ہوئے گانے پسند کئے جاتے ہیں۔

اس موقع پر امیتابھ بچن کارپوریشن لمیٹیڈ کی فلم کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اس فلم کا نام گاہک ہے۔ اس کے میوزک ڈائرکٹر انو ملک اور ڈائرکٹر رویندر پی پٹ (یہ راج کپور کے معاون تھے) راحت کا کہنا ہے کہ اس پانچ گانوں میں راحت کی پیٹھ امیتابھ بچن خود تھپتھپاتے رہے لیکن ABCL امیتابھ بچن کارپوریشن لمیٹیڈ کچھ مالی بحران کا شکار ہو گیا اور مجبوراً اس کمپنی کے کئی پروجیکٹ بند کرنا پڑے۔ ان دنوں فلمی دنیا میں البم بنانے کے کام کی دھن اور زور و شور تھا۔ اس کیلئے بھی راحت کے پاس بہت سے دعوت نامے (Offer) آئے لیکن انہوں نے منظوری نہیں دی۔ کچھ دن بعد ضرور انہوں نے Wings company کیلئے دو پرائیورٹ البم کا کام شروع کیا، خاص بات یہ ہے کہ اس کے

چوری چوری جب نظریں ملیں

چوری چوری پھر نیندیں اڑیں

چوری چوری پھر دل نے کہا

چوری میں بھی ہے مزا

رشتوں کے نیلے بھنور کچھ اور گہرے ہوئے

تیرے میرے سائے تھے پانی پہ ٹھہرے ہوئے

جب پیار کا موتی گرا بننے لگا دائرہ

چوری چوری نظریں ملیں

اس فلم کے دوسرے نغموں میں بھی شاعری کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں، جنہیں کمار شانو نے گا کر ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غم کا موسم گزرتا نہیں

زخم یادوں کا بھرتا نہیں

رات پربت ہے کٹتی نہیں

دن ہے دریا اترتا نہیں

عمر کیسے گزر پائے گی

ایک پل جب گزرتا نہیں

ہاں جدائی سے ڈرتا ہے دل

موت سے تو میں ڈرتا نہیں

فلم قریب میں راحت کے انہماک کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہے کہ راحت کو اس فلم سے کتنی دلچسپی تھی۔ ونود چوپڑہ اس فلم کیلئے ایسا گانا چاہتے تھے، جس میں پنجابی الفاظ ہوں۔ اس

اسی زمانے میں خود دار کیلئے گانے راحت لکھ رہے تھے یہ فلم اقبال درانی کی تھی۔ گانے اتنے من پسند ثابت ہوئے کہ فلم مکمل ہوتے ہی اس کے گانوں کی گونج سارے ملک میں پھیل گئی وہ گانے خاص طور سے یہ تھے۔

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے

اور

دل لگا کر ہم یہ سمجھے زندگی کتنی خوبصورت ہے

اس کے بعد ہی سے راحت فلمی دنیا میں پوری طرح چھا گئے ان دنوں وہ بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائرکٹر کے ساتھ کام کر رہے ہیں، جن میں فیروز خاں، ونود کھنہ، ڈیوڈ دھون، راج کمار سنتوش، عباس مستان، چندرا، جی پی سپی، ونود چوپڑا، اقبال درانی، عزیز سجاول لارنس ڈیسوزا منصور خان وغیرہ شامل ہیں۔

راحت کی فلمی زندگی میں ایک زبردست موڑ فلم قریب کے ساتھ آیا ونود کی اس فلم کا باکس آفس پر نہیں کہا جا سکتا کیا حشر ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انو ملک اور راحت کے ناموں کی ہر طرف جے جے کار ہونے لگی۔ اگر یہ فلم بھی ہٹ ہو جاتی تو راحت اور انو ملک کی ہمراہی فلمی تاریخ کو ایک نیا رخ ایک نئی جہت دے سکتی تھی۔ یہ فلم لکھتے وقت رات دن راحت پر فلم قریب ہی کی دھن سوار رہتی تھی۔ یہ عام خیال ہے کہ اتنی لگن اور جوش اور محنت شاقہ بہت کم گاروں میں نظر آتی ہے، خود راحت کا کہنا ہے کہ جو کام ریکارڈ نہیں ہو سکا وہ اعلیٰ درجہ کا تھا لیکن فلم والوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں ان کے پیش نظر کہانی اور سچویشن کے ساتھ دیکھنے والوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال رہتا ہے۔

پھر بھی فلم قریب کے گیتوں نے راحت کو ایک خاص پہچان اور مقبولیت دی۔ ان کے لکھے ہوئے گانے عام و خاص دونوں نے پسند کئے۔ ۱۹۹۸ء میں اسکرین ویڈیو کان کیلئے جو گانا چنا گیا تھا ملاحظہ کیجئے:

والے دو شاعر شکیل اور آنند بخشی کا معاملہ لگ بھگ یکساں ہے، جہاں شکیل نے اتر پردیش کے لوک گیتوں کو توڑ پھوڑ کی آنند بخشی نے پنجابی لوک گیتوں کو بیچ بیچ کر خوب نام اور مال کمایا۔ ایسے بخشی نے اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جب کہ شکیل اچھے خاصے شاعر تھے۔ فلموں کے علاوہ وہ مشاعروں میں بھی مقبول تھے ان کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

''مجھے فلموں میں کچھ ایسا لکھنا ہوتا ہے جو فلم کی ضرورت کے مطابق ہو۔ میں نے بہت کم وقت میں بڑے بڑے بینرز کی فلمیں لکھی ہیں اس کے باوجود بھی کوشش کی ہے کہ پھوہڑ پن اور سستے گانوں سے اپنے آپ کو بچاؤں، خدا کا شکر ہے کہ میرا کام سب لوگوں نے پسند کیا۔ میرے بیشتر فلمی نغمات مقبول بھی ہوئے ہیں۔'' (۱)

ایک دوسرے موقع پر شکیل اختر سے گفتگو کے دوران انہوں نے کہا:

''فلم انڈسٹری میں سرف کامرشیل ہٹ کو کامیاب سمجھا جاتا ہے میں نے ۳۰ فلموں کیلئے گیت لکھے ہیں، ان میں زیادہ تر فلمیں Box office پر اپنا رنگ نہیں جما سکیں ایسا نہیں کہ یہ فلمیں بکواس تھیں، اصل میں ملٹی چینلس کے زمانے میں ناظرین کو دلچسپی اور پسند کا احاطہ کرنا بے حد مشکل کام ہے گزشتہ پانچ سات برسوں میں کیسی کیسی خوبصورت فلموں کو لوگوں نے Reject کر دیا یہ حیرت انگیز بات ہے کہ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں اور خوش بھی۔ میں نے بہت کم عرصے میں بہت کام کیا ہے۔ میری فلمیں چلی ہوں یا نہ چلی ہوں میرے گیت Hit ہوتے ہیں۔ جہاں تک مقام کا سوال ہے تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ فلمی دنیا میں مقام صرف جوڑ توڑ سے حاصل ہوتے ہیں جتنا کام کر سکتا ہوں اس سے زیادہ مصروفیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

راحت کی ان تمام گفتگوؤں کے باوجود جہاں تک دیکھنے میں آیا ہے ان کا ہر بڑے بینر نے استقبال کیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے مشاعروں کے ذوق وشوق کی وجہ سے جم کر ممبئی میں نہیں رہے اس کے

---

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز

باجود جب بھی فلم والوں کو اچھی شاعری کی ضرورت ہوئی راحت کی تلاش ضرور ہوئی۔ انہوں نے بڑے بڑے عہد حاضر کے مثلاً اقبال درانی، مہیش بھٹ، راج کمار سنتوشی، عباس مستان، این چندرا، ونود چوپڑہ، ڈیوڈ دھون جیسے اہم اور مصروف ترین ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا ہے لیکن اس کے باوجود گھٹیا قسم کے گیتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھا لیکن پھر بھی فلم والوں نے انہیں عزت دی اور کام بھی دیا۔

سچ بات یہ ہے کہ راحت صرف اپنے شوق کی خاطر سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی کی جستجو میں وہاں پہنچے ہیں ان کے ذہن میں کسی قسم کے جلب منفعت کا خیال دور دور تک نہیں رہا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ فلم میں اپنی پسند ناپسند کو ہر وقت ملحوظ رکھتے ہیں اور اسی طرح کے گیت لکھتے ہیں جو غزل کے آہنگ کو قائم رکھ سکیں۔ ان کو جتنے آفرس ملے اگر سب کو انہوں نے قبول کرلیا ہوتا تو بغیر کسی غلطی کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے کئی گنا زیادہ کام کر چکے ہوتے جتنا انہوں نے کیا ہے۔ مگر یہ انہیں کسی طرح منظور نہیں وہ ہر گیت میں شعری فضا کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تا کہ وہ الگ سے اپنی پہچان قائم کرسکیں حالانکہ انہوں نے ویڈیو البم کیلئے بہت کچھ لکھا ہے لیکن پھر بھی بہت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے کھل کر کہنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی کہ فلمی دنیا میں کام کرنے کا سلیقہ ہو نہ ہو جی حضوری ضرور آتی ہو۔ یہی وہاں کی زندگی کی سب سے بڑی سند ہے اور راحت اس سے کوسوں دور ہیں۔ ان کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ فلمی زبان صاف ستھری اور آسان ہونا چاہئے تا کہ عوام تک سمجھ سکیں اور گنگنا سکیں۔

راحت اندوری کے فلمی زندگی کے تعلق نیز متعدد نقادان فن اور دانشوروں کی آرا کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ انہوں نے شاعری کو امانت کی طرح محفوظ رکھا اور مشاعروں کی دلچسپیوں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا حالانکہ اس طرح ان کو مالی منفعت تو خاطر خواہ نہ مل سکی لیکن اپنی شاعری اور انداز بیان پڑھنے کے ڈھنگ کی بدولت انہوں نے عالمی شہرت اور پذیرائی حاصل کی ہے۔ وہ ان کو قطعی پیسے کی خاطر بھاگنے کی صورت میں اس حد تک نہ حاصل ہوسکتی، جو ان کو ملی ہوئی ہے نیز یہ کہ بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے فلمی دنیا سے جو حاصل کیا وہ اس سے بہت کم

ہے جوانہوں نے فلم کو دیا ہے۔

ایک موقع پر حبیب سوز سے ایک ملاقات پر راحت اندوری نے فلموں سے اپنی وابستگی کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں بڑی تفصیلی گفتگو کی تھی جسے اس موقع پر پیش کرنا راقم کے خیال نامناسب نہ ہوگا اس گفتگو سے راحت کی فلم سے وابستگی اور خود راحت کے فلم کے عمومی مزاج میں خودکو نہ ڈھالنے کی بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے یعنی اس دنیا میں پہنچ کر بھی وہ وہاں کی چکا چوند میں گم نہیں ہوئے اپنی شناخت ادب کی شناخت قائم رکھی اور کامیاب بھی ہیں۔شعر ملاحظہ کیجئے جس کے راحت اندوری مصداق ہیں:

بگیر ترک تعلق دلاز مرغابی

کہ درآب شود چوں برخاست خشک پر برخاست

(جس طرح سے مرغابی کا تعلق پانی سے رہتا ہے کہ پانی سے نکل کر جب وہ پرواز کرتی ہے تو اس کے پر خشک ہوتے ہیں، (تعلق کے اسی طریقے کو اپنانے کی ضرورت ہے) راحت کا تعلق بھی فلم سے کچھ اسی نوعیت کا ہے ان کا جواب ملاحظہ کیجئے:

راحت اندوری کی اب تک لگ بھگ چالیس بیالیس فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں، ان کے وسیلے سے ان کو دام بھی اور نام بھی ملے لیکن وہ اس سے خاطر خواہ مطمئن نہیں ہیں ان کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اب اردو کا وہ ماحول نہیں رہا، جو شکیل ساحر اور مجروح کے زمانے میں تھا کیونکہ اس زمانے میں ڈائرکٹرز جیسے بی آر چوپڑہ، محبوب کے آصف اردو شعر و ادب کے رسیا تھا۔مختصر یہ کہ فلموں میں اتنی شہرت اور مقبولیت کے باوجود راحت اسے شاعری کے حوالے سے کوئی وجہ افتخار نہیں تصور کرتے ہیں۔

حرف آخر

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ راحت اندوری کے بزرگ خاندان شہر مالوہ کے مضافاتی علاقہ ہانسل پور کے باشندے تھے جو اپنی دیانت، محنت و مشقت کی بدولت علاقہ بھر میں معزز و معتبر گردانے جاتے تھے، جس زمانے میں راحت نے اندور میں آنکھ کھولی وہ زمانہ ان کے والدین کے ادبار، پریشان حالی اور تنگی معاش کے اعتبار سے عسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا گھر کے حالات نے شروع ہی سے راحت کو محنتوں کا عادی بنا دیا تھا چنانچہ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ خود کو مختلف کاموں میں لگائے رکھتے تھے۔

راحت کو شعر گوئی کا شوق اوائل عمری ہی سے قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا اپنے ہی کہنے کے مطابق انہوں نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا اور انیس سال کی عمر میں پہلی بار انہوں نے مشاعرے میں غزل پیش کی تھی اس وقت وہ ترنم سے پڑھتے تھے لیکن جلدی ہی ترنم کو اپنی افتادِ طبع کے موافق نہ پا کر انہوں نے ترنم کے بجائے تحت اللفظ پڑھنے کی شروعات کی اور اس میں اپنا ایک ایسا خاص انداز اختیار کیا کہ اس کی نقالی آج تک کوئی نہ کر سکا اور ان کا طرز پیش کش اب تک انہیں کے دم سے قائم ہے۔ شعر و شاعری مشاعروں کے شوق اور سرگرمیوں کی وجہ سے ان کی تعلیم ضرور متاثر ہوتی رہی، ان کے شوق تعلیم اور پکے ارادوں نے انہیں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سندات کا اہل بھی بنا دیا۔

راحت نے ایک سچے فنکار کی طرح اپنے ذہن کے دروازوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ کثرت مطالعہ اور نظر بیدار نے انہیں نئے تجربات بخشے۔ ایک حساس فکر و نظر کے ساتھ وقت کی ہر دھڑکن پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے راحت اپنے آئینہ قلب و نظر کی گرد صاف کرتے ہوئے برابر آگے بڑھتے رہے۔

جس زمانے میں راحت نے شاعری کا آغاز کیا ان کے وطن اور گردو پیش کی شعری فضائیں کلاسیکی طرز شعر گوئی کی دلدادہ تھیں لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد احتیاج زمانہ کے لحاظ سے روش قدیم سے الگ ہٹ کر مسائل حیات کی ترجمانی کو کچھ بزرگ اور نوجوان شعرا نے اپنی توجہ کا مرکز بنانا شروع کیا اور اندور کے قدیم روایتی طرز کو نیا رنگ دینے کی کوششیں بھی اپنا سر اٹھانے لگیں اس گروہ میں راحت بھی پیش پیش شامل تھے۔

راحت شاعری کو محض وسیلہ تفنن طبع و اظہار جذبات ہی کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے وہ مستقل فن سمجھتے تھے اس لئے اس وقت اندور کے مشہور شاعر قیصر اندوری سے انہوں نے مشورہ سخن شروع کیا۔ لیکن ان کا مزاج اپنے استاد کے مزاج شاعری سے ہم آہنگ نہ ہوسکا کیونکہ راحت کا مزاج اندور کے قدیم شعری مزاج سے الگ تھا کچھ دنوں تک راحت نے عزیز اندوری کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ لیکن بہت جلد اپنے مطالعہ مشاہدے اور تجربات کو اپنا رہبر بنا کر وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔ شروع میں راحت کی نئی طرز سے اجنبیت کا اظہار ضرور کیا گیا پھر بھی وہ کچھ پرواہ کئے بغیر مقامی محافل اور مشاعروں میں شامل ہوتے رہے۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی مشاعروں کی روایت قدیم ہے لسانی تہذیب کے لحاظ سے یہ خیال ہمیشہ پیش پیش رہا ہے کہ شاعری میں آسمان کی بلندیوں سے اتر کر ارضی مسائل سے گفتگو ہو اور مشاعرہ مجموعی طور سے انسانی جذبات، احساسات و نظریات کے اظہار کا ایک کارگر وسیلہ ہوتا ہے اس لحاظ سے کہ شعر کی سریع الاثری مسلمہ ہے اور راحت کی ارضی مسائل سے گفتگو ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ راحت کی شعری صلاحیتوں نے اپنے قدم جمانا شروع کئے اور آج وہ عالم ہے کہ

مقبولیتوں اور شہرتوں کے بام عروج پر وہ فائز ہیں۔

اردو شاعری پر روایتی رنگ غالب رہا ہے، راحت نے اس رنگ سے بغاوت کی اور فولادی عزم وحوصلہ مسائل حیات وسماج کی ترجمانی کرنے میں اٹل رہے جس کا اچھا نتیجہ بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا رہا۔ اس طرح اور بھی حوصلہ پاکر وہ اپنے انداز وطرز اظہار میں ثابت قدم رہے اور اپنی فکر رسا، جودت طبع، بلند تخیل نگارہ دوررس، کثرت مطالعہ، مشاہدہ اور وقت کی ہر آہٹ پر کان دھرتے ہوئے اور اسے موضوع شاعری ٹھہراتے ہوئے نہ صرف ملک بلکہ دنیا کے سبھی ملکوں میں جہاں مشاعرے ہوتے ہیں، راحت نے اپنے نام اور کلام کا جھنڈا نصب کر دیا ہے اور آج ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔

راحت کی زبان عام فہم سادہ اور صاف ہوتی ہے۔ فارسی عربی کے بھاری بھرکم الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں، کبھی انہوں نے قدیم لب ولہجہ اور انداز نہیں اپنایا اور پورے عزم واعتماد سے اپنی الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ وہ ظلم وتشدد، عدم مساوات ناروا سلوک، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ کمر بستہ رہتے اور للکارتے ہیں۔ وہ صرف مشاعرے ہی بلکہ سامعین منتظمین اور شریک شعرا کا مرکز نگارہ بن گئے ہیں۔ ان کا شعری سفر خوشبو کے سفر کی طرح عطر بیزی کرتا ہوا برابر جاری وساری ہے۔ ان کا انداز پیش کش ایسا دلپذیر ہے کہ جب وہ باغیانہ پن کے ساتھ شعر پڑھتے ہیں تو ایسا سحر زدہ سا ماحول ہو جاتا ہے کہ اس کی نفی کر سکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی۔

شہرت اور پیسہ کہ خاطر راحت نے کبھی اپنی انا کا سودا نہیں کیا ان کے اندر کا شاعر جب ستم رسیدہ لٹے پھنکے مظلوم مسلمان کے روپ میں سامنے آتا ہے تو اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کا سارا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے طرز وسلیقہ کی بدولت ان میں مایوسیوں کی لہر نہیں سر اٹھاتی بلکہ کچھ کرنے اور کر گزرنے کا حوصلہ ملتا اور ظلم کے اندھیروں سے نکلنے کو دل بے قرار ہونے لگتا ہے۔

راحت ایک وطن پرست شاعر ہیں اس لئے بے خوف ہوکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے اس لئے کہ اس کے چپہ چپہ پر ہمارے اسلاف کے قدموں کے نشانات ہیں۔ وہ یہ احساس بھی توانا کرتے ہیں کہ ہم دوسرے درجے کے شہری نہیں بلکہ ہم وہ ہیں جس نے ساری قوم کو تہذیب سکھائی ہے۔

راحت کی شاعری میں تصنع، ریا، خوشامد، مصلحت پسندی، موقع پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہے ان کے اشعار ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولتے ہیں ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ یہ باور کراتا ہے کہ وہ راحت کے زیر نگیں ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ جو حسب ضرورت قوت اظہار نہ پانے کے سبب گونگے لگتے ہیں راحت کے یہاں ان کو قوت گویائی میسر آجاتی ہے اور وہ پوری تاب وتوانائی سے اپنے اثر مرتب کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ راحت کے یہاں محض مسائل زدہ اور روکھے سوکھے اشعار کی کثرت ہے بلکہ ان کے اشعار میں تنوع اور ایسی سرمستی جا بجا بکھری ہوتی ہے، جو غزل کو غزل بناتی ہے۔

راحت ایک کامیاب غزل گو اور ہر تصنع اور بناوٹ سے پاک کھرے اور بےلوث انسان ہیں۔ اگر ایک طرف انہوں نے اس قسم کے اشعار سنائے کہ ''یہ شیر وہ ہیں جو سرکس میں کام کرتے ہیں'' یا ''بہروں کو بھی شعر سنانا پڑتا ہے'' جیسے موضوعات چھیڑ کر ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی ''شاخ سحر پر مہکے پھول اذانوں کے'' یا ''دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی'' جیسے معیاری کلام سے ادب کے ٹھیکیداروں کا منہ بھی بند کر دیتے ہیں یا جو راحت کو صرف مشاعروں کا شاعر یا ڈھونڈورچی کہنے پر تلے ہوتے تھے اور راقم یہ کہنے میں چنداں پس و پیش نہیں کہ راحت اندوری کی شاعری نہ صرف آج کی سچائی ہے بلکہ کل کی بھی سچائی رہے گی۔ راحت کا یہ خیال درست ہے کہ آج اردو مخالف ماحول میں مشاعروں کی وجہ سے اردو کا دیا روشن ہے، جس طرح غزل کی گائیکی نے اردو کو مقبول بنانے میں معاونت کی۔ یہی کام مشاعروں نے بھی کیا ہے، چنانچہ مشاعرے ہی وہ ادارے ہیں، جو اردو کو غیر اردو داں حلقے میں بھی پہنچا رہے ہیں۔

آج کل راحت اندوری فلمی دنیا سے جڑے ہوئے ہیں لیکن وہ کبھی نہیں یہ سمجھتے کہ فلموں سے وابستگی کوئی خاص بڑا اعزاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں نے اس کی بدولت دولت اور شہرت دونوں خوب کمائی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ نام اور دام کمانے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں راحت نے صدق دل سے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ پہلے کے فلمی شاعری کرنے والوں نے ادب و شعر کا گلا نہیں گھونٹا بلکہ بہترین نغمات اور شاعری فلموں کو دی ہے۔ آج وہ بات نہیں رہی راحت نے سستے اور بیہودہ گانوں سے اپنے دامن شعر کو ہمیشہ پاک رکھا۔ آج ان کی بہت سی فلمیں سامنے آچکی ہیں، جو کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ راحت نے کم وقت میں جتنا کام کیا، وہ بہر حال ایک ریکارڈ ہے۔ اس میں ان کی ہمسری کرنے والا نظر نہیں آتا ہے اور لطف یہ کہ وہ کبھی مستقل جم کر ممبئی میں نہیں رہے۔ ہفتہ دو ہفتہ بس وہ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مشاعرہ نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ ان کی روح کی غذا ہے۔ راحت کے بارے میں حرف آخر کے طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ راحت اندوری کی شاعری پوری طرح سے کامیاب شاعری ہے۔ مشاعروں میں کلمات تحسین، فلمی شاعری اور ان کے فن پاروں میں خلاقانہ فکری بصیرتوں، فکری توانائیوں، بیان کی دلآویزیوں اور زبان کی فصاحتوں، جدت ادا اور متنوع فکر و خیال اپنی تمام تر تہہ داریوں کے ساتھ لطف محاکات اور رنگارنگ وسعتوں کے ساتھ عصری صداقتوں کا ہر صاحب نظر نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے ادبی مرتبہ اور شعری صلاحیتوں سے صرف نظر ممکن نہیں ہے ان کی شعر کی پیش کش ایسی دلفریب اور انوکھی ہے، جس کی نقالی ممکن نہیں ہے اور اسی لئے ان کے کلام اور لہجہ کی چوری بھی ممکن نہیں ہے۔

کتابیات

۱ چھوٹے بھائی جان۔عادل قریشی۔ لمحے لمحے بدایوں۲۰۰۲ء ص ۴۲۶

۲ مضطر مجاز۔حیدرآباد۔ لمحے لمحے بدایوں۲۰۰۲ء ص ۴۳۳

۳ خاکہ۔ظفر احمد نظامی۔ لمحے لمحے بدایوں۲۰۰۲ء ص ۱۱

۴ تھیکے لہجے کا شاعر۔ڈاکٹر عزیز اندوری۔راحت اندوری شخص اور شاعر مکتبہ دین وادب لکھنؤ ۲۰۰۲ء ص ۵۸

۵ راحت اندوری سے ایک ملاقات۔حبیب سوز۔ لمحے لمحے بدایوں۲۰۰۲ء ص ۴۳۸

۶ ہمارے مشاعرے۔مشمولہ تنقیدی تحریریں۔ڈاکٹر عزیز اندوری

۷ اندازے۔فراق گورکھپوری ص ۱۱

۸ علمہ البیان۔شکیل گوالیاری۔ لمحے لمحے بدایوں۲۰۰۲ء ص ۱۹۶

۹ مضطر مجاز۔ماخوذ از امکان لکھنؤ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء ص ۲۸

۱۰ راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک۔ڈاکٹر محبوب راہی امکان لکھنؤ ص ۳۵

۱۱ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات ۔ وامق جونپوری ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۵

۱۲ کالے گلاب کی خوشبو ۔ ڈاکٹر بشیر بدر ۔ مطبوعہ فاران کھمریا بنارس ۳۵

۱۳ تاثرات ۔ از پروفیسر اے اے عباسی

۱۴ مجموعہ کلام دھوپ دھوپ ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۷۹ء

۱۵ مجموعہ کلام ناراض (ہندی) راحت اندوری ۲۰۰۹ء

۱۶ مجموعہ کلام رت (ہندی) ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۸۳ء

۱۷ مجموعہ کلام میرے بعد (ہندی) ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۹۰ء

۱۸ مجموعہ کلام پانچواں درویش ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۹۲ء

۱۹ بائیں کاندھے کا فرشتہ ۔ معراج فیض آبادی ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۵۴

۲۰ میر آئیڈیل راحت اندوری ۔ جوہر کانپوری ۔ ص ۳۷۶

۲۱ راحت میرا یار ۔ انور جلال پوری روشنی کے سفیر ۲۵ جون ۱۹۹۰ء ص ۱۹۲

۲۲ اقبال کا اجتماعی تبصرہ ۔ اقبال خدا کرے کے چند مقالات ۔ ناشر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اپریل ۱۹۷۷ء ص ۶۱

۲۳ ماہنامہ شب خون الہ آباد مناظر عاشق ہرگانوی جون ۱۹۶۸ء ص ۸

۲۴ جدید شاعری اور اس کے خدوخال اور وسائل ۔ الہ آباد ص ۲

۲۵ جدید شاعری ایک سمپوزیم ماہنامہ کتاب لکھنؤ سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۸

۲۶ اردو شاعری ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک مطبوعہ تنقیدی تحریریں ڈاکٹر راحت اندوری ص ۱۳۵

۲۷ جدید شاعری ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص ۲۵۲

۲۸ زندگی کی تخلیق کا شاعر ۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی

۲۹ مضمون نگار اسعد بدایونی۔ راحت اندوری حیات اور شاعری ۲۰۰۲ء ص ۱۵۲

۳۰ جرأت انکار کا شاعر۔ از شاعر جمالی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۱۴

۳۱ مضمون ''کوئی صحرا چھپا ہے''۔ احمد کلیم فیض پور ص ۳۳۶

۳۲ مضمون ''بے جگر شعلہ بیان''۔ عقیل نعمانی۔ راحت اندوری حیات اور شاعری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۳۳۸

۳۳ مضمون ''نئی غزل کا قلندر''۔ پروفیسر عنوان چشتی۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۱۰۳

۳۴ مضمون ''تعارف سے تعلق تک''۔ انور جلال پوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۹۲

۳۵ مکتوب شاعر جمالی بنام راحت اندوری مملوکہ راحت اندوری

۳۶ عبقری اور منفرد غزل گو راحت اندوری از اثر صدیقی راحت اندوری شخص اور شاعر

۳۷ راحت بھائی اور فلم مضمون ایم این غوری راحت اندوری نمبر ص ۴۱۳

SHAIKH RAHATULLAH QURAISHI
"RAHAT INDAURI"
HAYAT AUR SHAYARI

Thesis

SUBMITTED TO

DR. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY

FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

HARI PRAKASH SRIVASTAVA

Under Supervision of

Dr. Mohd. Naseem Khan

Head

DEPARTMENT OF URDU

B.B.D.P.G. COLLEGE PARUIYA ASHRAM,

DISTT. AMBEDKAR NAGAR

2011

Dr. MOHD. NASEEM KHAN
Head Deptt. of Urdu
Baba Barua Das P.G. College Paruiya Ashram
Distt.: Ambedkar Nagar (U.P.)
Conv. - Deptt. of urdu, Dr. R.M.L. Awadh University Fzd.
Residence
Moh.Bazidpur, Post Jalalpur, Pin-224149
Distt.: Ambedkar Nagar (U.P.), Mob.: 9415661096

ڈاکٹر محمد نسیم خاں
صدر شعبۂ اردو
بابا بروا داس پوسٹ گریجویٹ کالج پروئیا آشرم امبیڈکر نگر
کنوینر : شعبۂ اردو، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی فیض آباد
رہائش گاہ : محلہ بازید پور، پوسٹ جلالپور، ضلع امبیڈکر نگر

Ref.

Date: 06/11/2012

CERTIFICATE

This is to certify that the Thesis entitled "Shaikh Rahtullah Quraishi, Rahat Indori, Hayat aur Shayari" has been completed by Hari Prakash Srivastva, under my supervision.

It is further certified that it is an original work to the best of my knowledge. It has not been previously or presently submitted to any other university for the purpose.

M. H. Khan
Dr. Mohd. Naseem Khan
Head, Deptt. of Urdu
Baba Barua Das, P.G. College
Paruiya Ashram, Ambedkar Nagar

181

شیخ راحت اللہ قریشی ''راحت اندوری''
حیات اور شاعری

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

پیش کردہ

ہری پرکاش سریواستو

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، فیض آباد (یوپی)

ڈاکٹر محمد نسیم خاں

صدر شعبۂ اردو

بابا برواداس پوسٹ گریجویٹ کالج

پرویا آشرم، ضلع امبیڈکر نگر

۲۰۱۱ء

راحت اندوری

فہرست

پیش لفظ

ابتدا ہی سے اردو سے لگاؤ اور خاص کر اس کی شاعری کی ہمہ گیریت سے متاثر ہو کر میں نے حرز جان بنائے رکھا اور ایم اے تک تعلیم حاصل کر سکا۔ راحت اندوری کو میں نے اکثر مشاعروں میں سنا ان کے کلام اور انداز پیش کش نے گویا مجھے مسحور سا کر رکھا تھا۔ ایک خواہش دل میں گدگدانے لگی کہ اس بلند پایہ شاعر کی شاعرانہ عظمتوں پر کوئی مقالہ لکھ سکوں اس خیال کے تحت میں نے راحت اندوری کی جو کتابیں مجھے دستیاب ہو سکیں ان کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کی فکر وشعور رچاؤ، سادگی بیان کا میں قائل تو پہلے ہی سے تھا چنانچہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے میں نے ان کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کام کرنے کی ٹھان لی۔ اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد نسیم خان صاحب صدر شعبہ اردو سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا ''ہری پرکاش تمہارا ارادہ بہت اچھا ہے۔ مگر تحقیقی کام میں ایڑی کا پسینہ چوٹی تک آنے کا حوصلہ بھی ضروری ہے۔'' چنانچہ موصوف ہی کی نگرانی میں میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جتنا مطالعہ کرتا اور موصوف سے رہنمائی ملتی میں اس پر عمل پیرا ہوتا رہا۔ موضوع کی وسعتوں کا اندازہ کر کے اور اس پر سیر حاصل بحث کیلئے میں نے اپنے موضوع کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا اور ہر گوشے سے راحت کی شخصیت اور فن کو پرکھنے کی کوشش کی۔ مقالہ کے پہلے باب میں راحت اندوری کے سوانحی حالات، خاندان، تعلیم، شاعری کی ابتدا،

مشاعروں میں شرکت (ملکی اور بیرون ملک کے مشاعرے) اعزازات ، عادات وخصائل واطوار، شادی ،اولاد اوران کی دوسری مختلف سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی تاکہ ان کی شخصیت وفکروفن کا کوئی گوشہ تشنۂ تحریر نہ رہ جائے۔

باب دوم میں راحت اندوری کے عہد اوراس کا ادبی پس منظر حتی الوسع مفصل طور پر تحریر کرنے کی کوشش کی ہے اوراس امر کا بخوبی لحاظ برتا ہے کہ جو بھی میرے زیرِ قلم آئے وہ تحقیقی معیار پر کھرا بھی ہو نیز ہر طرح کی افراط وتفریط ،بغض وجانب داری کا کہیں شائبہ بھی نہ رہ جائے۔

باب سوم راحت اندوری کی شاعری سے متعلق ہے بحیثیت شاعران کو پرکھنے کیلئے بحیثیت غزل گو جوان کی مخصوص اور واحد صنف سخن ہے، کے مخصوص خدوخال اوراس کی انفرادیت، تخیل، دل کو چھو لینے والی کیفیت ،اثر آفرینی سادی سی زبان میں بڑی بات کہہ جانے کا ہنران کے کلام پر ترقی پسندی کا عکس، ان کا پرزور احتجاجی لہجہ اور بے باک پیش کش ان سب کا کھل کر جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں راحت اندوری کی دوسری اصناف سخن میں فکراور طبع آزمائی اوران کی شاعری کے موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم میں راحت اندوری کی مجموعی علمی اورادبی خدمات کا جائزہ لے کران کی نگارشات کی قدرو قیمت کا تعین ،ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ ان کے کلام کے آئینہ میں حتی الامکان بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم راحت اندوری کی فلمی دنیا سے وابستگی اوران کی کارگزاریوں کے ذکر پر مشتمل ہے، راحت اندوری نے فلمی دنیا کو کیا دیا اوران کا مقصد اور فلمی شاعری کے فروغ کے لئے ان کی مساعی جمیلہ اور وہاں کے ماحول سے انہوں نے کیا اخذ کیا اور کیا دیا ان سب باتوں کا ذکر اس باب میں شامل ہے۔

باب ہفتم (حرف آخر) اس باب میں مختصراً اس پورے مقالے کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے تاکہ بیک نگاہ راحت کی شخصیت اوران کے کلام کی تصویر نظر کے سامنے آسکے۔اس کے بعد کتابیات کی فہرست

شامل مقالہ ہے۔ راحت سے متعلق جو کتابیں، رسائل اور جرائد، خطوط اور شخصی گفتگو کے جو حوالے راقم
کے مطالعہ میں رہے ان سب کے اسماء شامل ہیں۔ ایسی بہت سی کتب و ماخذات جو زیر مطالعہ رہے لیکن
ان کے اقتباسات شامل مقالہ نہیں ہیں، ان کے اسماء فہرست میں نہیں ہیں۔ یہ میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ
اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد نسیم خاں صاحب صدر شعبہ اردو جو اس مقالے کے نگراں بھی رہے ہیں تہہ
دل سے شکریہ ادا کروں، جنہوں نے میری رہنمائی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مجھے صرف موصوف نے
زبانی حوصلہ نہیں دیا بلکہ ان کی نگاہ میں راحت سے متعلق جو کتب یا رسائل جو بھی ہو سکے اور ان کی فراہمی
میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور ان کی دستیابی کی کوشش کی اور اپنی دلی حوصلہ افزائیوں سے میرے اسپ شوق
کو مہمیز کرتے رہے۔ باقر مہدی صاحب استاد شعبہ اردو کا میں سپاس گزار ہوں موصوف نے اپنی
مصروفیات کے باوجود جب بھی میں گیا انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور جو ان سے بن پڑا مجھے
موضوع سے متعلق دستیاب کرایا۔

عالمی پیمانے پر مقبول اور مشہور زمانہ شاعر و ناظم مشاعرہ جناب انور جلال پوری میرے خصوصی
شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے راحت کے ایسے شعر وسخن کے بحر بے کراں کو میری تحقیق کے لئے زور دیا
میرے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ انور صاحب کی قربت و شفقت مجھے حاصل ہے ان ہی کی جد و جہد اور
حوصلہ افزائیوں کی بدولت میں اس تحقیقی کام کے لئے خود کو مستور اور ہمہ تن مصروف و مشغول کر سکا اور
جب بھی میں نے اپنی تحقیق کے موضوع اور ماخذات کے سلسلے میں موصوف سے مشورہ کیا تو انہوں نے
مجھے راحت کی شخصیت اور فن سے متعلق ایسی آگاہی بخشی کہ میں ان پر تحقیق کیلئے کمر بستہ ہو گیا۔ انور
صاحب نے صرف زبانی معلومات ہی نہیں دیں بلکہ ایسے ماخذات تک میری رسائی صرف اور صرف انہیں
کی بدولت ہو سکی جو میرے کیسۂ خیال میں بھی نہیں تھیں۔ اس طرح آج میں اپنا مقالہ پیش کر سکنے کا اہل
ہو سکا ہوں۔ میں اپنے قلب و روح کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے دل کی ہر دھڑکن ان
کی سپاس گزار ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوران تحقیق بہت سے کرم فرماؤں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا،

حوصلہ افزائی کی اس موقع پر سب کے نام گنوانا تو گفتگو کو طول دینے کے مترادف ہے میں ان سب ہی حضرات کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہر طرح کا تعاون دیا جس کی بدولت میں اپنا مقالہ ارباب فکر ونظر کی خدمت میں پیش کر سکنے کا اہل ہو سکا ہوں۔

ہری پرکاش سریواستو
متعلم شعبہ تحقیق
بی بی ڈی پی جی کالج
پروئیا آشرم، امبیڈکر نگر

باب اول

راحت اندوری
کے
حالات زندگی

(داہنے سے) راحت اندوری، مشہور ناظم مشاعرہ انور جلال پوری

۲۱/جون ۲۰۰۸ء

عمرہ سے واپسی پر

(داہنے سے) منظر بھوپالی، راحت اندوری

راحت اندوری کے اسلاف خاندان شہر مالوہ کے مضافاتی علاقہ کھڑیل کے درمیان واقع قصبہ ہانسل پور کے باشندے تھے ان کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا۔ اپنی حد درجہ لگن محنت و مشقت کی وجہ سے وہ اپنے علاقہ کے لائق احترام افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔

راحت کے جد امجد غلام محمد ہانسل پور سے ترک وطن کر کے سون کچھ چلے آئے تھے یہاں بھی ان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ اس کے علاوہ مکانات کی تعمیر خرید و فروخت کا بھی ان کا کاروبار تھا۔ غلام محمد کی شادی قصبہ کملا پور میں ہوئی تھی ان کے دو بیٹے حشمت اللہ اور عبدالحفیظ تھے۔ حشمت اللہ کی شادی سون کچھ میں ہوئی تھی ان کے بطن سے ایک بیٹا رفعت اللہ اور ایک بیٹی تھی۔ یہی رفعت اللہ راحت اندوری کے والد گرامی تھے۔ راحت سے بڑی تین بہنیں اور ان سے چھوٹا ایک بھائی عادل قریشی ہے۔ ان کے سلسلہ نسب کو یوں نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

راحت کے والد رفعت اللہ کی شادی دیواس میں منظور حسین کی بیٹی مقبول بی سے ہوئی تھی۔ منظور حسین دیواس کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ یہ دیواس میں ہی محکمہ پولیس میں بعہدۂ انسپکٹر فائز تھے۔

راحت کی ولادت یکم جنوری ۱۹۵۰ء میں اندور میں ہوئی تھی۔ راحت اندوری کا پورا نام شیخ راحت اللہ قریشی ہے جس زمانے میں راحت کی ولادت ہوئی ان کے والدین کی اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ راحت کے چھوٹے بھائی عادل قریشی لکھتے ہیں ''راحت بھائی مجھ سے عمر میں چھ سال بڑے ہیں اندور کے نیاپوری محلّہ میں جب میں نے ہوش سنبھالا راحت بھائی نوتن ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، راحت بھائی کو میں چھوٹے بھائی جان کہا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کی حالت بہت خراب تھی راحت بھائی بہت کم عمری میں جب وہ اسکول کے طالب علم تھے مختلف کام کرنے لگے تھے۔''(۱)

راحت کی ابتدائی تعلیم

دستورِ زمانہ کے مطابق راحت کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو فارسی سے ہوئی اس کے بعد وہ نوتن ہائی اسکول اندور میں داخل ہوئے اور اسی درس گاہ سے انہوں نے آٹھواں درجہ پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسی اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اندور کے آرٹ اینڈ کامرس کالج میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی کچھ ناگفتہ بہ حالات خاص کر قلت سرمایہ کی بنا پر انہیں یہ سلسلۂ تعلیم بی اے سال اول میں ہی منقطع کرنا پڑا۔ جب ذرا حالات سدھرے تو انہوں نے اسلامیہ کریمیہ کالج بھوپال سے گریجویشن کیا۔

راحت جب نوتن ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے یہ ان کے والدین کے مالی بحران کا دور تھا اس لئے راحت اپنی تعلیم کے ساتھ مختلف کام کرنے لگے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے جھگن کی دوکان کی دوکان پر سائین بورڈ بنانے کا کام کیا یہاں وہ بڑی مستعدی اور انہاک سے کام کرتے تھے۔ جب کام زیادہ ہوتا

---

(۱) چھوٹے بھائی جان عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۶

تو دیر رات تک چھٹی نہیں مل پاتی تھی۔ روزہ رکھنے کے وہ بڑے پابند تھے۔ چنانچہ رمضان میں دیر ہونے پر اکثر ان کی والدہ بذات خود جھگن کی دوکان پر روزہ افطار کرنے کا کچھ سامان ان کو دینے کیلئے جایا کرتی تھیں۔ لیکن راحت نے ہر تنگ و ترش حالات میں بھی اپنے انہاک میں کمی نہیں آنے دی۔ اس کام سے کچھ عافیت کے دن گزارنے کا بندوبست ہوگیا تھا۔ اسی مستعدی نے ان کے کام میں بھی ترقی کے امکان پیدا کر دئے اور ایک دن ایسا وقت بھی آیا جب ان کے بھائی عادل قریشی کی روایت کے بموجب:

''اندور کی ایک بڑی تجارتی بستی میں راحت بھائی کے بنائے ہوئے بورڈ سڑک کے دونوں جانب لگے ہوئے دیکھے جانے لگے دوکانداروں کو کئی کئی دن اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اپنا بورڈ کسی اور سے بنوانا گوارا نہ تھا۔ راحت بھائی کرایہ کی سائیکل لیکر چلاتے تھے اور اجرت کے بطور اسی دوکان کی سائیکلوں پر نام لکھا کرتے تھے۔''(۱)

بی اے کرنے کے بعد راحت کو اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا تھا لیکن ان کی انتھک محنتوں کو دیکھ کر اللہ نے ان کو فراوانی عطا کی تو انہوں نے ۱۹۸۵ میں اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ ڈی (Ph.D) اردو کی سند حاصل کر لی۔ .Ph.D کے مقالہ کا عنوان تھا ''اردو کی ترویج و اشاعت میں مشاعروں کا حصہ'' یہاں ان کی تحقیق کے نگراں پروفیسر آفاق احمد صاحب تھے چونکہ راحت مشاعروں میں شرکت کرتے کرتے مشاعروں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اور انہیں پروفیسر آفاق احمد صاحب جیسے دیدہ ور اور ہر اعتبار سے ہمدرد نگراں مل گئے تھے ان دونوں وجوہات کی بنا پر انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور حق تحقیق ادا کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر لی۔

راحت کی انتھک محنت یا خالق کی دین کہ Ph.D کرنے کے بعد جلدی ہی اسلامیہ کریمیہ کالج اندور میں لیکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے بارہ سال درس و

---

(۱) راحت میرے چھوٹے بھائی عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۷

تدریس کے کام انجام دئے۔ مشاعروں میں زیادہ آنے جانے اور دن بہ دن بڑھتی ہوئی اپنی مشغولیت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ طلباء کو زیادہ وقت نہیں دے پارہے ہیں اس لئے اس ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔

شعرگوئی کا آغاز

راحت کو شعر کہنے کا شوق تو بہت پہلے سے تھا لیکن اس کا آغاز انہوں نے بقول مضطر مجاز حیدرآبادی ۱۹۶۵ء یعنی پندرہ سال کی عمر سے کیا۔'' (۱) اس کے برخلاف پروفیسر ظفر احمد نظامی لکھتے ہیں ''انہیں ابتدا سے ہی شاعری کا شوق رہا، شعروادب کا ذوق رہا، ہزار شعراز بر تھے، مستقبل کا مظہر تھے، انہوں نے اختر شیرانی کو دل میں بٹھایا ساحر کو اپنایا، مجاز سے پیار کیا، مخدوم پر اعتبار کیا، فیض سے فیضیاب ہوئے کوچۂ سخن میں کامیاب ہوئے آخر کار تخلیق کا کرب سہا ۱۹۶۸ء میں پہلا شعر کہا پھر مسلسل شعر کہنے لگے'' (۲)

پروفیسر ظفر احمد نظامی سے ملتی جلتی روایت راحت کے بھائی عادل قریشی کی ہے وہ لکھتے ہیں ''ہم گھر والوں کو پہلی بار ۷۰۔۱۹۶۹ء میں معلوم ہوا کہ راحت بھائی شعر کہتے ہیں۔ پہلا مشاعرہ والدہ صاحبہ کی سفارش پر ماموں صاحب نے دیواس میں پڑھوایا تھا۔ ماموں انتظامیہ کمیٹی کے رکن تھے، مشاعرے میں راحت بھائی نے اپنا کلام پیش کیا تو کوئی نوٹس نہیں لیا گیا ہم ۱۵۔۲۰ افراد جو اندور سے ساتھ آئے تھے، ونس مور (Once More) کا شور کرنے لگے، جس پر عوام نے ہمیں ڈانٹ کر چپ کرادیا۔ آج حال یہ ہے کہ ساری دنیا میں راحت بھائی کا کلام سنا پڑھا اور گایا جاتا ہے۔'' (۳)

راحت نے اپنی ایک گفتگو میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا اور پھر یہ شوق تیز تر ہو کر ان منزلوں پر پہنچ گیا کہ آج ان کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے

(۱) مضطر مجاز حیدرآباد لمحے لمحے ۲۰۰۲ء ص ۴۳۳

(۲) پروفیسر ظفر احمد نظامی لمحے لمحے بدایوں ص ۱۱

(۳) چھوٹے بھائی جان عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۸

کہ وہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ہر جگہ جانے پہچانے اور پسند کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں صرف اسی قدر مصدقہ ہے کہ اسکول اور کالج کے زمانہ تعلیم میں بھی راحت اپنے کلاس میں بیٹھ کر شاعری کے نکات پر نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگے تھے، ان کی سنجیدگی اور توجہ سے ان کے استاد ڈاکٹر عزیز اندوری بھی ان سے خوش و مطمئن رہا کرتے تھے۔ آخر کار ایک دن راحت نے اپنے استاد ڈاکٹر عزیز اندوری کے روبرو یہ انکشاف کر ہی دیا کہ وہ شعر کہنے لگے ہیں۔ عزیز صاحب اس خبر سے کچھ خوش بھی ہوئے اور کچھ متفکر بھی۔ متفکر اس لئے کہ اگر دوران تعلیم راحت کو شاعری کا چسکا لگ گیا اور وہ اندور کی شعری فضا میں پوری طرح غرق ہو گئے تو ان کا تعلیمی سلسلہ بالکل اسی طرح منقطع ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہائی اسکول کے بعد بارہ سال شعری ماحول میں ڈوبے رہے تھے اور ان کی تعلیم پس پردہ چلی گئی تھی۔ عزیز صاحب نے اپنے اسی تجربے کے تحت راحت کو شروع میں تعلیم پر زیادہ دھیان دینے کی ہدایت کی مگر ان کے ذوق و شوق کو دیکھ کر انہیں شعر گوئی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ وہ مقامی شعری ماحول میں گھر کر اپنے دامن کو آلودہ نہ کر لیں، اور بسا اوقات راحت کو اپنے وعدے پر اٹل رہنے کی ہدایت بھی دیتے رہتے تھے۔ اسی وجہ دے راحت کے اشعار میں کلاسیکیت کا رچاؤ نہیں ہے اور نہ اس فضا میں ترقی پسندانہ نظریات کی جھلکیاں ہی نظر آتی ہیں اور نہ جدیدیت کے رنگ کا کوئی پروقار پہلو، بقول ڈاکٹر عزیز اندوری:

''ایک سچا فنکار جب اپنے ذہن کے دروازوں کو کھول کر کچھ سوچتا ہے تو اس کے تجربوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ وقت کی گردشوں پر گہری نگارہ رکھتے ہوئے آئینہ دل کو گرد و غبار، حالات سے صاف کرنے کی کوشش میں جٹ جاتا ہے۔ ایسے میں اس کی کوشش احتجاجی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت سے قریب تر بھی۔ راحت نے بھی ایسا کچھ کیا ہے معلوم ہوتا ہے اس کا دل موجودہ ناانصافیوں سے بہت متاثر ہوا ہے اسی لئے وہ بعض صورت میں بہت کڑوی کڑوی باتیں کرنے لگتا ہے مگر وہ کرے بھی تو کیا کہ اس کے عہد نے حساس دلوں کو ایسی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے

ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے

روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں

چاند پاگل ہوگیا تارے بھکاری ہوگئے

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے تھے جو شجر

یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بیوقوف

سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آگئے

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ

دھوپ کے شہر میں اک تنہا شجر ایسا تھا (۱)

اسی زمانہ میں اندور کی کلاسیکی اور روایتی شعری فضا میں کچھ لوگوں نے اپنی آواز ملانے کی کوشش ضرور کی مگر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح ڈوب کر رہ گئی۔ ایک مدت مدید کے بعد اندور کی قدیم روایات جس میں جمود کی سی کیفیت طاری تھی، میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس گروہ میں اندور کی قدیم نسل کے شانہ بہ شانہ نو جوان نسل پیش پیش تھی۔ ان میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر راحت اندوری کا ہے، جنہوں نے ابتدا ہی سے اندوری شعری لہجہ سے خود کو قدرے مختلف بنائے رکھنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ اندور کے شعری ماحول نے راحت کو اپنے رنگ میں رنگ لینے کی ضرور کوشش کی ہوگی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے راحت نے خود اپنی الگ پہچان بنائے رکھنے کے عزم کے تحت خود کو اس روایتی ماحول میں ڈھلنے نہیں دیا۔

راحت اندوری کا اپنا الگ مزاج اور شعری رویہ تھا وہ شعر گوئی کو محض تفنن طبع یا اظہار جذبات

---

(۱) تیکھے لہجے کا شاعر، ڈاکٹر عزیز اندوری راحت اندوری شخص اور شاعر، مکتبہ دین وادب لکھنؤ ص ۱۵۷، ۲۰۰۲

ہی کا وسیلہ نہیں گردانتے تھے بلکہ اسے مستقل ایک فن سمجھتے تھے۔ اس خیال نے انہیں ایک رہنما ایک استاد کی فکر لاحق تھی، اور وہ چاہتے تھے کہ کسی لائق ماہر فن سے اصلاح سخن لیا کریں ان کی توجہ اندور کے کلاسیکی مزاج کے شاعر قیصر اندوری پر مرکوز ہوئیں اور انہوں نے موصوف سے مشورہ سخن کرنا شروع کیا۔ غالباً اسی مناسبت سے کچھ دنوں تک لوگ انہیں راحت قیصری کہنے لگے تھے اور یہی ان دنوں ان کی شناخت بھی بن گئی تھی۔ لیکن جس نوع کی غزلیں راحت ان دنوں کہہ رہے تھے ان کی غزلوں کا مزاج ان کے استاد قیصر اندوری کے مزاج شعر گوئی اور رنگ سخن سے یکسر مختلف تھا۔ اسی لئے یہ سلسلہ مشورۂ سخن زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا اور پھر وہ ان سے الگ ہوتے ہی راحت قیصر سے راحت اندوری بن گئے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو راحت نے اپنے ابتدائی دور شعر گوئی میں قلم بند کئے تھے:

لوگ پیپل کے درختوں کو خدا کہنے لگے
میں ذرا دھوپ سے بچنے کو ادھر آیا تھا

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو آگے
جو آگے ہیں وہ ہمیں راستہ نہیں دیں گے

ہمارے عیب ہمیں انگلیوں پر گنواؤ
ہماری پیٹھ کے پیچھے ہمیں برا نہ کہو

اس وقت تو میں گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس ایک قمیض تھی جو میرا بھائی لے گیا

یہ جھیل اچھی ہے کنول اچھا ہے یا جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے

قبر کے پتھر کے نیچے تھیں مری عیاشیاں
اور مرے اعمال کا سایہ میرے بچوں پہ تھا

مندرجہ اشعار میں جو شعری مزاج ہے وہ یقینی طور پر اندور کے قدیم اور اس عہد کے شعری مزاج سے مختلف تھا۔ اسی بنا پر اندور کا شعری ماحول راحت اندوری سے شروع ہی میں اجنبیت کا اظہار کرنے لگا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی آواز اندور کی شعری فضا میں ان کی منفرد آواز بن کر ابھری اور فکری بلندیوں پر فائز ہوگئی۔ اس طرح انہوں نے جلدی ہی اندور کے شعری اور ادبی حلقے کو اپنی جانب متوجہ کرلیا اور ان کی طباعی اور ذہانت اور ان کے فن کا اعتراف کیا جانے لگا اور جب انہوں نے اندور کے مشاعروں میں شرکت کرنے کی ابتدا کی تو ان کے کلام کی انفرادیت اور ان کے خوبصورت ترنم کی بنا پر جلدی ہی انہیں مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی اور اس کے بعد وہ اندور کے باہر بھی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ راحت اندوری نے شاعری کی معشوقۂ طناز کو کیوں لگے لگایا اس سوال کے جواب میں راحت نے خود بیان کیا ہے کہ:

''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری مجھے ودیعت ہوئی تھی۔ بہت کم عمری میں میں اشعار موزوں کرنے لگا تھا اور حافظے پر اس قدر گرفت تھی کہ اقبال اور جوش کی طویل ترین نظمیں ازبر تھیں۔ بزم ادب لائبریری میں ایک شعری نشست ہو رہی تھی اور میں سامع کی حیثیت سے باہر کھڑا ہو کر اشعار سن رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آئے وہ میرے آشنا تھے اور مجھے جانتے تھے کہ میں شعر کہتا ہوں اس لئے انہوں نے مجھ سے اس نشست میں شعر پڑھنے کیلئے کہا اس وقت تک مجھے یہ شعور نہیں تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ مشاعرے کے قواعد اور ضوابط کی رو سے صحیح ہے میں نے بہت ہچکچاتے ہوئے ایک غزل پڑھی، جس کا مطلع تھا:

مقابل آئینہ ہے اور تری گلکاریاں جیسے
سپاہی کر رہا ہو جنگ کی تیاریاں جیسے

میرے حافظے کے مطابق یہی غزل میری پہلی غزل تھی جو میں نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں کہی تھی۔ اس غزل میں الماریاں، دھاریاں جیسے نامانوس قوافی نظم کئے تھے، جو اس عہد کی اندور کی فضا

سے مناسبت نہیں رکھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کرنی شروع کی جو مجھے سرے سے شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے اس کے بعد مقامی نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر عزیز اندوری سے اپنے کلام میں اصلاح لی لیکن ان کے اور میرے شعری مزاج میں ایک نسل کا فاصلہ تھا اس وجہ سے یہ سلسلہ بھی چند برس بعد منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے کو ہی اپنا رہنما اور استاد مان لیا۔''(۱)

مشاعروں میں شرکت

دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں مشاعرے کی روایت قدیم بھی ہے اور زیادہ بھی۔ اسے تہذیبی اور ثقافتی روایت کا ایک اہم حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لسانی تہذیب کے تحت یہ خیال خصوصی طور پر مدنظر رہتا ہے کہ مشاعروں کے ذریعے زبان کے فروغ اور علمی اور ادبی تصورات کی توسیع ہو سکے اور سماجی تہذیب کے تحت یہ پہلو پیش نظر رہتا ہے کہ پڑھا جانے والا کلام سماجی حالات و مسائل سے گفتگو کرے اور ان پر اس رو سے روشنی ڈالی جائے کہ سامعین کے سامنے مسائل حیات کی تصویر ابھر کر آجائے۔ مشاعرہ علمی فضا کو ہموار کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس میں پڑھا جانے والا کلام اکثر علمیت کی ان سطحوں کو چھو لیتا ہے، جنہیں صرف کاغذ پر ہی جانچا تولا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس نوع کا کلام مشاعرے کے وقار میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور مشاعرے کو ایک سنجیدہ ماحول عطا کرتا ہے، جسے کتب بینی کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعروں میں اکثر طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ایسا جادو جگا دیتا ہے، جس کے ذریعے سماجی کوائف اور انتشار پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے اور اکثر ایسے مواقع سماجی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرا سکنے کا کارگر وسیلہ بن جاتے ہیں اور اس طرح بڑی حد تک سماجی انتشار کم کر سکنے کا خیال پیدا ہونے لگتا ہے۔

مشاعرہ چونکہ انسانی جذبات احساسات اور نظریات کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے اس

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۴۳۸

لئے اس کی اہمیت بھی ہے، بقول ڈاکٹر عزیزی اندوری:

''چونکہ انسانی فطرت اپنے خیالات، احساسات، نظریات اور تنقیدی شعور کے پھیلاؤ اور تبلیغ کی خواہش روز اول ہی سے موجود ہے اس لئے وہ ان ذرائع اور وسائل کے حصوں کی طرف ہمیشہ متوجہ رہتا ہے۔ شعروسخن ان ذرائع اور وسائل کی ایک اہم اور مستحکم شکل ہے۔'' (۱)

مشاعرے میں پیش کیا جانے والا کلام جس قدر دلپذیر ہوتا ہے اسی قدر مشاعرہ بھی پروقار ہوجاتا ہے کلام شاعر کے زود اثر ہونے کی وجہ سے مشاعرہ بھی زود اثر ہوجاتا ہے۔ فراق گورکھپوری مشاعرے کے سلسلے میں اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''میں اس خیال سے بہت کم متفق ہوں کہ مشاعروں کی تعریف یا شعروشاعری کی صحبتوں کی تعریف تنقید نہیں ہے بسا اوقات یہ تنقید بہت پتے کی ہوتی ہے اور کئی موقعوں پر خطوط یا تذکروں یا عام بات چیت میں ضمنی طور پر شعروادب کے بارے میں جو باتیں زبان یا قلم سے اضطراری حالت میں نکل جاتی ہیں وہ تیر بہدف ہوتی ہیں۔'' (۲)

مشاعروں میں شاعر کا تعلق عوام سے براہ راست ہوتا ہے عموماً ایسے مضامین بیان کئے جاتے ہیں جن سے دلچسپی عام ہو، شعر کی ادائیگی کو پرکشش بنانے کیلئے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر کا کام شعر کہہ کر ختم نہیں ہوجاتا شعر کی ترسیل کے آخری مرحلے تک اسے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

آج کل شعر کی زبانی خواندگی اور تحریری پیش کش میں فرق کیا جانے لگا ہے جو بھی تخلیق تحریر میں آکر طباعت کے مراحل سے گزر جاتی ہے اسے آنکھ بند کر کے ادب مان لیا جاتا ہے اور ایسی تحریر جو محض زبانی خواندگی تک محدود رہ جاتی ہو خواہ کتنی ہی اہم ہو اس کا حلقۂ اثر کتنا ہی وسیع ہو اسے محض تفریح اور دل

---

(۱) ہمارے مشاعرے مطبوعہ تنقیدی تحریریں، ڈاکٹر عزیزی اندوری

(۲) اندازے، فراق گورکھپوری ص ۱۱

بہلا وا سمجھ لیا جاتا ہے، جو بہر حال ہماری کج نگاہی اور نا منصفی اور افسوس کی بات ہے۔

شکیل گوالیاری نے ایسی ہی ایک سچائی کی طرف اپنے ایک مضمون میں آنند بخشی کے مراسلے کو ہو بہو پیش کرتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے:

''ابھی کچھ دن قبل ایک معاصر جریدے میں فلم کے مشہور و معروف شاعر آنند بخشی کا مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں ''میں شاعر تو نام کا ہوں بنیادی طور پر ایک گیت کار ہوں اور تقریباً چار ہزار گیت لکھ چکا ہوں، غور کیجئے چار ہزار گیت لکھ کر شاعر کو کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ شاعر تو نام کا ہے ادھر پچاس غزلیں چھپوا کر ایک مبتدی اپنے کو ایک مکمل شاعر ہی نہیں پکا ادب نواز اور زبان و بیان کو خدمت گار سمجھ لیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر افسوس ناک حالت اور کیا ہوگی۔'' (۱)

مندرجہ روایت خواہ کتنی ہی سچائیوں کی مظہر ہو، اس پر مزید بحث سے دامن بچاتے ہوئے اس امر کی وضاحت اس موضوع سے متعلق یہ ہے کہ مشاعرے کے انعقاد کیلئے اسٹیج کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اسٹیج کا تعلق براہ راست شاعری کے روایتی نظام سے بہت گہرا ہے۔ یہ اسٹیج ہی ہے جو اردو ادب کی جملہ اصناف سخن میں تبدیلیوں کی ترسیل و ابلاغ کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ فکری رجحانات کی توسیع اسی مرکز سے فروغ پاتی ہے۔ سماجی اصلاحی معاشرتی ترقی سیاسی نشیب و فراز اور زندگی کی شکست و ریخت کی سچی تصویریں انہیں مشاعروں کے ذریعے اعلیٰ پیمانے پر پیش کی گئی ہیں۔ مشاعروں میں اسٹیج پر شعرا اپنا کلام سناتے ہیں۔ کلام کی معنوی خوبیوں کے ساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے پیش کرنے کے ڈھنگ کا بڑا دخل ہوتا ہے ساتھ ہی اگر آواز کا رس بھی شامل ہو جائے تو سارا مجمع متاثر ہو کر جھوم اٹھتا ہے۔

راحت اندوری کی شاعری کی ابتدا بہت کچھ اسٹیج سے کلام سنانے سے ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں جب ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی انہوں نے دیواس کے مشاعرے میں اپنی غزل پیش کی تھی، اس مشاعرے میں اردو کے مشاہیر سمجھے جانے والے بیشتر شعرا موجود تھے۔ راحت نے اپنا کلام ترنم سے پیش کیا تھا، کچھ ان

---

(۱) علمہ البیان شکیل گوالیاری، مشمولہ لمحے لمحے بدایوں ص ۱۹۶

کی شروعات کا عہد اوران کی عمر کا بھی دخل تھا، اور ساتھ ہی اس زمانے میں ہندوستان کی ادبی فضا میں ترنم اورغنائیت سے کلام سنانے والے شعراء کی تعداد بھی وافر ہوتی تھی۔ یہیں سے راحت کومحسوس ہو گیا کہ ان کا یہ لہجہ اورانداز تا دیران کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لئے بعد کے بھساول کے ایک مشاعرے میں انہوں نے تحت اللفظ میں اپنا کلام سنایا اس مشاعرے میں عالم فتح پوری اور خمار بارہ بنکوی جیسے کہنہ مشق اور معتبر شاعر بھی موجود تھے۔ راحت کے انداز اوران کی آواز میں ایسی کھنک اور سحر انگیزی تھی کہ وہ مشاعرہ ان کو ملنے والی داد وتحسین سے گونج اٹھا۔ بعد میں انہیں بزرگوں کے مشورہ سے راحت نے ترنم کوخیر باد کہہ کرترنم سے پڑھنے کی عادت استوار کر لی۔ آج عالم یہ ہے کہ بڑے سے بڑے ہندو پاک کے مشاعروں میں اچھے اچھے مترنم اور تحت گو شعراء راحت کے بعد کلام پڑھنے میں جھجھک سی محسوس کرتے ہیں اور پھر تو ان کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک جھلک بلیا کے مشاعرے، میں یوں دیکھنے کو آئی وہاں کے ٹاؤن ڈگری کالج کے مشاعرے میں راحت بہت تاخیر سے پہنچے تھے مجمع بے کیفی محسوس کرتے ہوئے اکھڑنے سا لگا، لیکن جیسے ہی راحت کے پہنچنے کی آواز گونجی مجمع پھر سمٹ کر آ گیا اور سارا پنڈال بھر گیا۔ اسی طرح کوٹہ شہر کے مشاعرے میں بھی حال ہوا یہ وہاں کی نمائش کا کل ہند مشاعرہ تھا مشاعرہ گاہ میں سامعین کا ہجوم تھا اچانک پانی گرنے لگا، افراتفری کا عالم ہو گیا۔ ایسے میں راحت کو دعوت سخن دی گئی۔ راحت کلام سناتے رہے مجمع ٹس سے مس نہ ہوا حالانکہ بارش ہو رہی تھی یہ سلسلہ لگ بھگ اسی طرح ایک گھنٹہ تک رہا۔

راحت اندوری کے مشاعرے میں پیش کش کے منفرد انداز پر مضطر مجاز نے لکھا ہے:

''راحت پہلے تو شعر کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں اور بڑی جادوگری کے ساتھ اسے پورے مشاعرے پر چادر کی طرح پھیلا دیتے ہیں۔''(۱)

شعر کو اپنے اوپر مسلط کرنے یا طاری کرنے کے تعلق سے راحت اندوری اپنا خیال یوں پیش کرتے ہیں:

---

(۱) مضطر مجاز، ماخوذ از امکام لکھنؤ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ ص ۲۸

کاغذ کو سب سونپ دیا یہ ٹھیک نہیں
شعر کبھی خود پر بھی طاری کیا کرو

کاغذ سے اپنی بے نیازی کا اظہار راحت نے اور بھی کئی جگہ کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر شعر ہے تو چاہے مشاعروں کے ذریعے یا کاغذ کے راستے سے آئے اپنا مقام ضرور بنائے گا''

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''میری غزل یا تو میرے لئے ہوتی ہے یا میرے سامعین کیلئے۔ قارئین (سکہ بند رسالے والوں) سے میرا رشتہ کوئی خاص گہرا نہیں ہو پایا۔، جس کا مجھے افسوس ہے''(۱)

ترسیل وابلاغ کے اہم وسیلے یعنی پرنٹ میڈیا کے تعلق سے راحت اندوری نے اپنی بے نیازانہ روش کا اظہار اپنے کئی اشعار کے ذریعے بھی کیا ہے، مثلاً:

لوگ ہونٹوں پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں مجھے
میری شہرت کسی اخبار کی محتاج نہیں

اس سلسلے میں ڈاکٹر محبوب راہی کا یہ مشورہ نہایت صحیح ہے کہ:

''ان کی آواز لاکھ متاثر کن ہو اپنے لہجے کی تمام گھن گرج اور انداز بیان کی سحر انگیز دلکشی یہ سارا طلسم ایک معین مدت گزر جانے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ رسائل اور جرائد اور کتابوں میں وہ آئندہ کئی صدیوں تک محفوظ ہو جائیں گے کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی کے وسیع تر پھیلاؤ کے باوجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت وافادیت کو اب بھی تسلیم کیا جارہا ہے اور آئندہ بھی اس کے مکمل طور پر رد کر دینے کے امکانات کم ہیں۔''(۲)

راحت کے مشاعرے کے بلا مبالغہ سب سے بڑے شاعر ہونے کے باوجود محض مشاعرے کے نہیں ہیں اعلیٰ وارفع معیار کے حامل سنجیدہ ادب میں بھی وہ ایک مقام و وقار واعتبار کے مستحق ہیں۔ اس

(۱۔۲) بحوالہ ڈاکٹر محبوب راہی، راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک امکام لکھنؤ ماہنامہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ص ۳۵

میں شک نہیں کہ محمد حسین جونپوری، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے پڑھنے کی نقل کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں لیکن راحت کی نقل اتارنے کی کوشش میں بڑا خطرہ مول لینا ہے اور اکثر نقل مطابق اصل کے نہ ہوکر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ راحت کے انداز کی نقل میں بیشتر لوگوں کی نقالی راحت دکھائی دینے کے بجائے ''سرکس کا مسخرہ معلوم ہونے لگتا ہے'' بقول وامق جونپوری ''راحت ایک باشعور فنکار ہے جو اپنے اسلوب کے خطرات سے واقف ہے۔ وہ ایک روپ ڈانسر (تنی ہوئی رسی پر ناچنے یا چلنے والا) کی طرح بڑھتے ہیں اپنے حرکات کے مرکز نقل کو الفاظ و خیالات کو دائرہ جسم کے باہر نہیں جانے دیتے کہ مبادا توازن کھو بیٹھے اور تالی پٹ جائے۔'' (۱)

اسی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وامق جونپوری لکھتے ہیں:

''راحت ایک کامیاب ترین تحت اللفظ کا شاعر ہے۔ چند مبصرین اس کو مشاعرے کا سلطانہ ڈاکو کہتے ہیں۔ مجھ کو ان حضرات سے اتفاق نہیں اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ مشاعروں کو لوٹ لیتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنے خاص اسلوب تحت اللفظ اپنے تازہ مزاج صحت منداور تلخ وشیریں کلام کو لٹا دیتا ہے وہ بہت آسان زبان میں شعر کہتا ہے جس کا اعلان وہ یوں کرتا ہے:

ہم نے سیکھی نہیں ہے وہ قسمت سے
ایسی اردو جو فارسی بھی لگے

''خیالات اتنے سیدھے سادے اور غیر پیچیدہ بھی نہیں ہوتے کہ ہر شخص ان کو بہ آسانی سمجھ لے اور اس کا نام اچھی شاعری سے راحت اپنے منفرد اسلوب تحت اللفظ میں شعر کی وہ تصویر کھینچتا ہے کہ اس کا کلام سامعین کے ذہن میں نشتر کی طرح اتر جاتا ہے۔'' (۲)

اپنی خود اعتمادی کی بدولت راحت کو دنیائے اردو نے مشاعروں کے ڈائس سے راحت اندوری کی منزل تک کا سفر طے کرتے دیکھا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں مشاعروں کی محفلیں سجتی ہیں ہندوستان کا یہ

(۱) 'شاید کہ تری دل میں اتر جائے مری بات' وامق جونپوری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۰
(۲) 'شاید کہ تری دل میں اتر جائے مری بات' وامق جونپوری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۶

نمائندہ شاعر سوال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

گلاب خواب دوا زہر جام کیا کیا ہے
میں آ گیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے

اسی لئے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں:

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

آج حال یہ ہے کہ دنیا کے ہر کونے سے مشاعروں کے دعوت نامے ان کے پاس آتے رہتے ہیں انہوں نے ابھی تک کتنے مشاعرے پڑھے اس کا شمار آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہیں تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں جن کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ ان سب باتوں کا یہی لب لباب ہے کہ مشاعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہی مشاعرے ہیں جنہوں نے راحت کو مقبولیت کے چرخ چہارم تک پہنچا دیا ہے۔ آج مشاعروں میں ان کی شمولیت مشاعروں کے وقار کا سبب بنتی ہے، اس میں شک بھی نہیں کہ راحت نے مشاعروں میں شریک ہو کر اس طرح اردو کی لسانی تہذیب کو فروغ دیا ہے جس طرح ہمارے قلمکار اپنے زور تخلیق سے کتب یا رسائل کے حوالے سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

آج اندرون ملک کے تمام اہم ترین مشاعروں میں راحت کی شرکت لازمی سی ہو گئی ہے یہی نہیں بلکہ غیر ملک کے بھی بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں راحت اندوری نے کراچی کے ان آٹھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، جن میں ہندوستان سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگناتھ آزاد اور فنا نظامی جیسے مشاہیر قد آور شعراء بھی شریک ہوئے تھے۔ ان مشاعروں میں راحت کے کلام کی اس قدر پذیرائی اور شہرت ہوئی کہ انہیں بیرون ہند کے مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ ۱۹۸۷ء میں راحت نے کراچی کا سفر کیا اور انعقاد پذیر ۱۳ مشاعروں میں انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنا کلام سنایا۔ ۱۹۹۴ء میں سلطنت عمان کے ایک مشاعرے میں راحت نے شرکت

کی، جس میں ہندوستان سے آل احمد سرور، معین احسن جذبی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، شہریار اور بشیر بدر نے بھی شرکت کی تھی اور مشہور فلم اسٹار نصیر الدین بھی شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے میں کامیاب ہونے والے شاعروں میں راحت اندوری کا نام بھی شامل تھا۔ ۱۹۸۸ء میں پھر وہ بیرون ہند کے سفر پر روانہ ہوئے اور دوحہ، قطر، دبئ کے عالمی مشاعروں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا کلام سنایا۔ ان مشاعروں میں ہندو پاک کے متعدد شعراء بھی شریک ہوئے تھے اور پھر ۱۹۸۹ء میں راحت نے دبئ کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے علاوہ ابوظہبی، العین اور عمان وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور اسی سال وہ بزم ادب بحرین کے مشاعرے میں خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔ عرب ممالک کے علاوہ بھی راحت نے دوسرے ممالک جیسے بنگلہ دیش، ماریشس وغیرہ کا بھی مشاعروں ہی کی خاطر سفر کیا۔ ان تمام مذکورہ مشاعروں کے علاوہ بھی انہوں نے ۱۹۹۱ء میں امریکہ کا سفر کیا اپنے وہاں کے ایک ماہ قیام کے دوران انہوں نے کئی بڑے مشاعروں میں اپنی شاعری کی جوت جگائی ان میں نیویارک، واشنگٹن، ڈیلس، لاس اینجلس، سائل سنائی، کلولینڈ اور نیوجرسی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان مشاعروں میں راحت کے کلام کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں ان کے آخری مجموعے کلام پانچواں درویش کی جلدیں آناً فاناً نہ صرف یہ کی فروخت ہوگئیں بلکہ گھٹ گئیں۔

راحت کے اندرون ملک مشاعروں میں خاطر خواہ کامیابی جہاں انہیں حاصل ہوئی ان کے اسما ہیں:

جشن جمہوریت لال قلعہ دہلی کا مشاعرہ۔

عالمی اردو کانفرنس دہلی اور حیدر آباد کا مشاعرہ۔ دہلی کلاتھ ملز کا مشاعرہ۔

شنکر میموریل حیدر آباد مشاعرہ۔

اردو ٹرسٹ حیدر آباد کا مشاعرہ۔

پنجاب ایسوسی ایشن حیدر آباد کا مشاعرہ۔

بزم ادب پٹھان کوٹ اور فرید کوٹ کا مشاعرہ۔

مغل آرٹ محمد علی لائبریری کا مشاعرہ۔

بوکارو اسٹیل اتھارٹی بوکارو کا مشاعرہ۔

سرسنگار سمد ممبئ کا مشاعرہ۔

بھوپال کے ایک مشاعرہ میں راحت کا عوامی طور پر شاندار استقبال کیا گیا اور ان کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے انہیں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔

ان مشاعروں کے علاوہ انہوں نے کانپور، علی گڑھ، مظفر نگر، میرٹھ، لکھنؤ اور دیوبند وغیرہ جیسے اردو کے بڑے مراکز کے مختلف مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا ہے ان میں کئی سرکاری اور نیم سرکاری مشاعرے بھی شامل ہیں۔ مشاعروں میں راحت اندوری کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ڈاکٹر بشیر بدر کے اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے، ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری ایسے کامیاب خوش نصیب شاعر ہیں، کہ ان کے مشہور شعر ہماری اعلیٰ غزل گوئی کے تنقیدی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ دراصل یہ امتیاز ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مشاعروں میں وقتی کامیابی کے شعر سے زیادہ اسٹیج پرفارمنس Stage Performance کی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ مشاعرے میں شاعر کی اداکاری یا ترنم کی لالہ کاری سے مشہور ہونے والا منظر شاعر کا بڑا دشمن ہے۔ وہی وقتی شہرت اس کی دائمی بدنامی کا ثبوت ہوتی ہے لیکن کیسی ہی اداکاری سے کتنے ہی ڈرامے سے کیسے ہی ترنم سے اگر اچھا شعر سامنے آتا ہے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ ترنم اور اداکاری صبح رخصت ہو جائیں گے اور شعر اپنی اصلیت پر سفر کرے گا۔ راحت اندوری ایسے خوش نصیب شاعر ہیں کہ مجموعی طور پر ان کے وہ شعر عوام میں مشاعروں کے وسیلے سے مشہور ہوئے ہیں جو سینہ بہ سینہ سفر کریں یا کاغذ پر آئیں۔ اپنی شاعرانہ صداقت کی وجہ سے آج کی غزل کے سرمایہ کا حصہ ہو جاتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) کالے گلاب کی خوشبو۔ مطبوعہ فاران، مضمون نگار ڈاکٹر بشیر بدر کھریا بنارس ص ۳۵

اعزازات وانعامات

یہ بات بغیر کسی شک وشبہ یا خوف تردید کے کہی جاسکتی ہے کہ راحت اندوری نے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ اعزازات حاصل کئے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ ان کی ادبی وشعری پیش کش کی صلاحیتوں کی بناپر عالمی پیمانے پران کی مقبولیت میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔

انہیں اب تک جوادبی اورقومی اعزازات ملے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

''مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے مشہور شاعر محمد علی تاج کے نام سے منسوب ایوارڈ یہ ایوارڈ صوبے کے نوجوان شعراء جو باصلاحیت بھی ہوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ راحت اندوری کو دیا گیا تھا۔

اسی طرح بھوپال سے ''ہم ایک ہیں'' نامی انجمن کی جانب سے ''غزل ایوارڈ'' ہندی ساہتیہ پریشد کی طرف سے ساہتیہ رتن، اتر پردیش اردو لٹریری فورم کی طرف سے قومی ایکتا ایوارڈ۔

نیشنل ڈیموکریٹک فورم دہلی کی طرف سے قومی یک جہتی ایوارڈ۔

بزم ادب نینی تال کی طرف سے اندرا گاندھی ایوارڈ۔

چترانجھی آگرہ کی طرف سے فراق گورکھپوری ایوارڈ۔

بزم ادب جھانسی کی طرف سے مرزا غالب ایوارڈ۔

ان گرانقدر اور لائق ذکر ایوارڈ کے علاوہ بھی ان کوطرح طرح کے ایوارڈس سے نوازا جاتا ہے ،جن کا احاطہ آسان نہیں ہے۔ ان تمام اعزازات کے علاوہ راحت اندوری کی ادبی وشعری صلاحیتوں اور خدمات کے پیش نظر مختلف شہروں میں مختلف تنظیموں کی طرف سے جشن منائے گئے ان میں بنارس، مرادآباد، دیوئی، بھوپال، مالیگاؤں، چندوسی، مئو اور اندور جیسے ادبی مراکز شامل ہیں۔ ان جشنوں میں راحت اندوری کی شخصیت اوران کے کلام پر مشاہیر اہل قلم نے نہایت اہم اور قابل ذکر تاثرات پیش کئے

ہیں چند بخاطر ملاحظہ پیش ہیں:

پروفیسر قمر رئیس دہلی کے تاثرات ہیں:

''راحت کی غزل صرف سامعین کو چیخنے اور قارئین کو چونکنے کی ترغیب دینے والی شاعری نہیں ہے۔ یہ زخموں کو کریدنے احساس کی آنچ کو بڑھانے اور سوچ کو مضطرب بنانے والی شاعری ہے۔ یہ ایک ایسی نئی کمان کا تیر ہے، جو جدید میزائلوں کی طرح اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ اس کی غزل رومان پرور فضاؤں میں سانس نہیں لیتی، زندگی کی سچائیوں سے غذا حاصل کرتی ہے۔ راحت نے اپنی غزل کے موضوعات ہی نہیں رموز و علائم بھی اردگرد کے مانوس ماحول سے لئے ہیں۔ اس کے یہاں بے چین اور گونگے الفاظ بھی بول پڑتے ہیں اور چپکے سے کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو دلوں کو بے چین کر دیتی ہے، راحت کا لب و لہجہ کوش آہنگ پیکر آفرینی اور معنوی تہہ داری ایسے اوصاف ہیں، جو ان کی غزل کو اپنے معاصرین سے منفرد کرتے ہیں۔ راحت کے تخلیقی سفر میں اس کی اگلی منزلوں کے روشن نشانات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔''

عبدالقوی دسنوی بھوپال لکھتے ہیں:

''راحت اندوری صاحب گزشتہ کئی برسوں سے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی شناخت بنانے اور انہیں مقام حاصل کرانے میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے رہے ہیں اللہ نے انہیں اچھی شاعری کے ساتھ اچھی آواز سے بھی نوازا ہے اس لئے مشاعروں میں دھوم مچا دیتے ہیں۔''

''راحت اندوری اپنی شاعری کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ زندگی کے تلخ اور شیریں تجربوں او ر حقیقتوں کو پیش کرتے رہے ہیں۔ قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے ہوئے اپنا قدر داں بناتے رہے ہیں، بیشک ان کی شاعری اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ وہ شاعری کی دنیا میں اور نیک نام ہوں اور اردو کے خزانے میں نمایاں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوں۔''

احتشام اختر (کوٹہ) لکھتے ہیں:

''راحت اندوری میرے پسندیدہ شاعر ہیں، ان کے کلام میں بلا کی تازہ کاری اور جدت ہے، جتنا اچھا وہ لکھتے ہیں اس سے زیادہ اچھے انداز سے وہ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے ہیں، مجھے انہیں مشاعروں میں سننے کا موقع ملا ہے راحت اندوری نے نئی شاعری کو مشاعروں میں مقبول بنایا ہے یہ ان کا ایک کارنامہ ہے ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے، خود مجھے بھی یہ شعر ذاتی طور پر پسند ہے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد رقم طراز ہیں:

''.........ذہین طباع اور خوش اخلاق راحت اندور سے نکلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک بن کر ہمارے مشاعروں کے مطلع پر چھا گئے جب میں نے پہلی بار ان کو سنا تو وہ ترنم سے اپنا کلام پڑھ رہے تھے۔ ترنم اچھا تھا مگر ان کی شاعری اور ان کی شخصیت سے ہم آہنگ نہ تھا، پھر انہوں نے تحت میں پڑھنے کا وہ طریقہ ایجاد کیا، جس کے بانی اور خاتم وہ ہی گردانے گئے۔ یہ انداز شعر خوانی آغا حشر کے ڈراموں کے کرداروں کے جیسا تھا جسمیں الفاظ اپنے معنیٰ اسم اپنے مسمیٰ اور ثمر اپنے مغز کا اشاریہ بنتا تھا مشاعروں کی شب بیداری اور سفر کی صعوبتیں راحت کے ادبی اور علمی سفر میں حائل نہیں ہوئیں۔ وہ خوب سے خوب تر کی جانب بڑھتے گئے، شرر، ستارہ اور ستارہ آفتاب بنا، انہوں نے ایم اے کیا اور مشاعروں پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ہنگامہ پروری نے سنجیدگی کا لباس پہنا، مشاعروں کی جادوگری میں علمی اور ادبی وقار شامل ہوا اور پھر جب ایک مشاعرے میں انہوں نے اپنا معرکتہ الآراء شعر پڑھا:

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

تو علی سردار جعفری کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی، انہوں نے سراپا داد بن کر میری طرف دیکھا

اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر نوٹ کرلیا۔ راحت کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہوکر منظر عام پر آ چکے ہیں عالمی سطح پر مشاعروں کے حوالے سے ان کا نام جانا پہچانا جاتا ہے۔ شہر ادب کی فصیلوں پر تعلقات، رسوخ گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی کا دودھ پی کر بڑے بڑے ناگ لہرا رہے ہیں، نئے آنے والوں کیلئے دروازہ مشکل سے کھولتے ہیں مگر راحت کے ہاتھوں کی دستک اور قدموں کی دھمک اتنی تیز ہے کہ اگر ٹھیکے داروں نے دروازہ نہ کھولا تو شہر ادب کی فصیل میں شگاف پیدا کر کے چیختے اور چنگھاڑتے ہوئے اپنی شاعری کو عہد حاضر کی تاریخی دستاویز بنا کر اس میں داخل ہو جائیں گے اور کوئی ان کو روک نہ سکے گا۔''

ساغر خیامی دہلوی کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری کی شاعری اور شخصیت پر قلم اٹھانے میں یہ قباحت درپیش ہے کہ میں جو بھی دائرہ کھینچتا ہوں اس دائرے سے ان کی شخصیت اور فن باہر ہو جاتا ہے اور الفاظ میرے قلم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں راحت اندوری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو چوری نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کے انداز کے شعر کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو وہ انداز سخن عطا کیا ہے، جس پر رشک آتا ہے۔ راحت کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اگر ان کو انسان کہوں تو فرشتے کیسے ہوتے ہیں۔ اگر فرشتہ کہوں تو انسان کیسے ہوتے ہیں۔ وہ انسان اور فرشتہ کے بیچ کی کڑی ہیں اپنے بڑوں کا ادب کرنا ان کا شیوہ ہے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کے ضمیر میں ہے، ان کی یہ صفت ان کے ہی ایک شعر سے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

آپ کی نظروں میں سورج کی ہے جتنی عظمت
ہم چراغوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں

بہر حال ایسے شاعر اور فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اس صدی میں جینے والے قابل تحسین اور مبارکباد ہیں کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے، جس میں راحت اندوری اپنی پوری ادبی تابانیوں کے ساتھ موجود ہیں میری دعا ہے کہ اللہ ان کو طویل عمر اور صحت عطا کرے تاکہ وہ علم وفن

کے چراغوں کو روشن کرسکیں۔''

ان آراء کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا کوئی حریف نہیں اور نہ ان کی کسی سے چشمک ہی ہوسکتی ہے جو شخص بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ برقرار رکھنے کا خوگر ہو صرف انا کی بنیادوں پر اس کی شخصیت نہ استوار ہو اس کا کوئی حریف کیسے ہوسکتا ہے۔ ویسے اردو تاریخ میں ایسی مثالیں قدما سے لیکر عہد حاضر تک دیکھی جاسکتی ہیں کہ آپسی شاعرانہ چشمک ہر عہد میں رہی۔ لیکن راحت کے ساتھ ایسا کوئی معرکہ جوڑا نہیں جاسکتا کہ کسی شاعر یا ادیب سے ان کی چل رہی ہو۔ راقم کے خیال کو تقویت ان شخصیات کی آراء سے بھی حاصل ہوتی ہے جو راحت کی طرح اندور سے تعلق رکھتے ہیں، مثال کے طور پر اندور کے چند اکابرین ادب کی آراء ملاحظہ کیجئے:

پروفیسر اے اے عباسی (اندور) تحریر کرتے ہیں:

''۱۹۳۶ء میں آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم انگلینڈ گئی تو وہاں کے ایک اخبار نے اس ٹیم کے ہر کھلاڑی کا تعارف ایک ایک پیراگراف میں شائع کیا جب سر بریڈ مین (جو اپنے کھیل کی زندگی کی معراج پر تھے) کا نمبر آیا تو اخبار نے لکھا کہ ''بریڈ مین تو بریڈ مین ہیں'' موجودہ عصر کے نوجوان شعراء کا تعارف کراتے وقت ایسی ہی بات راحت اندوری کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ ''راحت اندوری تو راحت اندوری ہیں۔''

''میرا راحت سے تعارف عرصے سے ہے مگر اس تعارف کی شکل کچھ ایسی ہے، جیسے کسی نمائش میں کسی دلکش کھلونے کو دیکھ کر کوئی بچہ رک کر اسے دیکھے، آنکھ بچا کر چھو لے مگر قیمتی ہونے کی وجہ سے خریدنے کی ہمت نہ کرے۔ اور آئندہ سال کی نمائش تک کیلئے اپنی خواہش کو دبا دے۔ راحت اسی طرح میری گرفت سے کھسکتے رہے ہیں چند سال ہوئے راحت قنوج (یوپی) کے مشاعرے میں شرکت کیلئے گئے تھے، تعطیلات گرما میں جب قنوج گیا تو پتہ چلا کہ راحت شہر کے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا گئے ہیں۔''

''اردو شاعری پر روایتی شاعری بہت حاوی رہی ہے اور جس شاعر نے بغاوت کرنے کی

جسارت کی وہ شروع شروع میں پریشان ہوا لیکن اگر ڈٹا رہا تو میدن جیت لیا۔ راحت اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ وہ سماج کے جس طبقے میں پیدا ہوا وہ دنیا کے ہر ملک کا سب سے بڑا طبقہ ہوتا ہے۔ (متوسط طبقہ) اور اس کے مسائل کی عکاسی راحت نے بحسن وخوبی کی ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کو راحت بہت عمیق نظر سے دیکھتا ہے اور اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے اس کا جو پہلو دوسروں سے انوکھا ہے وہ ہے اس کے تیور۔ اس کے تیوروں میں عزم وحوصلہ ہے اس کی غزل میں وہ رومانیت نہیں ہوتی، جو غزل کا تقاضہ ہے مگر رومانیت کی راہ سے وہ زندگی کی اصلیت بتا کر تڑپا دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے والوں کو ہی سراہا جاتا تھا مگر راحت نے تحت اللفظ کا جھنڈا اگاڑ دیا ہے۔ جگر مرادآبادی کے ترنم کی نقل کرنا ان کے زمانے میں عام فیشن تھا۔ آج راحت کی طرح اشعار پڑھنا دوسرے شاعر شان سمجھتے ہیں۔'' (۱)

ڈاکٹر ایم اے فاروقی (اندور) راحت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''راحت کے بارے میں کچھ لکھنا آفتاب کو دیا دکھانا ہے میرے لئے فخر کی بات ہے کہ جس دور میں راحت اندوری اسلامیہ کریمیہ کالج کے شعبہ اردو میں پروفیسر تھا میں وہاں پرنسپل تھا اور اس دوران انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ راحت اندوری آج شاعری کا طویل سفر طے کرتے ہوئے کامیابی کی جس منزل پر پہنچے ہیں اس میں اسلامیہ کریمیہ کالج کا تعاون بھی شامل ہے راحت جب بھی ملے اسی خندہ پیشانی اور انکساری سے ملے، غرور کا کہیں نام ونشان نہیں دور دور تک اس بات کا احساس نہیں کہ عالمی شہرت یافتہ شخصیت بن چکے ہیں۔ پروردگار سے یہی دعا ہے کہ اردو ادب کی خدمت کیلئے راحت کو لمبی عمر عطا کرے۔''

مندرجہ کلمات راحت کی شخصیت اور فن پر بیان کردہ داخلی شواہد کے طور پر تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ یہ بات ضرور حیرت انگیز ہے کہ آسمان ترقی اور مقبولیت تک پہنچ کر بھی ان میں غرور وتمکنت کا کوئی

---

(۱) تاثرات پروفیسر اے اے عباسی

شائبہ نہیں اور جہاں تک ان کے کلام اور انداز پیش کش کا تعلق ہے انہوں نے اپنے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

راحت اندوری کے جو پہلے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں اُن کی ارباب ذوق اور اہل دانش کی نظر میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے، پہلا مجموعہ ''دھوپ دھوپ'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ رُت ''دیوناگری میں'' ۱۹۸۳ء میں چھپا۔ تیسرا مجموعہ ''میرے بعد'' یہ بھی دیوناگری میں ۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوا اور چوتھا مجموعہ اردو میں پانچواں دوریش ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا، جہاں تک دوسرے مجموعہ ہائے کلام کا تعلق ہے یہ پسندیدگی اور پذیرائی کے لحاظ سے سب سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ راحت کا ایک اور مجموعہ کن فیکون زیر طبع ہے، جو راقم کی نظر سے ابھی نہیں گزرا ہے۔ لیکن یقین ہے کہ وہ بھی راحت کے پچھلے مجموعوں کے مقابلہ میں اگر بڑھ چڑھ کر نہیں تو ان کا ہم پلہ ضرور ہوگا۔ اس بیچ دیوناگری میں ناراض نام سے سنہ ۲۰۰۹ء میں ایک نیا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

راحت کی شادی اور اولاد

راحت کی شادی دیواس میں سیما خاتون سے ہوئی، جن کا تعلق ایک شریف اور متوسط گھرانے سے تھا۔ راحت کی ان اہلیہ سے تین اولادیں ہوئیں، سب سے بڑی جوہی (ایک بیٹی کا نام) ہے جس کی ولادت ۲۷؍ستمبر ۱۹۷۸ء ہے۔ فیصل قریشی کا سن پیدائش ۱۶؍جون ۱۹۸۰ء ہے، اور ستلج قریشی کا سن پیدائش ۱۱؍مارچ ۱۹۸۲ء ہے۔

راحت کے والد نے متعدد مکان بدلے، آخر جب انہوں نے اپنا مکان خود تعمیر کروالیا تو وہاں مع اہل وایال اس میں رہنے لگے۔ راحت نے کھجرانہ میں اپنا نہایت خوبصورت مکان بنوالیا ہے اس لئے اکثر کھجرانہ والے مکان میں رہتے ہیں اور اپنے والد کے بنوائے ہوئے مکان میں بھی رہائش رکھتے ہیں اس طرح باری باری وہ کبھی شری نگر ایکسٹنشن (والد کے تعمیر کردہ مکان) اور کبھی کھجرانہ (اپنے تعمیر کردہ مکان) میں رہتے ہیں۔

راحت اندوری کے شوق، اخلاق و عادات

راحت اندوری نے اس عہد میں جب ہر طرف قحط الرجال جیسا منظر نامہ ہے، خوش اخلاقی، ایثار پسندی، مروت اور رواداری کے ایسے ثبوت بہم پہونچائے ہیں جن سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ اس آؤٹ ڈیٹیڈ ٹ (Out dated) زمانے میں کسی طرح نباہ رہے ہیں اس کا ثبوت ان کے چھوٹے بھائی عادل قریشی کے مطابق اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ راحت کا سب سے زیادہ بلکہ واحد شوق نئے نئے کپڑے سلوانے اور پہننے کا تھا۔ اسی سلسلے میں خاص لطف کی یہ بات ہے کہ وہ ان نئے کپڑوں کو لاکر سب سے پہلے اپنے بھائی عادل کو پہننے کیلئے دیتے تھے اور پھر بعد میں انہیں خود پہنتے تھے یہ طریقہ ان کا کافی دنوں تک بدستور چلتا رہا۔ محض چند سالوں سے اس پابندی کی شدت میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ راحت نہایت با اخلاق بامروت اور رنگا رنگ طبیعت و مزاج کے حامل ہیں۔ شہرت کی بلندیوں پر فائز رہ کر بھی وہ زیادہ تر غریب لوگوں، رشتہ داروں اور پرانے دوستوں سے عام لوگوں کے برعکس ملنا جلنا اور مراسم رکھنا نہیں بھولتے، ان کے بھائی عادل قریشی کا بیان ہے:

''خدا کا شکر ہے کہ شہرت کے آسمان پر پہنچنے کے باوجود زمین سے راحت بھائی کا رشتہ استوار ہے، شکاگو یا نیویارک کا مشاعرہ پڑھ کر لوٹنے کے بعد ان کا پہلا ٹھکانہ آج بھی رانی پورہ کا پٹیا ہی ہوتا ہے۔ بچپن کے جوانی کے دوست جو کڑے وقت کے ساتھی تھے آج بھی اقربا کی ان کی لسٹ میں وہی نام موجود ہیں جو شخص اپنے دوستوں کی بیماری یا دکھ کو دیکھ کر رو پڑتا ہو اور اپنی حیثیت سے زیادہ مدد کرنے کیلئے بیتاب رہتا ہو اس کے بارے میں یہ بتانا بے معنیٰ ہے کہ والدین کے آخری دنوں میں انہوں نے کس طرح اور کتنی خدمات انجام دی ہیں .... رشتہ داروں کی خوشی یا غم میں شریک ہونا راحت بھائی کا معمول ہے۔ ایسے موقعوں پر انہوں نے کبھی نہ نہیں دیکھا کہ کون سا مشاعرہ چھوٹ رہا ہے یا اکسپوز Expose کا کتنا اہم چانس Chance ہاتھ سے جا رہا ہے۔''(۱)

---

(۱) چھوٹے بھائی جان، عادل قریشی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء، ص ۴۲۹

راحت کے اخلاق اوران کی شرافت نفس پر روشنی ڈالتے ہوئے معراج فیض آبادی لکھتے ہیں:

''ایک ذاتی بات بھی .... میرے اپنے خاندان میں کتنے لوگوں نے مجھ سے اپنے بچوں کے لئے نام پوچھے لیکن رکھے کسی نے بھی نہیں، راحت کا بیٹا فیصل جب پیدا ہوا تو راحت نے یہ خوش خبری مجھے سنائی اور کہا کہ معراج بھائی اس بچے کا نام آپ کو رکھنا ہے، میں نے اس کا نام ''فیصل'' رکھا، میں جانتا ہوں کہ راحت کے اہل خاندان نے بہت سے نام اور تجویز کئے ہوں گے، ہوسکتا ہے اس نام کی مخالفت بھی ہوئی ہو مگر آج میرے قد سے کچھ اونچا وہ بیٹا فیصل ہو رہا ہے۔ خدا اُسے اپنے حفظ وامان میں رکھے، بظاہر یہ ایک بہت معمولی سی بات ہے مگر سوچئے تو راحت کی شرافتوں کی آئینہ دار ہے۔''(۱)

جوہر کانپوری اپنی راحت سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.............. اس دن مجھے احساس ہوا کہ جس کا نام راحت اندوری ہے وہ ایک عظیم فنکار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہے۔ رفتہ رفتہ قربتیں بڑھنے لگیں ان کے قریب آنے پر محسوس ہوا کہ ایک اچھا انسان ہونے کیلئے جو اوصاف ضروری ہیں وہ سب کے سب راحت اندوری میں موجود ہیں اپنے بزرگوں کا احترام جیسے ان کے جینے کا مقصد ہو اپنے چھوٹوں پر شفقت لٹانا جیسے ان کا محبوب مشغلہ ہو، مہمانوں کی مدارات کو وہ جیسے عبادت سمجھتے ہوں، ضرورت مندوں کی امداد کرنا وہ فرض اولین سمجھتے ہوں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اگر وہ بڑے بھائی بن کر ملیں تو آدمی اپنے حقیقی بھائیوں کو مل جائے، دوست بن کر ملیں تو دوستی ناز کرے، اپنے غم کو بھول کر دوسروں کے غموں کو سمیٹنا ان کے قلندرانہ مزاج میں شامل ہے اپنے آنسو پی کر دوسروں کی دلجوئی کرنا ان کی فطرت ہے۔ گرے ہوؤں کو سہارا دینا ان کی عادت ہے ان میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ دوست تو وہ ایسے ویسوں کو بنا لیتے ہیں، لیکن دشمن وہ اپنے معیار کا چاہتے ہیں۔ کسی نے ان سے دشمنی کی بھی تو انہوں نے یہ جنگ تلوار سے نہیں اخلاق سے جیتی ہے۔''(۲)

---

(۱) بائیں کاندھے کا فرشتہ، معراج فیض آبادی، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۵۴

(۲) میرا آئیڈیل راحت اندوری، جوہر کانپوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۳۷۶

راحت اندوری کے اخلاق اور دوستی نبھانے کے جذبہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور ناظم مشاعرہ انور جلال پوری کا یہ تاثر ملاحظہ کیجئے:

''راحت کا تعلق دوستوں سے عشق کی حد تک مضبوط ہے اسے وفاداری اور بے وفائی کی حدود کا علم ہے، وہ منزل آنے سے پہلے راستے میں کسی ہم سفر کے رویے پر تبصرہ کرنے کو بے وقت کی تنقید سمجھتا ہے، وہ دشمنی کا روپ اختیار کر لینے والی دوستی کو حالات کی ستم ظریفی سے تعبیر کرتا ہے۔ منافقت عیب جوئی سے اس کا مزاج کوئی سمجھوتا نہیں کرتا اس نے زندگی کو کھلی کتاب بنا رکھا ہے۔ اس کی میخواری پر تبصرے بھی عام تھے، اور اب اس کی ترک مے نوشی کے تذکرے بھی عام ہیں۔ اس نے پی، خوب پی، برسوں تک پی، جتنی خود پی اس سے زیادہ دوستوں کو پلائی، میکدے میں پی، ہوٹلوں میں پی، ریل گاڑیوں میں پی، ہوائی جہاز میں پی، زمین کے اوپر پی، آسمان کے نیچے پی، مگر جو کچھ کیا سے کسی سے چھپایا نہیں اس نے اپنے اصلی چہرے پر کوئی نقلی چہرہ نہیں لگایا اسی لئے تو بڑے اعتماد سے وہ کہتا ہے:

یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ بت خانہ ہے
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں (۱)

راحت اندوری صاحب ظرف ہیں اس لئے محسن کشی جیسی لعنتوں کا وہ کبھی شکار نہیں رہے اور پھر اس معاملے میں وہ کبھی کسی معیار کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر کسی نے ذرا سا بھی حسن سلوک کیا یا اس کا اظہار کیا راحت اس کی عنایت اور مہربانی کے قائل ہو جاتے ہیں اس رویے سے اکثر ان کو تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں کبھی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے اور کبھی خلاف امید درپیش ہونے والی مصیبتوں میں پھنس بھی گئے مگر اس کے باوجود ان کا پیمانہ ظرف کبھی چھلکا نہیں۔ اس کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی فطرت صلح کل کی طرف بقول حافظ شیرازی ہمیشہ مائل رکھتی ہے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام ● با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

---

(۱) راحت میرا یار، روشنی کے سفیر، انور جلال پوری ۲۵ رجون ۱۹۹۰ء ص ۱۹۲

راحت اندوری کے حلقہ احباب میں ایسے کئی افراد بھی شامل ہیں جو اعلیٰ ظرف کے حامل ہیں یا محسن کش ہیں لیکن راحت جان بوجھ کر بھی دونوں طرح کے لوگوں کو اپنائے رہتے ہیں۔ اچھے تو ان کے دل ودماغ کا ایک جزلا ینفک بن کر ساتھ نبھاتے ہیں اور کم ظرف اپنا ظرف خود ہی چھلکا کر دور ہو جاتے ہیں لیکن یہ امر بھی تعجب خیز ہی ہے کہ یہی خامکار افراد جب دوبارہ راحت کے قرب کے خواہاں ہوتے ہیں تو راحت بغیر کسی شکوہ وشکایات کے ان کیلئے دوبارہ اپنا دل کھول دیتے ہیں یہی ایک اعلیٰ ظرف کی صفت کہی جاسکتی ہے۔عربی کہاوت ہے "**الانسان مرکب من الخطاء والنسیان**"خطااور بھول چوک انسان کی فطرت ہے۔ مشاعروں میں اچھے اور برے ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں ایسے ماحول میں رہ کر انہوں نے اپنے استقلال میں کبھی لغزش نہیں پیدا ہونے دی اور کبھی اگر کوئی بھول چوک ان سے ہو بھی گئی تو وہ فوراً سنبھل گئے اور اس کی اصلاح کر لی اور دام فریب سے باہر آ گئے، جہاں سے بیشتر حالات میں نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

راحت خوش گفتار وخوش اخلاق انسان ہیں ،شوخی ان کی فطرت ہے مگر راحت کی شوخیاں حد سے متجاوز نہیں ہوتیں اور جب وہ اپنی فطرت کا اظہار کرتے ہیں تو ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے،ان کی حاضر جوابی ان کی گفتار کی دلیل بن جاتی ہے۔لطیفے گڑھنا اور سنانا بھی راحت کی عادات کا ایک حصہ ہے۔ایسے موقع پر بھی وہ پاس ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں دوسروں کی دل شکنی انہیں قطعی گوارا نہیں ہے خواہ وہ صرف زبانی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسروں کے ساتھ بھلائی کر کے بھول جانا ان کا خاصہ ہے اگر کوئی دوسرا یاد بھی دلائے تو اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔

خوش لباسی انہیں پسند ہے مگر بے جوڑ اور بے تکے لباس وہ زیب تن نہیں کرتے اسی طرح مرغن اور متلذ ذ غذاؤں کے بھی شائق ہیں مگر کبھی کبھی ،اکثر سادہ کھانا ہی ان کی غذا ہوتی ہے۔

ہندوستان میں ہوں یا بیرون ملک اپنی زبان اور اپنی تہذیب کا ہمیشہ لحاظ رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ نامانوس تہذیبوں اور زبانوں سے اچھائیاں اخذ کرنا بھی نہیں بھولتے۔اسی طرح دوسروں

کے مذاہب کا بھی احترام ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کی خوبیوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ مذہبی کٹّر پن یا ملائیت کے وہ قائل نہیں بلکہ خذ ما صفا اور دع ما کدر کے وہ خوگر ہیں۔ ایسے پہلوؤں کے وہ سخت مخالف ہیں، جنہیں مذاہب کی بنیاددوں پر نہیں بلکہ روایتوں کے سہارے مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہو۔

مطالعہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، ہر موضوع سے متعلق کتابوں کا گہرائی اور سنجیدگی سے مطالعہ کر کے اس کا تجزیاتی اظہار ان کی فکری وسعتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ شعروادب کی کتابوں کے ساتھ سماجی، سیاسی اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرنا بھی ان کا مشغلہ ہے۔ ایسی کتب جو محض روایتی بنیاددوں یا موضوعات کی حامل ہوں ان سے راحت کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ بلکہ بقول رواں اناوی:

مجھ سے کوئی کیوں کہے یہ کفر یہ اسلام ہے
میں وہ مے کش ہوں کہ ہر پیمانہ جس کا جام ہے

راحت اندوری گھر کی ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھتے ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کا ہمیشہ ان کے مدنظر رہتی ہے۔ اہلیہ کے خانگی معاملات اور ذمہ داریوں میں ان کی مطابقت کرتے ہیں۔ ان کی بیگم بھی ان کے شاعرانہ اور ادبی مزاج میں خود کو بھی ڈھالنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے بڑی خوش گوار رہتی ہے۔ والدین کی اطاعت ان کی فرمانبرداری کا خیال انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا ہے ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں ان کی مرضی اور خوشی سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ اسی طرح دوستوں اور احباب سے بھی ان کا معاملہ رہتا ہے۔ دوستوں کی خبر گیری کرنا ان کے متعلق دوسروں سے دریافت کرنا ضرورت مندوں کی حتی الوسع امداد کرنا ان کا اصول حیات ہے۔ طلباء و طالبات کے مستقبل کو شاندار بنانے اور روشن بناسکنے کی فکر میں ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ ایک اچھے استاد کی حیثیت سے بھی وہ حلقہ درس وتدریس میں بھی مقبول رہے ہیں۔ ان کے شاگرد طلباء و طالبات دونوں ان سے مطمئن اور ان کی موجودگی کو اپنے حق میں بہت اہم اور مفید سمجھتے رہے ہیں۔ راحت کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے کہ ہمیشہ کسی ناگوار بات یا ماحول میں اپنی آواز کو بلند نہیں

ہونے دیتے۔ اگر کوئی اختلاف آراء بھی ہوا تو اسے بڑے نرم اور دھیمے لہجے میں سمجھانے یا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی کسی بدترین دشمن کے ساتھ بھی سازش نہیں کرتے اور نہ کسی سازش میں ملوث ہوتے ہیں۔ عملی طور پر وہ کبھی کسی کے نقصان کا خیال تک دل میں نہیں لاتے، بقول خود:

ہوں لاکھ ظلم مگر بددعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

غرض کہ راحت اندوری اخلاق و عادات کے اعتبار سے ایک ایسے شخص ہیں، جو اس غرض بھری دنیا میں خلوص اور اخلاق کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔

باب دوم

راحت اندوری کا عہد
اور اس کا
ادبی پس منظر

خوش وقت شعرائے کرام

(داہنے سے) انور جلال پوری، راحت اندوری، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، الطاف ضیاء، رئیس انصاری

یاران میکدۂ سخن

(داہنے سے) راحت اندوری، انور جلال پوری، منور رانا

دنیا کی تمام بڑی زبانوں کے ادبی اور شعری کارناموں میں ان کے عہد کے سیاسی، معاشی، اقتصادی، تہذیبی، معاشرتی اور تقاضوں کی عکاسی ضرور نظر آتی ہے۔ اردو کا دامن بھی اپنے عہد کے حالات ومسائل کے اذکار سے پُر نظر آتا ہے اور یہ حالات جیسے جیسے بدلتے گئے اردو شعروادب کی قدریں بھی تبدیل ہوتی گئیں۔ بہ الفاظ دیگر قدیم اقدار کی جگہ جدید اقدار شعروادب میں بھی پیدا ہونے لگے، جو اردو کی وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

راحت اندوری نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا اس عہد پر ہندوستان کی مختلف سیاسی، سماجی، ادبی اور شعری تحریکات کے اثرات تھے۔ انجمن پنجاب ۱۸۷۴ء کے ذریعے آزاد اور حالی نے سماجی حالات کے پیش نظر اردو شعروادب میں جو عظیم تبدیلیاں پیدا کرنے کی ان تھک فکر کی تھی وہ بتدریج ارتقائی سفر سے گزرتے ہوئے اس منزل پر آ گئی تھی، جہاں راحت اندوری نے عزم تازہ کے ساتھ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اگر ہم لکھنؤ کے عہد نوابی کے اس معاشرے پر نظر ڈالیں جس میں عیش پسندی، حد سے بڑھی ہوئی تلذذ پسندی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، جس کی وجہ سے اردو شاعری میں مبتذل خیالات مبالغہ آمیزی

پرمبنی اظہار بیان کی ایسی بدنما صورتیں پیدا ہوگئی تھیں، جن کی بنیاد صرف امراء ورؤساء کی خوشنودی اور پسندوں اور کذب آمیز تصورات پرمبنی تھی۔ ایسے ادب کے پس پردہ اس عہد کے سیاسی سماجی تہذیبی کار فرمائیاں تھیں اس لئے وہ عہد شاعری غیر متحکم غیر فطری اور غیر ضروری روایات کا رسیا ہونے کے باوجود مقبول ترین بن گیا تھا۔ تاریخ اردو میں ایسی منزلیں بھی نظر میں آتی ہیں کہ اپنے عہد کے بطن سے پیدا ہونے والے حالات مستقبل کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور انہیں تعلیمی علمی ادبی اور شعری سطحوں پر تبدیل کرنے کے امکانات کو تلاش کیا جاتا ہے، جس کا انحصار سیاسی، سماجی، اقتصادی تبدیلیوں سے متعلق صورتوں پر استوار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہ آبادی کے زمانے سے لیکر آج کے زمانے تک نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ حالی اور ان کے ہمنواؤں نے اردو شعروادب کو جس اصلاحی اور عملی صلاحیتوں سے آشنا کیا اس نے آگے چل کر مغربی تصورات شعروادب سے اثر پذیر ہوکر اردو شاعری صرف مقامی شاعری نہ رہ کر بلکہ بین الاقوامی شاعری بن گی، جس کی مثال اقبال کی آفاقی اور کائناتی شاعری ہے، جو ایک اعتبار سے حالی کی اصلاحی تحریک سے نشو ونما پاکر آفاقیت کی منزلوں تک پہنچ گئی۔

اقبال کے تصورات شاعری میں انسانیت کی بہبود و بقا اس کے تحفظ محکومیت وحاکمیت غلامی اور حریت یا جو تصورات نظر آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے انسانی عظمت و وقار اور عمل کو وقار کائنات کے حصول کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ اس طرح پہلی بار نہایت وسیع پیانے پر انسان کو اس کی انفرادیت سے آشنا ہونے پر زور دیا ہے، جسے اکابرین نقد ونظر نے اقبال کی افادیت کو خودی کا نام دیکر اسے ان کی شاعری کا منفرد تصور قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اقبال کا یہی انداز فکر اردو شاعری کی تروتازگی کا ضامن بھی ٹھہرا، ان کے زمانے کے بہت سے شعراء اس نئی فکر سے متاثر ہوئے، بقول مجنوں گورکھپوری:

''خوش باش، ہماری شاعری کا بیشتر حصہ ہمارے لئے یا تو تفریح تھا یا ماتم۔ اردو شاعری نے

زندگی کی کائناتی اور اجتماعی حقیقتوں پر بہت کم دھیان دیا اس کو زندگی سے بہت کم واسطہ تھا اجتماعی یا جمہوری زندگی کا احساس تو اس میں سرے سے مفقود تھا۔ اقبال حالی اور آزاد کے بعد پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے ہماری شاعری میں آفاقی زندگی کا شعور پیدا کر کے نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا کئے۔'' (۱)

اقبال کی فکری وسعتوں نے اردو شاعری کی نئی نسل کو بے حد متاثر کیا اس نے انسانی عظمتوں سے روشناس کرانے کے ساتھ وطنی محبت کے جذبے کو بھی ابھارا، جس سے آگے چل کر آزادی وطن اور حریت کا جذبہ اردو شاعری میں فروغ پانے لگا، حالی سے اقبال تک اردو شاعری نے جن نئی جہات کا سفر کیا اس میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، برج نرائن چکبست، آنند نرائن ملا، ظفر علی خاں، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم جیسے شعراء شامل تھے۔ ان شعراء نے سیاسی، وطنی اور عملی پیچیدگیوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے کیلئے اپنی شاعری کو وسیلہ بنایا۔ اس طرح اردو شاعری کو ایک عظیم الشان عہد میں ڈھال دیا۔ ایسی شاعری کے ذریعہ غریب امیر کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی گئی، محنت کش تاجر اور دولت مندوں کے درمیان حائل اونچ نیچ کی دیوار کو منہدم کر کے ایک ہو کر زندگی گزارنے کا شعور پیدا کرنے کا اردو شاعری کو وسیلی بنایا گیا۔ چنانچہ مندرجہ مسائل کے حل کیلئے ایک عملی منصوبے کے تحت ایک ایسی سماجی تحریک کو اردو شاعری میں سمو دینے کی کوشش کی گئی، جس کی بنیاد کارل مارکس کے اقتصادی اور سماجی نظریات پر استوار کی گئی اور اس کا نام ترقی پسند تحریک تجویز کیا گیا۔ اس تحریک کے وسیلے سے اردو شاعری میں ایسے رجحان کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جس میں سماج کے پسماندہ افراد کے مسائل کو ترجیح دی گئی تھی۔ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف عوام الناس کو ڈھارس دی گئی بلکہ ان کیلئے عملی قدم اٹھانے کا بھی عزم پیدا کیا گیا اور ان ناانصافیوں کو اردو شاعری کے ذریعے روکنے کی کوشش کی گئی، جو ہندوستانی سماج میں طوفان کی مانند بڑھ رہی تھیں۔ اسی زمانے میں سماج میں در آئی ایسی غیر ضروری مروجہ روایات اور توہم پرستیوں کی بھی روک تھام کی گئی، جس کے جال میں بھولے بھالے ہندوستانی جکڑے ہوئے تھے۔ ذات پات کی بنیاد انسانوں

---

(۱) اقبال کا اجتماعی تبصرہ، مطبوعہ اقبال مذاکرے کے چند مقالات ناشر جواہر لال نہرو اور دہلی یونیورسٹی ۲۱ تا ۳۲ / اپریل ۱۹۷۷ء ص ۶۱

کی تفریق و تقسیم کے خلاف بھی آواز بلند کی گئی، اس کا یہ ایک خوش آئند پہلو تھا کہ اردو ادب کا بیدار ذہن شاعر اور ادیب اس ضمن میں ذرہ بھر بھی سست روی سے نہیں بیٹھا بلکہ اپنے ادب کے ذریعے انہیں ابھارنے اور محبوس زندگی سے نجات دلانے کی فکر کی۔ ان تمام کارروائیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر اسی زمانے کے فنکاروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کی اور اس کا با قاعدہ لائحہ عمل ترتیب دے کر اس عہد کے شعر و ادب کو با مقصد بنانے کی عملی جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں اختر حسین رائے پوری نے ایک زبردست اور خوش فکر و خوش آئند مقالہ تحریر کیا۔ سردار جعفری، انور عزیز احمد نے بھی دو تصانیف ترقی پسند تحریک کے عنوان سے لکھ کر اس فکر کو پروان چڑھانے کی سعِ بلیغ کی۔ سید احتشام حسین، سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری نے بھی کھل کر ترقی پسند تحریک کو ابھارنے اور نیا روپ دینے کی ان تھک کوشش کی۔ پریم چند سے لیکر سہیل عظیم آبادی تک متعدد افسانہ نگاروں نے بھی اسی رویے کی اپنے اپنے طور پر تبلیغ کرنے میں دریغ نہیں کیا اور پھر تو آدمی آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ سردار جعفری، فیض احمد فیض، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، مجروح سلطانپوری، غلام ربانی تاباں، کرشن چند، خواجہ احمد عباس، راجیندر سنگھ بیدی سحر مہندر ناتھ وغیرہ وغیرہ نے اپنے شعری پیرائے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اس نظریہ کو فروغ دینے کی سعی مستحسن انجام دی، ساتھ ہی ایک ایسی ادبی و شعری فضا تیار کی، جس کے وسیلے سے نوجوان ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کیا گیا۔ خلیل الرحمان اعظمی، عمیق حنفی، شہریار، بلرام کومل، سریندر پرکاش، جوگیندر پال، باقر مہدی، قیصر جعفری، عزیز قیسی، ندا فاضلی، اختر راہی اور ظفر گورکھپوری وغیرہ نے بھی شروع میں بڑے حوصلے سے اس تحریک سے وابستگی کا اظہار کیا لیکن بعد میں تحریک کے کچھ آئینی رویوں سے کچھ لوگ منحرف سے ہونے لگے لیکن بہتوں نے اس نظریہ کہ کھل کر تائید کی ان کے نام ہیں: اختر سعید خاں، کیف بھوپالی، محمد علی تاج، شہریار، ظفر گورکھپوری اور قیصر حسین وغیرہ جنہوں نے اپنی ذہنی، عملی وابستگی کو ہمیشہ قائم رکھا، ترقی پسند تحریک کن ہی وجوہات کی وجہ سے ہر ایک کو یا ہر ذہن و قلب کو اپنی طرف راغب نہ کر سکی لیکن اس کی فنی

عظمت نے عوام کے دل و دماغ کو بڑی حد تک اپنی جانب متوجہ بھی کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایسے ذہن بھی پیدا ہونے لگے تھے، جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو محض کھوکھلی نعرہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں دی، سماجی اصلاح، ملت پرستی، سماجی بغاوت، انقلابیت، اشتراکیت، جمہوریت جیسی فکروں سے گریز کر کے اس نے عرفان ذات کو اہمیت دینی شروع کی اور اس کے وسیلے سے اپنی ذات کے آئینہ میں کائنات کے جلوے دیکھنے کی کوشش کی۔ مشہور مثل ہے کہ آدمی پہلے گھر میں چراغ جلاتا ہے بعد میں مسجد میں اسی قول کے مطابق ذہن خارجیت سے داخلیت کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے اردگرد کے تمام روایات سے قطع تعلق کر کے داخلیت کی جانب اپنا رخ پھیر لیا جس کی طرف خلیل الرحمٰن اعظمی نے یوں اشارہ کیا ہے:

''اس کے منفرد نظریوں خانوں فارمولوں اور نعروں میں رہنا پسند نہیں کیا، اور نعرہ بازی سے اپنا دامن بچالیا ہے۔ وہ کسی وقتی یا ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کیلئے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر پاتا وہ زندگی کی تمام وحدتوں کو اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ دیکھنا پرکھنا اور برتنا چاہتا ہے۔'' (۱)

گویا اس نئی نسل نے وحید صبا کے اس قول کی تائید کی کہ:

''جدید شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ جدید شاعری ایک رجحان ہے جو تمثالوں اشاروں اور بیانات کے ذریعے ذاتی تجربات کی روشنی میں ایک ہمہ گیر معاشرے کے ساتھ فرد کے رشتے کی عکاسی کرتا ہے۔'' (۲)

اسی قسم کے خیالات شمس الرحمان فاروقی نے بھی ظاہر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''داخلی اور معنویت کے لحاظ سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف تنہا کیفیت انتشار اور ذہنی بے چینی کا (کسی نہ کسی نہج سے) اظہار کرتی ہو جو صنعتی اور مشینی میکانکی

---

(۱) ماہنامہ شبخون الہ آباد جون ۱۹۶۸ء ص ۸

(۲) جدید شاعری اس کے خدوخال اور وسائل۔ مطبوعہ ماہنامہ شب خون الہ آباد فروری ۱۹۶۸ء ص ۲

تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔''(۱)

نئی شاعری کے اس رخ نے ایک الگ خیال اور لہجہ کو جنم دیا، جس نے سماجی ہنگامہ آرائیوں میں گم شدہ انسانی چہرے کی تلاش کرنی چاہی اس کا یہ عمل بڑا ہی اضطرابیت سے پر تھا۔ اس دور کا ذہن کشمکش بیزاری اور تشکیک کا شکار ہو گیا تھا اور اس طرح اسے سماج کے کھردرے مسائل سے منہ پھیر لینا پڑا اور اس کا اندازِ فکر غیر واضح اور محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اسی سبب سے اس عہد کی شاعری کا معتد بہ حصہ عورت کے تصور اور ذات انسانی کے تمام تر ہنگاموں سے خود کو نہ بچا سکا اور بڑی حد تک وہ شاعری کا حصہ ابتذال کی نذر ہو گیا۔ یہاں تک کھلے طور پر عریاں نگاری اشعار میں جگہ پا گئی مثال کے طور پر اس دور کے یہ اشعار دیکھئے جس کو آج صرف پھکڑ پن کا نام دیا جا سکتا ہے۔

دھرا کیا ہے بھلا الفت کے ان جھوٹے فسانوں میں
بھرم کھوٹے کھرے کا خود ہی کھل جائے گا راتوں میں

سخت بیگم کو شکایت ہے جہان نو سے
ریل چلتی نہیں گر جاتا ہے سگنل پہلے

شاعری کا یہ حصہ جدید شاعری کا مستحکم حصہ نہیں بن سکا اسے ہم صرف وقتی لذتیت کے تحت ابھرنے والے رجحان کا نام دے سکتے ہیں۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عزیز اندوری لکھتے ہیں:

''ایسے پرانے رشتوں سے جن حالات میں دور کر کے اپنی ذات تک پہنچانے تک سے محروم کر دیا گیا تھا ان حالات سے وہ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نیز اس نے اپنے حالات سے متعلق کسی بھی تحریک یا نظریے کو محض نعرہ بازی سے زیادہ اہم نہیں سمجھا۔ ان حالتوں میں وہ بعض صورتوں میں ذہنی انتشار اور تذبذب کا شکار بھی ہوا اور اس مستقبل سے بھی مایوسی اور محرومی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اسے یہ خیال ستانے لگا کہ اس طرح ہزاروں تعلیم یافتہ ماہرین صنعتی سندیں حاصل کئے ہوئے افراد بے

---

(۱) جدید شاعری ایک سمپوزیم ماہنامہ کتاب لکھنؤ سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۸

روزگاری کا شکار ہیں اس کا سبب اس کے نزدیک سماجی اجتماعیت ٹھہری۔اس لئے اس نے اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کو انہی پہلوؤں کی طرف موڑ دیا جو اسے اجتماعی ہنگاموں کے بجائے ذاتی سکون سے قریب تر کریں۔یہی وجہ ہے کہ اس نے ہنگامی خلوص اور اخلاقی قدروں سے بھی انحراف کر دیا اور اس کی تخلیقات میں اس نوع کے خلوص اور اخلاق کے نشانات برائے نام پائے گئے۔''(۱)

نئ شاعری کے ذریعے ہمارے بعض شعرا نے خواہ قدیم روایات شاعری سے کھل کر انحراف کیا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ان شاعروں نے قدیم روایات شاعری کے بعض حصوں سے اثرات بھی قبول کئے خاص کر ہماری غزل ان اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکی۔

اسی کے ساتھ دبستان لکھنؤ میں لکھنوی تعیش پسندی نے مسلط ہو کر جس تصنع آمیزی کو داخل کیا تھا اس نے میر کی حقیقت پسندی اور غالب کی فکری گہرائیوں کو بڑی حد تک مجروح کر دیا تھا ایک خیالی معشوق کی تخلیق نے اردو شاعری کو بناوٹی اور مبتذل بنا دیا تھا۔اس صورت حال نے حالی کو بے حد فکرمند کر دیا تھا اور اسی لئے انہوں نے اردو شاعری کیلئے ایک اہم منصوبہ تیار کیا، جو۱۸۸۴ء میں انجمن پنجاب کے نام سے ظاہر ہوا۔اسے ہم حالی کی اصلاحی تحریک کا نام بھی دے سکتے ہیں۔اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں سچے واقعات اور فطری پہلوؤں کو شامل کرنے پر زور دیا گیا ہے، جس سے رفتہ رفتہ آگے بڑھ کر اردو غزل کو نئے میلانات اور خدوخال عطا کئے اور جو بڑھتے بڑھتے اقبال اور چکبست کے ذریعے پختگی پا گئے اسی لئے ان کی شاعری میں بڑی رومانی لذت مبتذل اور سطحی جذبات کے بجائے حسن وعشق کے مطہر جذبات اور فطری جمالیات حسن کو مقبول بنانے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر اردو غزل کو ارضیت کی سچائیوں تک پہنچانے کیلئے حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، شاد عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری نے ذہنی ہوشمندی کے ثبوت دینے شروع کئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں حسن وعشق کے سوز و گداز کی زندہ جھلکیاں

(۱)اردو شاعری (ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک)مطبوعہ تنقیدی تحریریں ص ۱۳۵ ڈاکٹر عزیزی اندوری

نظر آتی ہیں۔ ان شعرا کی کوششوں کا یہ کرشمہ کہا جاسکتا ہے کہ حالی اور آزاد نے اصلاح شعر وسخن کی جو جوت جگائی تھی حالی کا منصوبہ اپنی نوعیت کی شکل میں نمودار ہونے لگا تھا۔ ذکر جاناں اور تذکرہ عشق کے جو میلانات ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں ان کی ارتقائی شکلیں بعد کے شعرا کے یہاں سامنے آنے لگی ہیں، جنہوں نے سماجی کرب کے اظہار کے ساتھ ذکر جاناں کی طہارت اور تازگی کو بھی ملحوظ رکھا ہے ان شعرا میں فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، مجروح سلطانپوری، غلام ربانی تاباں اور ساحر کاظمی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن ابر بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

(مجروح سلطانپوری)

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

(فیض احمد فیض)

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہیں

(مجاز)

یہی نہیں بلکہ غزل کو ذکر جاناں کے ساتھ ہی دیگر موضوعات سے مزین کیا جانے لگا بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''ان میلانات کے دائرے میں رہ کر غزل نے اپنے آپ کو وسعت دی اور اپنے آپ کو وسعت دینے کا یہ عمل اس پر برابر جاری رہا ہے۔ اس لئے آج اس میں یہ تمام رجحانات نظر آتے ہیں جو موجودہ زندگی میں موجود ہیں۔ زندگی کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک بات کو اس نے اس طرح اپنے

دامن میں سمویا ہے کہ وہ زندگی کا صحیح آئینہ معلوم ہوتی ہے اس لئے تو وہ اس موج زندگی سے ہم کنار ہے۔''

بقول اصغرؔ............................''بتوں میں حسن ہے اور شراب میں مستی''

اصغر غزل میں چاہئے وہ موج زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں (۱)

غرض کہ غزل نے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ مختلف منازل کو طے کرتا ہوا اس نسل جدید تک آ پہنچا جس نے سیاسی تشدد سامراجی استبداد اور ذہنی پابندیوں کے ساتھ ساتھ ایک آفاقی شعور تک خود کو پہنچا دیا، جس کی وجہ سے اردو غزل ایسے خارجی موضوعات سے قریب ہوگئی، جو زندگی کے مسائل کے ساتھ براہ راست وابستہ ہیں اور جس نے تحریکات سے وابستہ کر کے ان تمام پہلوؤں کو خود میں سمولیا جو زندگی کے تلخ اور شیریں معاملات اپنی فطری و معنوی علامت تسلیم کرتے تھے اور اس طرح ان ارضی تحریکات کی وجہ سے غزل جاذب نظر اور دلکش نظر آنے لگی اور غزل میں صرف تصوراتی عورت ہی نہیں بلکہ مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے والی عورت کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی سے کیا جانے لگا مثال کے طور پر:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئے

(فراق)

ہر ادا آب رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

(ناصر کاظمی)

ہر سو ترے وجود کی خوشبو تھی خیمہ زن
وہ دن کہ اپنا گھر بھی ترا گھر لگا ہمیں

(ظفر اقبال)

---

(۱) جدید شاعری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص ۲۵۲

رفتہ رفتہ شعرا نے غزل کو اپنے گرد و نواح کے مسائل سے بھی قریب کر دیا اور شنیدہ کے بجائے مشاہدات و تجربات کو اولیت دی جانے لگی اور ایسی جدید علامتوں کا غزلوں میں استعمال ہونے لگا، جن کی وجہ سے اردو غزل ایک نیا روپ دھار کر نمودار ہوئی۔ ان شعرا کی غزلوں میں پہاڑ، دریا، دھوپ، جنگل، سانپ، دھول، کبوتر، کھڑکی، برف، راکھ، سورج، آندھی جیسی علامتوں کا استعمال شروع ہوا، مثال کے طور پر دیکھئے:

جنگل کے سناٹے سے کچھ نسبت تو ہے
شہر کے ہنگامے میں پھرتا کون اکیلا

(باقی صدیقی)

دل کی باتوں میں آکے پچھتائے
سانپ پر پاؤں آگیا ہے

(شہزاد احمد)

فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

(ناصر کاظمی)

دھوپ کی لہر ہے تو سایہ دیوار میں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے ساتھ ہمیں

(شکیب جلالی)

خوشبو کی دیوار کے پیچھے کیسے کیسے رنگ جمے ہیں
جب تک دن کا سورج آئے اس کا کھوج لگاتے رہنا

(منیر نیازی)

یہ علامتیں ایسی ہیں، جن کا استعمال اردو غزل میں پہلی بار روا رکھا گیا۔ کچھ تلخ قسم کی علامات بھی ہیں لیکن ان کے استعمال سے بھی غزل میں دلکشی پیدا ہوئی، یہ ان شعرا کے ہنر کی کارفرمائی ہے، جنہوں نے ان علامات کو برتا ہے اور انہیں اردو غزل کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ اس نسل کے بعض شاعروں نے نئی حسیت کے ساتھ ان علامتوں کو باشعور اور حساس انسان کی طرح اپنی فکری گہرائیوں میں انہیں ڈھال کر ایک اعتبار سے اپنی لفظ شناسی کے ثبوت فراہم کئے ہیں، یہ مثالیں دیکھئے:

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے اسکوٹر کے دیوانے

(بشیر بدر)

ہم سے تپتے ریگ زاروں کی طرف آتی نہیں
اونچی اونچی بلڈنگوں پر سوگئی ہے چاندنی

(ڈاکٹر عزیز اندوری)

موجودہ نسل کے شعرا نے اپنے عہد کی سماجی یا معاشرتی تلخیوں کو اپنے قدما کی طرح کھلے دل و دماغ سے محسوس کیا ہے مگر اس کے اظہار کیلئے اپنے لئے ایسے لب ولہجہ کا انتخاب کیا ہے، جس پر قدما کے لب ولہجہ کی چھاپ نظر نہیں آتی ہے۔ اس وجہ سے اس موجودہ لب ولہجہ کو ہم جدید ترین لب ولہجہ ٹھہرانے میں قباحت کا شکار نہیں ہوئے، جس کے ذریعے ہم اپنے سماج کی ناانصافیوں نابرابری کے سلوک کے ساتھ انسانیت کشی کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہوئے ہیں ان شعرا نے ایسی علامت سازی کی طرف بھی توجہ دی ہے جن کو سمجھنے کیلئے ہم دشواری نہیں محسوس کرتے اور ان کے پس پردہ موجودہ حادثات واقعات تک ہمارا ذہن بڑی آسانی کے ساتھ پہنچ جاتا ہے اور یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ اس عہد کے سلگتے ہوئے حالات وواقعات نے اس عہد کے شاعر کو کس قدر متاثر کیا چند مثالیں دیکھئے:

گزروگے تو ہر موڑ پر مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈھوگے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد)

مذہبی مزدور سب بیٹھے ہیں ان کو کام دو
اک عمارت شہر میں کافی ویران اور ہے

(منور رانا)

ہماری نفرتوں کی آگ میں سب کچھ نہ جل جائے
کہ اس بستی میں ہم دونوں کو آئندہ بھی رہنا ہے

(معراج فیض آبادی)

قتل ہوئے تو مجھے شہر میں دیکھا سب نے
کوئی آیا نہ عدالت میں گواہی کیلئے

(رئیس انصاری)

تجھے غرور کہ تلوار تیرے ہاتھ میں ہے
مجھے یقین کہ مجھ کو خدا بچائے گا

(والی آسی)

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں اک مکاں بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

(بشیر بدر)

یہ ہے وہ ادبی اور سماجی پس منظر جس میں راحت اندوری کے ذہن وشاعری نے بالیدگی کی منزلیں طے کیں اور ان سے متاثر ہوئے چنانچہ عہد حاضر کی ناگواریوں اور ناہمواریوں اور مسائل حیات

کیلئے اپنے فکر رسا کو ہمیشہ آمادہ رکھ کر اس کا ہر موقع پر بے دھڑک کھل کر اظہار کیا ہے لیکن ان کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ آواز میں احتجاج کی دھمک تو ہے لہجہ میں کڑک اور گھن گرج نہیں۔

عدالتیں نہ سہی جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں میرا حل ضرور نکلے گا
مشورہ ہے کہ اٹھو نہر پہ قبضہ کرلو
بھیک مانگو گے تو قطرہ بھی نہیں مل سکتا
اٹھو اے چاند تارو اے شب کے سپاہیو
آواز دے رہا ہے لہو آفتاب کا
زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پر نکلنا ہوگا
گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا

(راحت اندوری)

باب سوم

راحتؔ اندوری کی شاعری

(الف) راحتؔ اندوری بحیثیت شاعر

(ب) راحتؔ اندوری بحیثیت غزل گو

احباب بے تکلف

(داہنے سے) گلوکار طلعت عزیز، کرکٹ سمراٹ سنیل گواسکر، مشہور شاعر منظر بھوپالی،
راحت اندوری، شہرۂ آفاق پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

ایک یادگار تصویر

(داہنے سے) قتیل شفائی، راحت اندوری، منظر بھوپالی، احمد فراز

راحت اندوری بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں، یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انکی شہرت مشاعروں کی وجہ سے وجود میں آئی اور مشاعروں کے وسیلے سے ان کی غزلیں اہل ذوق تک پہنچ گئیں جہاں ان کو خاطر خواہ طریقے سے سراہا گیا۔ اردو شاعری کے سرمائے میں غزل ہی ایسی صنف ہے، جس کے کہنے والے کونے کونے میں ہیں اور اس طرح کے اشعار بھی لاتعداد ہیں، جن میں ہر طرح کے موضوعات پر خاطر خواہ روشنی دالی گئی ہے اس صنف نے مشاعروں کی بدولت یہ مقبولیت حاصل کی ہے اور آج بھی شعرا اس میں اپنے تجربات کے نت نئے گل بوٹے کھلا رہے ہیں۔ عہد حاضر کی غزل میں وسعت نظر، شعرا کے مشاہدات وتجربات، خیال کی رنگا رنگی، زبان کی سلاست اور شگفتگی معنوی گہرائی، اور احساسات کی صحت مندی لائق غور ہے۔ غرض کہ غزل عہد میر سے لے کر آج تک نئے تجربات، نئے اسالیب نئے موضوعات اور لفظیات اور اپنے اپنے متعلقہ عہد کی ترجمانیوں سے آراستہ ہوئی ہے۔

راحت اندوری نے بھی غزل کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اردو غزل کے ایسے شعرا کی تعداد کم ہے، جن کے یہاں زبان و بیان کی سادگی اور برجستگی اور غزل کی نزاکت اور اس کے رکھ رکھاؤ کا لحاظ بھی ہو، جو شعر میں دلکشی اور اثر آفرینی نظر آتی ہو یہ سبھی خوبیاں

راحت کے یہاں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ کھلے اور بے باک لہجہ کے ساتھ موجود ہیں۔ برخلاف یہی نہیں بلکہ راحت اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے کلام میں خیالات کی نیرنگی افادیت معنیٰ آفرینی، زبان کی سلاست اور شگفتگی انداز بیان کا جوش بلکہ جوش جیسا لہجہ اور گھن گرج اور بے باک اظہار ذات و کائنات نہایت دھیمے پن کے ساتھ لفظی تکرار، جذبات کی گرمی اور جوش شباب سب کچھ ہے ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے عام بلکہ عوام فہم بنانے کی دھن میں اسے اس قدر آسان بنا دیا ہے کہ کم علم تک لوگوں کیلئے انہوں نے یہ گنجائش نہیں رکھی ہے کہ وہ لغت کا سہارا ڈھونڈھتا پھرے۔ یا اس کے مطلب سمجھنے کیلئے اسے دقت ہو۔ ان کی شعر خوانی کا انداز میر انیس جیسا دل پذیر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے جوش میں سچائیوں کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بولتے ہوئے اشعار اور جاگتا ہوا احساس ابل پڑتا ہے ان کی غزل کی نزاکت فراوانی غم و احساس سے نڈھال نہیں نظر آتی ہے۔ وہ نامانوس الفاظ نہیں استعمال کرتے بلکہ روزمرہ کی زبان میں شاعری کرتے ہیں جس میں سنجیدگی بھی ہوتی ہے تہذیب اور شائستگی بھی۔ روزمرہ کی تلاش میں بازاری پن کلام میں نہیں آنے دیتے۔ زبان و بیان کے فطری انداز نے ان کی شاعری کو صرف توازن ہی نہیں بخشا بلکہ ایک مانوس لب و لہجہ بھی دیا ہے۔ وہ پیچیدہ ترین جذبات نازک سے نازک اور شدید سے شدید احساس کو ایک مشاق فن کی طرح آسانی سے ادا کر دینے پر قادر ہیں۔

اشارہ و کنایہ: رمز و ایما کی لطافتیں، ایمائیت، غزل کے اجزائے لاینفک ہیں۔ انہی اجزا کی بدولت غزل میں دلکشی شگفتگی اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے راحت کے کلام میں یہ عناصر وافر مقدار میں نظر آتے ہیں، جیسے:

دنوں کے بعد اچانک تمہاری یاد آئی
خدا کا شکر ہے کہ اس وقت باوضو ہم تھے

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھو
ایک اک حرف کو صدا بھی مان

حیات انسانی کا سلسلہ زندگی کے لگاؤ سے دنیاوی عشق تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر خلش عشق کی طرح سینے میں موجود ہوتی ہے لیکن خواہشات ہمیشہ پوری نہیں ہوتیں یہ سلسلہ برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ زندگی گل و خار سے عبارت ہے پھر بھی زندگی کی ناؤ برابر بڑھتی رہتی ہے کبھی آرزوؤں کی دلفریبیاں طلب کے جذبہ میں ہلچل پیدا کرتی ہیں اور بسا اوقات قلب انسانی کو پارہ پارہ بھی کر دیتی ہیں پھر بھی آدمی ہے کہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔

روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف
میری آنکھوں میں منور کون ہے
مجھ سے ملنے ہی نہیں دیتا مجھے
کیا پتہ یہ میرے اندر کون ہے

راحت اندوری کی غزل پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خلیل احمد لکھتے ہیں:

''تغزل میں ڈوبا ہوا شعر شدت احساس میں رچی ہوئی شاعری، خلوص و صداقت میں سموئے ہوئے جذبات، درد و غم میں ڈھلے ہوئے آنسو، نغموں میں سجا ہوا سنگیت گھن گرج میں ڈوبا ہوا شعر جو بھی ہو راحت کا اپنا رنگ ہے اس رنگ میں دکھ درد کی پرچھائیاں بھی ہیں اور عزم و حوصلہ کی روشنیاں بھی۔ راحت کی شاعری میں ہر قسم کے اشعار موجود ہیں۔''

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی کے مطابق:

''راحت کی شاعری حیات کو وہ نغمہ ہے، جس میں انسانی کرب چھپا ہے۔ یہ کرب انسانی تہذیب کے گوشے کو قوت گویائی عطا کرتا ہے۔ انسانیت کو جھنجھوڑتا اور رہ رہ کر انسان کو بیدار کرتا ہے۔ راحت کی سوچ انداز نرمی اور اسلوب کا دھیما پن قابل دید ہے۔''

راحت کی شاعری میں حسن وعشق کا روایتی انداز دیکھنے کونہیں ملتا انہیں انسانیت سے لگاؤ ہے۔ وہ زندگی کی تلخی اور اس کے ردعمل کو بڑی ذہانت اور بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر واقعہ کو انتہائی قریب سے دیکھتے ہیں اور ایک حساس شاعر کی طرح ان کا ردعمل بھی شدید ہوتا ہے جو دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا سچ تو یہ ہے کہ شاعری میں انسانی احساسات و جذبات پر کمند لگانا آسان نہیں۔ ذرا گہرائی میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیقی استعارہ یا کارکردگی عمر کے ساتھ ساتھ معیار کی بلندیوں کو چھوتی ہے کیونکہ کسوٹی پر کھرا اتر کر ہی ایک اچھا شاعر بنتا ہے ہزاروں اہل قلم اپنی روشنیاں صرف کرتے ہیں تاہم دو چار ہی تخلیق کار عمر جاوداں حاصل کرنے میں کامران ہوتے ہیں۔ ارفع تخلیق توانائی اور بھرپور صلاحیتوں کا حامل شاعر ہر زمانے اور ہر دور میں زندہ رہتا ہے ذہنی صلاحیت اور تخلیقی توانائی اگر شاعری سے ہم آہنگ ہے تو شاعر کو تخلیقی جست لگانے میں دیر نہیں لگتی۔ شخصیت کے داخلی خلا میں جنم لینے والے جذبات جب زمانے یا وقت کی زد میں آتے ہیں تب کہیں احساسات کے معدن سے انمول خزانے نکلتے ہیں۔ کاش راحت کی شاعری اس یافت سے محروم نہ ہو اور یہ سلسلہ سدا جاری رہے۔'' (۱)

راحت کی شاعری کے بغائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشعار میں آبشاروں کی مترنم جھنکار ہے، پہاڑی دریاؤں کی شورش اور شور بے ہنگام نہیں۔ ان میں جھیل کے کنارے کا پرسکوت تحیر افزا سکوت اور سحر آگیں بانسری جیسی مدھر آواز محسوس ہوتی ہے اور ایسے سماں کا اندازہ ہوتا ہے، جہاں قاری تنہائی میں محسوس کرے کہ اس کے قریب کوئی نہ کوئی شے سرسرا رہی ہو بے خبری میں کسی ذی نفس کی سسکیوں کا احساس بیدار ہو جائے۔ چند اشعار پیش ہیں۔ یقین ہے کہ قاری کو راحت کے اشعار میں وہ سب کچھ مل جائے گا، جن کا راقم نے ذکر کیا ہے اور یہ کہ ان میں ان کی پسند کے مطابق بھی یقینی اشعار مل جائیں گے۔

(۱) زندگی کی تخلیق کا شاعر، ص ۱۴۳ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

خوار پھرتے ہیں آئینہ ہوکر
جانے منھ دیکھنا ہے کس کس کا

ننھی منی سب چہکاریں کہاں گئیں
موروں کے پیروں کے پائل بھیجو نا

ہمارے طاق بھی بیزار ہیں اجالوں سے
دیئے کی لو بھی ہوا پر سوار رہتی ہے

کس نے دستک دی یہ دل پر کون ہے
آپ تو اندر ہیں یہ باہر کون ہے

میں سوچتا ہوں ایسے میں وہ نہ آجائے کہیں
جنوں بخیر یہ موسم تو انتظار کا ہے

اے میرے دوست تیرے بارے میں
کچھ الگ رائے تھی مگر تو بھی

اپنے دیوار و در سے پوچھتے ہیں
کیا یہ گھر تھا گھر سے پوچھتے ہیں

پیاس صدیوں کی لئے آنکھوں میں
دیکھتے رہتے ہیں بادل ہم تم

ایک دوزخ جو سب کو جلا ڈالے
ایک جگنو جو روشنی کردے

آج کل چھٹی کے دن بھی گھر پڑے رہتے ہیں ہم
شام ساحل تم سمندر سب پرائے ہوگئے

دوپہر تک تو ساتھ چلا سورج

تونے رستے میں شام کردی ہے

موسم کی من مانی ہے

آنکھوں آنکھوں پانی ہے

آتی جاتی چڑیاں روشندانوں میں

گھر آنگن کی خواہش ہوتی رہتی ہے

دروازوں نے اپنی آنکھیں نم کرلیں

دیواروں نے اپنا سینہ تان لیا

راحتؔ اندوری غزل کے شاعر ہیں اور وہ ہمیشہ چبھتے ہوئے نہایت تیکھے اور طنز سے بھرپور شعر کہتے ہیں ان کے اشعار براہ راست اپنے سامع کو اپیل کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ وہ فوری طور سے پریشان کن مسائل اور حالات پر اپنے زاویۂ خاص سے شعری تبصرہ کرتے ہیں لیکن وہ اپنے یک رخی زاویہ کی تہوں میں بھی ادبیت کی قندیلیں جلائے رکھے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی راحت کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''راحتؔ کی شاعری انسانی درندگی کی شاعری ہے، ہوسنا کیوں کی شاعری ہے، اقدار کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی شاعری ہے کہیں ان کی نظریں حالات کی ستم ظریفی پر پڑتی ہیں کہیں رومانیت کی مصنوعی دینا کی سیر کراتی ہیں اور کہیں مسائل و مصائب سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری عوام کے دل کی آواز ہے وہ قاری کا دل دھڑکانے اور اسے اپنی جانب متوجہ کرانے کا فن خوب جانتے ہیں ان کی زبان اور قلم سے نکلنے والے اشعار سیدھے دل میں اتر کر روح کو جھنجھوڑتے ہیں اور در غور وفکر کو وا کردیتے ہیں۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ جو بات ہمارے ذہنوں سے نکل کر زبان پر آنے سے تکلف کرتی ہے وہ ان کے لبوں پر اٹھکھیلیاں کرتی رہتی ہے اور ہم اسے سن کر بے چین ہو جاتے ہیں کہ گویا یہ

بھی میرے دل میں تھا:

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پہ بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہوگئے

اگر چہ یہ شعر سامنے کا ہے ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ راحت نے صوفہ بھیڑیا جنگل اور شہر صرف چار لفظوں کی جادوگری سے طبقاتی کشمکش انسانی استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی کے ساتھ نشاندہی کردی ہے۔ اگر یہ شعر کیفی اعظمی یا سردار جعفری کے قلم سے نکل کر ہم تک پہنچتا تو ترقی پسندی کا ڈھول پیٹتے پیٹتے خود کو بہرا کر لیتے اور ستر برس پرانی ترقی پسند تحریک کا حیات نو قرار دیتے اسی طرح:

روایتوں کا تحفظ بھی ان کے ذمہ ہے
جو مسجدوں میں سفاری پہن کے آتے ہیں

اس شعر کے حوالے سے ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کا یہ دعویٰ کہ ''اگر کلام پاک کی تلاوت کیلئے ٹوپی، وضو اور رحل کی شرط ختم کردی جائے تو تلاوت کرنے والوں کی تعداد میں بیک وقت اضافہ ہوجائے گا'' بلاشبہ درست ہے۔ اس بات سے کسی منصف مزاج کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ ایسی ہی بے ضرورت حد بندیوں نے نقصان پہنچایا ہے۔

ہے دھواں چاروں طرف بینائی لیکر کیا کروں
صرف آنکھیں ہی نہیں منظر بھی ہونا چاہئے

رومانی شاعری کیلئے مناظر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ دلدادگی کی متلاشی ہوتی ہے راحت کا کلام اسی دلدادگی سے عبارت ہے۔ وہ محض مناظر پر نظر نہیں ڈال کر رہ جاتے بلکہ ان کی گہرائیوں میں وہ جستجوئے حق بھی کرتے ہیں درج ذیل شعر میں وہ ہماری تاریخ ہے جس کی سچائیاں کلکتہ کی گلیاں بولا دت اسٹریٹ ہو یا ہرن باری لین میں ان بچوں کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہیں جو مٹی کے تیل کا پیپا رکھے تیل بیچتے ہیں جن کی بنیادیں سلطان میسور سلطان ٹیپو کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ راحت کی رومانی شاعری کا محور

صرف حسن وعشق کی موہوم یا زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں بلکہ اس کی تہہ داریوں میں وہ تلخ سچائیاں بھی پوشیدہ ہیں جن سے ہم صرف نظر کرتے ہیں۔ راحت اپنے گرد وپیش کے حقائق پر گہری نظر رکھتے ہیں تب ہی ایسے اشعار جنم لیتے ہیں۔

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری ہو گئے
باپ حاکم تھا مگر بچے بھکاری ہو گئے

اور اسی قبیل کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے لائق ہے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

ہر ایک کو مطمئن کرنے اور خوش رکھنے کیلئے بہت کچھ دنیا داری ضروری ہے اور اکثر دنیا داری کو قائم رکھنے کیلئے دوستی کے ساتھ خود کی قربانی بھی دینا پڑ سکتی ہے کہا نہیں جا سکتا کہ اس سلسلے میں راحت کا کیا نظریہ ہے مگر ان کا شعری رویہ کچھ اسی طرف اشارہ کرتا ہے، مثلاً:

میری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
میرے بھائی میرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

ڈاکٹر اسعد بدایونی اپنے مضمون ''راحت اندوری کی شعری کائنات'' میں راحت کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری عام طور پر ان باتوں کا اظہار ہے جن کو زمانہ اور اہل زمانہ قبول کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، ہر شاعر کے ذہن میں ایک تخیلی دنیا ہوتی ہے، جو اس کے آس پاس کی دنیا سے مختلف اور زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے کیونکہ وہ ساری دنیا کو خوبصورت اور سرسبز دیکھنا چاہتا ہے۔ بدصورتی ناہمواری اور عدم مساوات جو جسمانی سطح پر موجود دنیا میں معمولی چیزیں ہیں شاعر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے خوابوں اور خیالوں میں ایک الگ دنیا تعمیر کر لیتا ہے کیونکہ وہ اپنے خوابوں میں دوسروں کو بھی شریک

کرنا چاہتا ہے اور یہ عمل شعر پیکر میں تشبیہوں استعارات اور علامات کی مدد سے ہوتا ہے اور الفاظ کا جامہ پہننے کے بعد ایک زندہ اور متحرک شعر میں تبدیل ہو جاتا ہے، کسی شعر کی تہہ داری یا معنویت کوئی خلائی چیز نہیں ہوتی بلکہ شاعر کے ذہن اور تخیل کے آس پاس کے ماحول میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حالات کے شیر و شکر ہونے کے پختہ نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہ ہوگا کہ شاعری کو فوری ردعمل یا نعرے بازی کے منصب پر اتر آنا چاہئے بلکہ حالات و واقعات کو معروضی انداز سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد ہی شعری تخیل کی آمیزش سے شعر گری کرنا ہمیشہ سے زیادہ بہتر اور مستحسن عمل رہا ہے۔ راحت اندوری نے اپنے آس پاس ہونے والے واقعات کو شعری پیکروں میں کچھ اس طرح منتقل کیا ہے کہ وہ لمحہ موجود سے ماورا بھی نظر آتے ہیں۔

بند کمرے کی امس اپنا مقدر بن گئی
چھت پہ جب پہنچا تو بادل سر اٹھانے لگ گئے

بلندیوں کا نشہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا
مرا جہاز زمیں پر اترنے والا تھا

اب میرے حال پہ شرمندہ ہوئے ہیں وہ بزرگ
جو مجھے پھولنے پھلنے کی دعا دیتے تھے

کیسے محفوظ رکھوں خود کو عجائب گھر میں
جو بھی آتا ہے یہاں ہاتھ لگاتا ہے مجھے(۱)

واقعہ کربلا یا حضرت امام حسین کی شہادت تاریک انسانی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے اور اس حوالے سے عربی فارسی ادبیات کے مقابلے میں اردو شاعری اور اردو شعرا نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری تو ماضی کی بات ہے آج بھی اس عظیم سانحہ کی بازگشت جدید شعرا کے کلام میں

---

(۱) لمحے لمحے بدایوں مضمون نگار ڈاکٹر اسعد بدایونی ص ۱۵۲

پورے امکانات اور آب و تاب کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں غزل گو شعرا عرفان صدیقی اور افتخار عارف کے کلام کو پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے کربلا کے واقعات کو بطور استعارہ و علامت بنا کر جدید حسیت کا اظہار کیا ہے۔ راحت کے یہاں بھی کچھ اشعار بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی واقعہ اور اس کے متعلقات کو پیش کرتے ہیں جیسے یہ اشعار دیکھئے:

یہیں حسین بھی گزرے یہیں یزید بھی تھا
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی زمیں ہوں میں

تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر
فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

مندرجہ دونوں اشعار انسانی رویہ کے غماز ہیں اسے اصطلاح میں حق و باطل کی جنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں جن کا مرجانا بظاہر ہار جانے یا ختم ہو جانے کو موت نہیں سمجھتا کیونکہ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے مرنا دراصل زندگی ہے، جس کی عملی شکل شہادت حسین ہے حالانکہ یہ موضوع نیا نہیں ہے لیکن راحت کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ ان اشعار میں ایک طرح کی تازگی اور نیاپن محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے اردو کے جدید شعرا نے داستانی کرداروں اور واقعات کو اپنی غزلوں میں پیش کرنے اور ان کو عصری حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ راحت اندوری کے شعری مجموعے ''پانچواں درویش'' میں اسی رویہ کی جھلک موجود ہے۔ افسانوی ادب میں انتظار حسین نے قدیم داستانوں اور قصوں سے جس طرح کا فائدہ اٹھایا ہے اکثر غزل گو شعرا کے یہاں یہ معیار مفقود ہے مگر ایک خاص طرح کی فضا سازی اور رنگ آمیزی کی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ راحت کے یہ اشعار اسی کوشش کی منہ بولتی تصویریں ہیں:

محل میں خاص مصاحب بھی جا نہیں سکتے
وہاں حرم کی کنیزیں ہیں شاہ زادہ ہے

شاعری آوارگی خوشبو وفالذت شراب
مختلف شکلوں میں شہزادے کو عورت چاہئے
شاہزادے سے ملاقات تو ممکن ہی نہیں
چلئے مل آتے ہیں چل کر کسی درباری سے
رنگ محلوں کے دریچے کھولئے عالم پناہ
ورنہ شہزادی کو جادوگر اٹھالے جائیں گے
کسی کنیز کی قسمت چمک بھی سکتی ہے
سویرے صاحب عالم کی واپسی ہوگی
کسی آہو کیلئے دور تلک مت جانا
شاہزادے کسی جنگل میں بھٹک مت جانا
رکھ دئے جائیں گے نیزے لفظ اور ہونٹوں کے بیچ
ظل سبحانی کے احکامات جاری ہوگئے
داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی

راحت تصنع، بناوٹی باتوں مصلحت پسند یا خوشامدانہ انداز، موقع پرستی کے قائل نہیں ہیں اس لئے جو بات کہتے ہیں وہ سچائی سے لبریز اور بانگ دہل ہوتی ہے ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ پورے طمطراق اور دبدبے سے بھرپور اور اس یقین سے مالا مال ہوتا ہے کہ اس خیال یا موضوع پر ان کو دسترس اور پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور اسلوب دلپذیر ہوتا ہے۔ عربی فارسی الفاظ کم ہی نظر آتے ہیں اس طرح وہ قدیم لب ولہجہ اختیار کرنے سے بھی دامن بچاتے ہیں لیکن وہ بات کو کھل کر اور برملا کہنے کے خوگر ہیں اور ان کو اپنی حق پسندی کے آگے اس بات کا چنداں لحاظ نہیں رہتا کہ ناقدین فن اس کو

کس انداز سے دیکھیں گے۔ اسی سبب سے ان کی الگ ہی پہچان ہے۔ راحت ظلم وتشدد، عدم مساوات نا انصافی کے خلاف ہمیشہ حق گوئی و بے باکی سے سینہ سپر ہوکر کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں مہاجرین کے حالات اور جذبات کا ترجمان راحت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

اب کہ جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

اسی طرح ان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے لائق ہے:

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

راحت اندوری اپنے گردوپیش پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ موجودہ سیاسی بازی گروں کی دکھتی اور کمزور رگوں پر اپنے اشعار کے نشتر برابر لگاتے ہیں ایسا کہ اکثر وہ تلملانے کی مہلت بھی نہیں پاتے۔ ان کے فکروفن کی یہی خوبی انہیں اپنے ہم عصروں میں فوقیت عطا کرتی ہے۔ بقول محسن بھوپالی:

''راحت کی شاعری ہمارے عہد کی ترجمان بھی ہے اور نقاد بھی''

ایک سچا فنکار جب اپنے ذہن کے دروازوں کو کھول کر سوچتا ہے تو اس کے تجربوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ گردش وقت و حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنے آئینہ دل کو گرد حالات سے صاف کرنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں اس کا لہجہ احتجاجی کاوش بغاوت بھی بن سکتی ہے۔ راحت کا یہی حال ہے ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل عہد حاضر کی ناانصافیوں سے اوب چکا ہے ایسے میں وہ کڑوی اور ناگوار باتیں کرنے پر تل جاتا ہے اور وہ کر بھی کیا سکتا ہے اس لئے کہ اس عہد نے حساس قلب وجگر والوں کو ایسی باتوں کیلئے مجبور کردیا ہے، جیسے:

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے

روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں
چاند پاگل ہوگیا تارے بھکاری ہوگئے

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے ہیں جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بے وقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آگئے

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں اک تنہا شہر ایسا تھا

بقول ڈاکٹر عزیز اندوری:

''راحت کی باتوں میں کھوکھلا پن نہیں ہے۔ وہ سماج کے کھوکھلے تصورات کے خلاف کھری کھری سنا دینے کا قائل ہے اس کے تیور میں ڈھیلا پن نظر نہیں آتا کہ وہ تمام ناانصافیوں اور عصبیت کے خلاف اپنے تیوریوں پر بل ڈال کر للکارنے کو اولیت دیتا ہے اس کا دل موم کی طرح پگھلنے اور وقتی طور پر روشنی پھیلانے والا نہیں کہ وہ لہجے کو تلوار کی کاٹ بنا کر پیش کرنے کو مقدم سمجھتا ہے۔ اسکے الفاظ مضمحل نہیں کہ وہ لفظوں کو تیزی سے دماغوں کو جھنجھوڑ دینے والا فنکار ہے۔ اس کی شاعری ان تمام تیز طرار صورتوں کے باوجود محض لفظوں کی گھن گرج تک محدود نہیں ہے بلکہ شورنشور جیسی کیفیت پیدا کر کے مردہ طبیعتوں کی افسردگی کو کسی حد تک مٹانے کا فرض بھی انجام دیتی ہے۔''(۱)

راحت کو آج کے باشعور انسان اور ایک حساس فنکار کی طرح منقلب صورتوں یا حالات کا صرف احساس و عرفان ہی نہیں بلکہ حالات کی تخریبی صورتوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ جو تاریخی اعتبار سے غیر واجبی حقائق کے نام پر سچائیوں کو مٹا دینے پر آمادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راحت اپنی حق شناسی اور حق

---

(۱) مضمون تیکھے لہجے کا شاعر، ڈاکٹر عزیز اندوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

پسندی کے تحت ایسی منقلب صورتوں پر کھل کر طنز کرتے ہیں۔

اسی گلی میں وہ بھوکا فقیر رہتا تھا
تلاش کیجئے خزانہ یہیں سے نکلے گا

امیر شہر تری طرح قیمتی پوشاک
میری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

ہمیشہ سر پہ رہی اک چٹان رشتوں کی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اٹھایا ہے

ہمیں دربار میں آنے کی اجازت ہی نہیں
ہم نہ اعزاز نہ عہدہ نہ مراتب سمجھے

غزل اپنے لچکیلے پن اور وسعت بیان کی وجہ سے ہمیشہ مقبول اور بے مثال تصور کی گئی ہے۔ اس لئے اگر آج غزل تشبیہات واستعارات، رمزو کنایہ ایمائیت اور اشاروں کے حصار سے باہر آ کر سیدھے سیدھے اپنے دل کی بات کہہ دینے پر آمادہ ہے تو راقم کے خیال سے اس کے استحقاق میں پابندی نہیں ہونی چاہئے۔ راحت نادر تشبیہات بے مثل استعارات اور لاجواب قسم کی تلمیحات میں ادھر ادھر سرگرداں نہیں ہوئے۔ ان کی غزلوں میں ایسے استعارے ضرور مل جائیں گے، جنہیں استعاراتی رویوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ راحت ان رویوں کو نادرالوجود بنانے کی فکر سے آزاد ہو کر کہنے کے خوگر ہیں اس لئے ان کا کہا ہوا شعر براہ راست سمجھ میں آتا ہے۔

دکھائی دیتا ہے جو بھیڑیوں کے ہونٹوں پر
وہ لال دودھ ہماری سفید گائے کا ہے

کیسے کیسے لوگوں نے اشنان کیا
حکم ملے تو ہم بھی نہالیں گنگا جی

بلندیوں کا نشہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا
میرا جہاز زمیں پر اترنے والا تھا
سیہ مٹی کی چڑیوں کے بدن پر
گلابی پر لگاکر بیچتا ہوں

راحتؔ کا ایک فن یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور کے مروجہ محاوروں میں گفتگو کرتے ہیں اس لئے انکے اشعار بہ آسانی ذہن وقلب میں اتر جاتے ہیں۔ راحت جدید ترین پیرایہ اظہار میں تلخ سے تلخ بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اس کام میں وہ اپنے پرائے کا تصور مٹا دیتے ہیں اور دوٹوک بات کہہ دیتے ہیں۔

کئی دن سے مرے اندر کی مسجد
خدا بیزار ہوتی جارہی ہے
بہت کانٹوں بھری دنیا ہے لیکن
گلے کا ہار ہوتی جارہی ہے

راحتؔ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار براہ راست عوام سے گفتگو کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انداز بیان سادہ زبان آسان اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اشعار از دل ریزد و بر دل افتد کے پورے مصداق ہوتے ہیں۔ وہ بات کو طول طویل بنانے یا گھما پھرا کر کرنے میں یقین نہیں رکھتے، جیسے یہ اشعار دیکھئے:

مجھ میں کتنے راز ہیں بتلاؤں کیا
بند ایک مدت سے ہوں کھل جاؤں کیا
عاجزی منت خوشامد التجا
اور میں کیا کیا کروں مرجاؤں کیا

ایک پتھر ہے وہ میری راہ کا
گر نہ ٹھکراؤں تو ٹھوکر کھاؤں کیا

راحت اندوری کے شعری کائنات ایک مہذب چیخ اور ایک احتجاج ہے، جس میں مجلسی آداب کا لحاظ قائم نہیں رہ سکتا۔ آزدی کی جنگ ہندو اور مسلمانوں نے مل کر لڑی اگر ہندو مارے گئے تو مسلمانوں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور تختہ دار کو چوم کر وطن عزیز پر جان نچھاور کر دی۔ لیکن آزادی کے بعد اردو کی زبوں حالی اس کے ساتھ سوتیلا برتاؤ اور لسانی تعصب اس کے بولنے والوں کو جاسوسوں اور ملک دشمن ٹھہرانے کا بے بنیاد رویہ اور تقسیم ملک کا ذمہ دار قرار دینے کا الزام اقلیتوں کیلئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہونا، اور سب سے بڑا ستم یہ کہ کل تک جو ساتھ تھے ایک دوسرے کے ہمدرد اور دکھ درد کے ساتھی تھے وہ فرقہ وارانہ فساد میں جلتے ہوئے مکانوں اور بہتے ہوئے خون کے سیلاب میں اپنا اعتماد اور نقطہ نظر یقین اور ہمدردی سب بھول گئے۔ موسم کی طرح بدلتی حکومتیں، فروخت ہونے والے ووٹ اور رہنما ایسے کہ ''کسی طرح سے دھنی اَرجت ہو یہ اُدّیش'' رکھنے والے اور اپنی غرض اور مقصد کے عوام کو بے جان اشیا کی طرح استعمال کرنے والے سیاست دانوں کی بے ایمانی، رشوت خوری، غربت اور بھوک مری جیسے خوں فشاں حالات نے راحت کی شاعری کو ایک مہذب کرخت قسم کی چیخ نے نیا لہجہ، نیا انداز اور بے ساختگی دی ہے۔ وہ اپنے عہد کے حالات و شعری روایات اور ادبی تحریکات کا حالانکہ علم رکھتے ہیں پھر بھی ان کے مسائل اور ہیں اور اس کا اظہار وہ جس طرح کرتے ہیں وہ انداز فکر اور زبان کی آرائش پر توجہ نہیں دے سکتی نہ کوٹھے پر گائی جانے والی غزل بن سکتی ہے اور نہ سڑکوں بازاروں میں گنگنائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی چیخ اور کراہ ہے، جو نہ نعرہ ہے اور نہ دیوانگی۔ جسے دیواروں پر سجایا نہیں جا سکتا۔ راحت کی شاعری مزاحمتی شاعری ہے جو سڑکوں گلیوں اور شہر در شہر پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف صدائے بازگشت ہے۔ راحت نے غزل کی تمام قدیم روایات کے برعکس اپنی روایت قائم کی اور اشعار کو نیا ذائقہ عطا کیا ہے، جو قطعی غزل کے دامن سے باہر کی چیز نہیں۔ انہوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں اور ہم پیشہ

ساتھیوں کے ساتھ یہ معجزہ دکھایا ہے اور اکثر ہم عصروں سے زیادہ اور فنکاری کے ساتھ۔

تیری دستار پہ تنقید کی ہمت تو نہیں
اپنی پاپوش کو قالین کہا ہے میں نے

میں قطرہ قطرہ مرتا رہا ہوں تمام عمر
جو زہر پی سکے وہ میرا جاں نشین بنے

ہمارے شہر کی بینائیوں پہ روتے ہیں
تمام شہر کے منظر لہولہان پڑے

اپنی ہر سانس کو نیلام کیا ہے میں نے
لوگ آسان ہوئے ہیں بڑی دشواری سے

ہے کبوتر جس جگہ تصویر میں
اس جگہ اک چیل ہونا چاہیئے

کچھ دور میں بھی دوش ہوا پر سفر کروں
کچھ دور تو بھی خاک کی صورت بکھر کے آ

بلندیوں کے سفر میں یہ دھیان آتا ہے
زمین دیکھ رہی ہوگی راستہ میرا

اپنے سوکھے ہونٹ دکھا کر بستی والے لے آئے
ایک سمندر بانٹ رہا تھا دو دو مٹھی ریت

یہ سوچ سوچ کر شرمندگی سی ہوتی ہے
وہ حکم دے گا جو فریاد کرنے والا ہے

خدا دراز کرے عمر میرے دشمن کی
کوئی تو ہے جو مجھے یاد کرنے والا ہے

مندرجہ اشعار سیاسی سماجی معاشرتی حقائق کا صرف بیان نہیں بلکہ اپنے عہد سے وابستہ سوالوں پر تبصرہ اور انکے خلاف جھنجھلاہٹ ہے۔ راحت کی غزلوں میں فسادات کا ذکر کچھ زیادہ ہی موضوع بنا نظر آتا ہے۔ آنکھوں میں خواب ہیں اگر نظر آتے ہیں تو لہولہان، ناروا فضا، شکست و ریخت کی آواز کو عنقا ہو جانا، سیاسی ایوانوں میں اونگھتے ہوئے، سیاسی گرگوں کا گونگے کی طرح ہاتھ اٹھا دینا، جوانوں کی طرح جلتے رہنا اور گلی گلی دہشت بوتے رہنا اور زندگی کو جہنم یا آتش کدہ نمرود بنا دینا، نئے فتنے ایجاد کرنا بھڑکا کر انسانوں کا خون بہانا یہ صرف ایک شاعر کی آواز یا مصور کا برش ظاہر تو کرسکتا ہے لیکن اس روشنی کو ختم نہیں کرسکتا۔ راحت اندوری ان تمام حالات کو دکھاتے ہیں تو ان کے ہم زبان سیکڑوں ہو جاتے ہیں اور وہ نا انصافی، حق تلفی، ظلم و زیادتی، فسادات دنگے رشوت ستانی، عدم مساوات نا انصافی، حق تلفی، الزام تراشی اور منافرت کے زخموں میں زیادہ ٹیس، تپش، گہرائی، سوزش اور درد و بے چینی ضرور محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس طرح یہ وقتی طور پر سہی صرف راحت کا ہی کرب نہیں ان کا بھی درد بن جاتا ہے جو سن رہے ہوں، ان اشعار کی اثر آفرینی دیکھئے:

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں

بنا دیا ہے جسے شہر یار لوگوں نے
جو سارے شہر کو برباد کرنے والا ہے

اسلحے تو خیر پھر آجائیں گے
کرفیو میں ڈھیل ہونی چاہئے

بستی بستی دہشت کس نے بودی ہے

گلیوں کی بازاروں کی ہلچل بھیجو نا

چاند سورج کہاں اپنی منزل کہاں

ایسوں ویسوں کو منہ مت لگایا کرو

راحت کے شعری کینوس سے محض یہ کہہ کر ہٹ جانا کہ انہوں نے تلخ تیز اور طنز یہ لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کو بات کہنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی غزلوں میں ایک انفرادیت ہے، جن کا ذائقہ لہجہ اور کیفیت ان کا نام لئے بغیر بھی بتا دیتا ہے۔ دراصل ان کا طرز اظہار اور اسلوب ہی ان کی شناخت بن چکی ہے۔ ان کے کلام میں اچھے اشعار کی ہرگز کمی نہیں وہ کسی بھی اچھے اور پسندیدہ انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے عہد کی سچی تصویریں ہیں۔

شام ہوتی ہے تو پلکوں پہ سجاتی ہے مجھے

وہ چراغوں کی طرح روز جلاتا ہے مجھے

ہم اپنے شہر میں محفوظ ہیں خوش بھی ہیں

یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرتا ہے

موسم کی من مانی ہے

آنکھوں آنکھوں پانی ہے

راحت نے پوری دنیا کی سیر کی اور ہر ذرہ میں آفتاب دیکھنا بھی خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی بے باکی فکر کی الگ ہی راہ اختیار کی ہے۔ انہوں نے عصری کرب کو خندہ و استہزا کی شکل دے کر اس کی نہایت چبھتی ہوئی ترجمانی کی ہے۔ وہ ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی خاردار جھاڑیوں سے بعافیت گزرے اس طرح کہ ان کا دامن کہیں نہیں الجھا۔ ان کا رشتہ قدیم یا کلاسیکی غزل سے مربوط ضرور ہے لیکن ان کا اسلوب و لہجہ منفرد ہے جو بیک نظر پہچانا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ انہوں نے اپنے پیش روؤں کے اثرات قبول کئے مگر اس سیلاب میں وہ بہے نہیں۔ جمالیاتی نظام کو پوری طرح قائم رکھ کر عصر حاضر کی تصویر کشی مشکل کام ہے۔ ناہموار اور سفاک لمحوں کو خوش رنگ بنانا مشکل کام ہے یہ راحت نے بڑی خوش اسلوبی سے کر دکھایا ہے۔ راحت کی شاعری ایسا آئینہ ہے، جس میں مسائل گردوپیش تہہ در تہہ نظر آتے ہیں۔

میں تجھ کو روشنیاں دے کے جاؤں گا اک دن
اندھیری رات سمجھ کر گزار دے مجھ کو
میں آج اپنے گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس ایک قمیض تھی جو میرا بھائی لے گیا
میں اپنا عزم لیکر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پر رکھی تھی قسمت گھر پر رکھی تھی

ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے ان میں خندہ اور استہزا بھی ہے اور عصری نظام کی جھلک بھی، یہی لہجہ راحت کی غزل کا منفرد اور نمایاں لہجہ ہے۔ راحت کی غزل میں ان کے حسی پیکروں نے بصری پیکروں کا روپ اختیار کرلیا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں رہ جاتا کہ ان کا مشاہدہ وسیع اور گہرائی لئے ہوئے ہے۔ یہی مشاہدے کی وہ گہرائی ہے، جس نے انہیں زندگی کے عرفان کا سلیقہ سکھایا اور ایک خوشگوار طنز آمیز لہجہ اور اسلوب بیان عطا کیا ہے جس میں سفا کی ہے دوا کی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

دولت بازو حکمت گیسو شہرت ماتھا غیبت ہونٹ
اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے
ترے سلوک تری آگہی کی عمر دراز
میرے عزیز میرا زخم بھرنے والا ہے
وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

راحت کا مجموعہ ''پانچواں درویش'' ایک شاہراہ ہے، جس پر ان کی فکر کا قافلہ رواں دواں ہے ان کی فکر لامحدود میں ابھی اور جہانوں کا سفر وسیر ہے اسی لئے ایسے امکانات ہیں جن سے ابھی پردہ اٹھنا ہے۔ راحت کے عزم وحوصلہ کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ابھی اور بھی زمانوں کے چہروں کی نقاب کشائی کریں گے۔ انہوں نے اپنی غزل میں وہ سب کچھ سمویا ہے جس میں ان کا عہد کروٹیں لے رہا ہے جس میں ناگواریاں بھی ہیں ناہمواریاں بھی لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں نہ تلخی ہے نہ جھنجھلاہٹ اور نہ پسپائی ہے اور کج ہمتی اور نہ حوصلہ شکنی۔ اس مجموعے کے صفحہ اول پر ہی حضرت علی کا قول '' آدمی اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے'' درج ہے۔ جو نہایت پر مغز اور معنیٰ خیز ہے۔ اس قول زریں کے حوالے سے راحت نے اپنے کلام اور شخصیت کو سمجھنے کی کنجی ہمارے ہاتھ میں دے دی ہے اور مجموعہ کے دوسرے صفحہ پر خود ان کا یہ قول بھی ان کے کلام کو سمجھنے کا ایک روشن اور تابناک آئینہ ہے۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

شاعری انسان کے فکروخیال، جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات کے تخلیقی اظہار کا نام ہے، چند لفظوں میں رواں کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود
دل کے جذبات کا اظہار بہ تائید و قیود

انسان کو خلق کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے قوت گویائی جیسی نعمت عظمیٰ عطا کر کے اسے صف حیواں سے الگ لا کھڑا کیا ہے اور شاعری بیان کی اعلیٰ وارفع صفت ہے، جس پر صحیح معنوں میں کلام کا اطلاق ہوسکتا ہے اور انسانی تقاضوں کے تحت کلام نطق کا محتاج ہے لہٰذا کلام کیلئے زبان اور بیان کا سلیقہ بیک مقام ہونا ضروری ہے اور یہ سلیقہ راحت میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

راحت کے جذبات واحساسات کی شدت اسے مشاہداتی شکل عطا کر دیتی ہے اور محسوسات بسا

اوقات بصری ہیولہ بن کر سامنے آتے ہیں راحت کی غزل میں بصری پیکر بہت زیادہ ہیں۔ یہ پیکر اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور توانا ہے۔ اسی مشاہدے نے ان کو عرفان حیات عطا کر دیا ہے ایک بے نمایاں طنز کا لہجہ دیا ہے اور طنز و مزاح چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مدافعت ہے جو ان کی شاعری میں نمایاں ہے زندگی کی انہیں تلخیوں نے انہیں سخن گستری کا ہنر عطا کیا ہے، بے خوف اور بیبا کی دے کر اسے انفرادیت عطا کی ہے کچھ اسی طرح کی ناگواریوں کے خلاف وہ اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

دولت بازو گیسو حکمت شہرت ماتھا، غیبت [illegible]

اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے

ترے سلوک تری آگہی کی عمر دراز

مرے عزیز مرا زخم بھرنے والا تھا

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا

میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

راحت اندوری نے اپنی غزل میں وہ سارے نقوش ابھارے ہیں، جن میں ان کا عہد کروٹیں لیتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے لہجہ میں جھنجھلاہٹ نہیں ہے اور نہ مایوسی بلکہ ان کی غزلیں اپنے سارے لوازمات کے ساتھ نظر آتی ہے اور کتنے ہی جہانوں کی سیر کراتی ہیں۔ ہر فن پارے کا مقصد فراہمی تسکین اور انبساط ہے لیکن اکثر و بیشتر نوزائیدہ قسم کے نقادوں نے اس کی تہہ داریوں کو نہیں کھنگالا اس لئے اس کے معنوی پیکروں کو وہ وسعت نہ مل سکی جس کا اسے حق حاصل تھا۔ غم و خوشی کی کیفیات سے بے نیازی ہی اصل میں نشاط و انبساط ہے یہی وہ نقطہ انتہا ہے، جہاں سے ہر چیز کوتاہ نظر آتی ہے اگر کسی فن پارے کا مقصد سرخوشی و نشاط ہے تو راحت کی غزل اس میزان پر کھری اترتی ہے۔

یہ کہاں لے کے چلے آتے ہو پلکوں کے چراغ
تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہوا کیسی ہے
میں گرد گرد ہوں خود کو نہ دیکھ پاؤں گا
تو آئینہ ہے تو آکر سنوار دے مجھ کو

راحت اندوری کے کلام میں قوم کا درد اسی شدت احساس کا پرتو لئے ہوئے ہے، جس نے حقیقت نگاری کے ساتھ ان کو جرأت اظہار بھی عطا کیا ہے یہ درد وکرب ماضی کی ان عظیم یادوں کی دین اور حقائق کا عکس لئے ہوئے ہے ان کے احساس و اظہار میں ایسی قوم کا درد ہے، جو کبھی تخت و تاج کے ساتھ جاہ وحشم کی بلندیوں پر فائز تھی اور آج انقلاب زمانہ کے ہاتھ ذلت وپستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور جس کے پاس پدرم سلطان بود کے تصور سے دلبستگی کے سوا کوئی دوسرا وسیلہ زندہ رہنے کا نہیں ہے یہ قوم اپنے ماضی میں زندہ ہے اور حال سے بے نیاز ہے اس کا کوئی مستقبل نہیں اگر ماضی کی یادوں نے اسی کو تحریک عمل دی ہوتی تو یقین ہے کہ منظر ہی دوسرا ہوتا۔

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہاں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائیں دیں گے

راحت نے لفظ زمینوں کو علامت کے طور پر استعمال کر کے عالمی پیانے پر قوموں کے عروج و زوال کی کہانی دہرائی ہے اسی طرح یہ اشعار دیکھئے:

داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی
ہمارے جسم کے داغوں پر تبصرہ کرنے
قمیضیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں

زوال رسیدہ قوم کا یہ عجیب وغریب المیہ ہے کہ دوسری قومیں جو سر بلند ہیں ان کی تہذیب و

ثقافت کو اپنا کر بھی دوسری قوموں کا وہ ہدف بنی رہتی ہیں۔

ہمارا نام نکلا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بٹیا

اپنی کم مائیگی، ذلت و پسپائی کی جملہ وجوہات کو مقدر کے حوالے کر کے راحت نے ہر زوال یافتہ فرد ہو یا قوم کی نفسیات کا دل میں چبھتا ہوا پہلو پیش کر دیا ہے۔ دوسرے دو اور اشعار ملاحظہ کیجئے، جس میں انہوں نے زبوں حالی کے حقیقی اسباب بیان کئے ہیں۔ ایسے اشعار بلاشبہ اسی وقت جنم لے سکتے ہیں جب شاعر کو مسلمانوں کے عروج و زوال کا نہایت گہرا مطالعہ ہو ورنہ ایسے اشعار صرف رواروی میں وجود میں نہیں آ سکتے۔

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے
بے حسی مردہ دلی، رقص، شرابیں، نغمے
بس انہیں راہوں سے قوموں پہ زوال آتے ہیں

راحت نے اپنی بے داراور چاق و چوبند اور منہ پھٹ اور بے باک غزل کے ذریعے مشاعروں کے حوالوں سے وہ کچھ دیا ہے جو ادبی رسائل نہیں دے سکے ہیں۔ انہوں نے لفظوں کی بازی گری کی ہے اور نہ اشعار کے گل بوٹے سجائے اور ندا فاضلی کی طرح صرف سمعی اور بصری پیکر پیش کر کے رہ گئے اور انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح بلند آہنگی گھن گرج اور بے باکی اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے لفظوں کو تیر وتبر بنا کر عصری خداؤں سے جیسی مبارز طلبی کی ہے یہ انہیں کا کارنامہ ہے۔

وہ دوہری شہرت رکھتا تھا اس سے کوئی کیا ملتا
کبھی دلی میں رہتا تھا کبھی چنبل میں رہتا تھا

گزشتہ سال کے زخمو ہرے بھرے رہنا
جلوس اب کے برس بھی یہیں سے نکلے گا
وہ پانچ وقت نظر آتا ہے نمازوں میں
مگر سنا ہے کہ شب کو جواگر چلاتا ہے

تھوڑا پیچھے نظر کریں جوش نے بھی اسی طنطنہ سے انگریزی بھیڑیوں کے مقابلے میں جرأت و جسارت کا مظاہرہ کیا تھا آج کے دور میں آزاد ہندوستان کے سیاسی بھیڑئے اسی روپ کو دھارے ہوئے ہیں۔ راحت نے انہیں سیاسی بھیڑیوں کی گھناؤنی سیاست کا پردہ چاک کیا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ بہانگ دہل کہہ دیا ہے۔ وہ اپنی ذات کو علامت بنا کر پیش کرتے ہیں:

میں ایک سچ ہوں اگر سن سکو تو سنتے رہو
غلط کہوں تو میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دینا

یہ راحت کی فنی مہارت اور چابکدستی ہے کہ انہوں نے سن لینا نہ کہہ کر سنتے رہو کہا ہے۔ سنتے رہو کیلئے بار بار کہنے والا یا کہتے رہنے والا ضروری ہے اور شاعر نے خود کو علامت کے طور پر استعمال کر کے کھلم کھلا کہنے کا جواز خود بنا لیا ہے۔ حبیب ہاشمی اپنے ایک مختصر مضمون میں راحت اندوری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت وقیع بات کہتے ہیں:

''راحت چونکہ بہت اخلاق وضع داری اور بے باک شاعر ہیں اس لئے ان کی شاعری میں اخلاقیات وضع داری اور بے باکی بدرجہ اتم موجود ہے بقول ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد آج کے اس بے راہ روی اور قحط الرجالی کے دور میں ظالم سیاست دانوں اور نا انصافیوں کے خلاف جس سلیقہ مندی آرٹ طمطراق اور بے باکی سے کوئی شاعر شعر کہتا ہے تو وہ راحت اندوری کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ Genuine شاعر کسی نقاد کسی مبصر کے قلم و کا محتاج نہیں ہوتا، سچے شاعر کو غیر تخلیق کار کے ذہنی تحفظات یا تعصّبات کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ شاعر کے تخلیقی عمل کا بہاؤ رخ اور رفتار و فکری سمندروں میں پار

کرنے میں اس کے دست بازو بن جاتے ہیں۔ بقول حبیب ہاشمی:

''راحت پچھلی تین دہائیوں سے (اب چار دہائیاں ہوگئی ہیں) شعر کہتے اور مشاعروں میں سناتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی ان کے قلم میں موچ نہیں ہے۔ راحت ایک زود گو شاعر ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کی طرح تیزی سے شعر کہنے والے آج خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ آج مشاعرے کے اسٹیج پر راحت اندوری اپنے شعری پرفارمنس کی وجہ سے زیادہ مقبول ہیں۔

گھر سے یہ سوچ کے نکلا ہوں کہ مرجانا ہے
اب کوئی راہ دکھادے کہ کدھر جانا ہے
یہ الگ بات کہ پستی میں پڑے ہیں ورنہ
چاند تاروں کی تو ہم راہ گزر جانتے ہیں
تیشہ بردارو سمندر بھی ہے اس صحرا کے بعد
دن تو جوں توں کٹ گیا ہے رات بھاری آئے گی
خبر نہیں کہ ہوا کس طرف اڑالے جائے
ہماری نسل بکھرتا ہوا برادہ ہے
عجیب لوگ ہیں میری تلاش میں مجھ کو
وہاں پہ ڈھونڈتے ہیں جہاں نہیں ہوں میں'' (۱)

راحت اندوری شاعروں اور صاف گویوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے قلم کو سینہ باطل کیلئے نیزے کی طرح استعمال کیا ہے ان کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑے باطل پرست کے سامنے منہ پھٹ بات کرنے میں بھی ان کو ذرہ بھر ہچکچاہٹ نہیں ہوتی وہ ہر فیصلہ اپنے ضمیر کی آواز پر کرتے ہیں، بہ الفاظ شاعر جمالی:

---

(۱) ایک مختصر مضمون حبیب ہاشمی مشمولہ لمحے لمحے ۲۰۰۲، ص ۲۰۸

''یہ اعتراضات اسی گروہ کی جانب سے اٹھے جو ناحق پرستی میں آج بھی مبتلا رہے............
راحت اندوری ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔ وہ کینوس پر رنگوں کی آمیزش سے شاہکار تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر وہ صرف اسی فن کو اپنا وقت دیتے تو اہم ترین فنکاروں میں شمار کئے جائے۔''(۱)

اس میں شک نہیں کہ راحت اندوری کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ایک زبردست دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ کہ نقادوں نے انہیں مشاعرے کا شاعر قرار دے کر ان کے کمالات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ان کا یہ عمل ادبی دیانت کے خلاف ہے کیونکہ صرف اس لئے راحت کی شاعری کو سمجھنے سے گریز کیا جائے کہ مشاعروں کا مقبول اور معروف شاعر اور ایک عام بول چال کی زبان ہے اور مشاعروں کی عوامی اہمیت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں یہ مشاعرے ہی ہیں، جنہوں نے آزاد ہندوستان میں اردو کو ٹھکرایا گیا بلکہ اس پر بڑا نازک دور آیا تو یہ مشاعرے ہی تھے، جنہوں نے اردو کی مقبولیت کو برقرار رکھا لہٰذا راحت کی شاعری کے مرکزی تصور اور اس کی شاعری کو کما حقہ سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کی عینک اتار کر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے وہ پچھلے پچیس تیس سالوں سے اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں کئی برس تک اسی باغ و بہار کا یہ چوتھا درویش اپنی داستان غم سنا تا رہا ہے اور دیکھنے والے سمجھے کہ یہ درویش اپنا قصہ تمام کر کے خاموش ہو جائے گا مگر اسی اثنا میں اچانک یہ پانچواں درویش بھی آدھمکا اور اب وہ اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ اردو شاعری کا یہ پانچواں درویش کوئی اور نہیں راحت اندوری ہے یہ اپنے عہد کے عوام کے دکھ درد کی داستان اپنی طنزیہ اور احتجاجی لب و لہجہ کے ساتھ بیان کرر ہا ہے جسے زمانہ بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ ان کے کلام کے مرتکز آمیز مطالعہ سے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بقول علامہ اقبال:

ع- ''کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے''

---

(۱) مضمون جرأت انکار کا شاعر، شاعر جمالی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۲۱۴

ان کی شاعری کا مرکزی کردار بے روزگار فساد زدہ مظلوموں کے درمیان گھرا ہوا وہ نوجوان ہے، جس کے بزرگوں کے تاج آج بھی عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے سر کی پھٹی ٹوپیوں پر اور اس کی زبوں حالی پر طنز کے تیر برسائے جا رہے ہیں حالانکہ زیادہ دن نہیں گزرے اونچے اونچے محلات ان کے مسکن تھے اور غیر مفتوح قلعوں پر آج بھی اس کے بزرگوں کے نام کندہ ہیں، چند مثالیں دیکھئے:

کہاں وہ خواب محل تاج داریوں والے
کہاں یہ بیلچے والے تگاریوں والے
مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں
مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے
ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بٹیا

راحتؔ اندوری کی شاعری ماضی زدہ ضرور ہے مگر اس کا ماضی اس کے پاؤں کی بیڑیاں نہیں بن سکا بلکہ وہ اس سے خود احتسابی کا کام لیکر خود کو کسی کام کے لائق ضرور بنانا چاہتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ قوموں کے زوال کے کیا راستے ہیں وہ ان کو مسدود دیکھنا چاہتا ہے۔ اکثر اس کو اپنے سارے نظریات اور عقائد کھوکھلے اور بے آبرو بھی معلوم ہوتے ہیں۔

راحتؔ اندوری نے اپنے عہد کا مطالعہ بہت باریکی سے کیا ہے۔ وہ انسانی مزاج اور شخصیت کی گلیوں سے گزرنے کا ہنر جانتا ہے نئی زندگی کی مصلحت اندیشیوں کا اسے علم ہے اور وقتی طور پر رشتوں کے بننے بگڑنے کو خوب سمجھتا ہے۔

اب پھرتے ہیں ہم رشتوں کے رنگ برنگے زخم لئے
سب سے ہنس کر ملنا جلنا بہت بڑی بیماری ہے

شہروں شہروں گاؤں کا آنگن یاد آیا
جھوٹے دوست اور سچا دشمن یاد آیا
دلوں کا رشتہ ہی سب سے بڑی صداقت ہے
جسموں کی آرائش ہوتی رہتی ہے
کائی جمی رہتی ہے روحوں پر لیکن
جسموں کی آرائش ہوتی رہتی ہے

راحتؔ اندوری کی شاعری اس عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح محض فرد یا ذات کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ وہ انسانیت کی پیچیدگیوں تک محدود رہنا چاہتا ہے وہ اپنے زمانے کے نوجوانوں کو فعال اور متحرک دیکھنا چاہتا ہے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اس کا مسلک نہیں ہے اس کی شاعری کچھ کرتے رہنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ راحت زندگی کی حرمت کو برقرار اور وقار کو بچائے رکھنے کیلئے انہیں آگے بڑھ کر سڑکوں پر آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

سڑک پر وردیاں ہی وردیاں ہیں
کہ آمد پھر کسی تہوار کی ہے
یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے
اٹھو اے چاند تارو شب کے سپاہیو
آواز دے رہا ہے لہو آفتاب کا
زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پر نکلنا ہوگا
گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا

اے چراغو تمہیں جلنا ہے سحر ہونے تک

کہیں منہ زور ہواؤں سے چپک مت جانا

راحتؔ کی غزل زخموں کو کریدنے احساس کی آنچ کو بڑھانے اور سوچ کو بے چین کر دینے والی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف رائج شعری پیرایوں سے ان کا گریز اور مروجہ غزل کے مانوس علائم سے دشمنی کی حد تک گریز ہے۔ اسی لئے وہ اپنے الفاظ لہجے اور اسلوب سے قاری کو ایک خوش گوار اور تحیر آمیز فضا خلق کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر پن اور انوکھے پن کا یہ عمل کچھ زیادہ ہی تیز ہے ان کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قافیہ کا استعمال میر انیس یا داغ دہلوی کی طرح کرتے ہیں۔ قافیہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ذہن سامع یا قاری پر دستک دیتا ہے۔ ان کی شاعری بیانیہ کے باوجود اثر آفرینی سے بھر پور ہے۔ ہر فنکار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیقی فکر سے مناسبت رکھنے والے عطر کشید کرے اس میں ہرج نہیں کہ تنقید کی بصیرت اور مشورے سے جہاں کام نکلتا ہو فائدہ اٹھایا جائے لیکن ہر نقاد کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کر دینا بھی درست نہیں۔ راحت نے تنقید کو اپنا رہنما نہیں بنایا ان کے وجدان اور ذوق سلیم نے جو راہ دکھائی اسی کو انہوں نے اختیار کیا اور کامیاب بھی ہوئے اس ضمن میں ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

فن پر جتنی تنقیدیں ہیں

فن اتنا باریک نہیں ہے

راحت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم عصر بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح زندگی کے حقائق اور تلخیوں اپنے عہد کی ضرورتوں کو اور عصری مسائل کے اظہار کو اپنا وسیلہ غزل ٹھہرایا ہے۔ حالات نے معاشرے اور سماج کو جن اختلافات و تضادات اور نابرابری کا شکار بنا رکھا ہے ان کے سارے نقوش راحت کی غزل میں ابھرے ہیں۔ انسانیت کو درپیش پیچیدہ مسائل الجھے سوالات اور زندگی کی تلخیوں کو بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی ایسے لمحات کا بھی فنکار کو سامنا ہوتا ہے جب اس کی خود

زبان فگار ہونے لگتی ہے۔ اسی بات کو راحت اپنے شعر میں یوں کہتے ہیں:

وہ اک سوال ہے پھر اس کا سامنا ہوگا
دعا کرو کہ سلامت میری زبان رہے

زبان کے سلامت رہنے کی فکر اور درد اس دور کے قریب قریب ہر فنکار کو ہے۔ لیکن دوسرے کے مقابلے میں راحت کا درد کچھ بڑھ کر ہی محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا لہجہ تلخ اور باغیانہ ہے۔ ان کے یہاں نشتریت اور زبان میں لوچ و لچک کی جگہ پر کھردراپن ہے۔ اپنے ماضی سے جڑے رہنے کی خواہش ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے عمداً غزل کے روایتی انداز لفظیات اور مزاج سے بسا اوقات انحراف بھی کیا ہے اور اپنی بات اپنے ڈھنگ اور انداز سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ خیال وفکر کے نئے پن نے ان کی غزل کو دلچسپ اور انوکھا بنا دیا ہے یہ ایسے اوصاف ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے لہجے اور اسلوب میں جو دھار اور کاٹ ہے وہ ان کے اسلوب کو نیا بنا دیتی ہے ان کا اظہار سلیقہ مندی لئے ہوئے ہے اور سب سے الگ تھلگ ہے۔ راحت آج کے انسان کی زندگی کو اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ آئنہ بنا کر ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔

ہرے بھرے کئی شہروں کا تجربہ ہے مجھے
کہیں بھی جایئے جنگل ضرور نکلے گا

اب میرے حال پہ شرمندہ ہوئے ہیں وہ بزرگ
جو مجھے پھولنے پھلنے کی دعا دیتے تھے

شکستہ کشتیوں سے کیا امیدیں
کنارے سو رہے ہیں پار ہوجا

رشتہ رشتہ سایۂ دیوار و در میں قید ہوں
میرا دکھ یہ ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں قید ہوں

یہاں تو موت کا سیلاب آتا رہتا ہے
بہت بچا تھا مگر اب کی بار میں بھی ہوں

میں جن کے بولتے الفاظ کو گونگا سمجھتا ہوں
وہ بوڑھے ہونٹ میرے واسطے جنت بناتے ہیں

روز ہم اشکوں سے دھو آتے ہیں دیوار حرم
پگڑیاں روز فرشتوں کی اچھال آتے ہیں

راحت کی غزلوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ زندگی کی کسی بہت اہم گرہ کو کھولنے کی کوشش میں ہیں لیکن ان کو کامیابی نہیں مل پا رہی ہے۔ تلاش و جستجو کی یہی کیفیت ان کے ہم عصروں کے یہاں بہت شاذ و نادر ہی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بات کہنے کا ڈھنگ سب سے الگ اور منفرد ہے۔ راحت شعوری یا غیر ارادی طور سے اس فکر میں ضرور رہتے ہیں کہ بات کچھ ایسی ڈھنگ سے کریں کہ قاری کو راحت کی بات اپنی بات محسوس ہو حالانکہ کہ تخلیقی عمل بہت ہی وقت طلب اور مشکل ہے مگر راحت یہ کام نہایت کلاسیکی رچاؤ سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو قاری کے تجربات اور مشاہدات سے اس طرح ملا دیتے ہیں کہ وہ اسے اپنی بات سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مخاطب پر ایسی نفسیاتی فضا تعمیر کر دیتے ہیں کہ ان کا قاری بھی خود کو اسی فضا میں محو گلگشت سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح اس کو نہایت انوکھی خوشی اور سرشاری محسوس ہوتی ہے۔ راحت کی غزلیں معاشرتی نظام کے تضادات زندگی کے تلخ حقائق، حالات کی بے ثباتی سنگینی بے یقینی خوف فسادات انسانیت کے مجروح ہونے آدمی کے فنا ہونے اور ماحول و حالات کے جبر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی لئے وہ عوام و خواص دونوں میں مقبول ہیں۔

کالج کے سب لڑکے چپ ہیں کاغذ کی ایک ناؤ لئے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی ہے بیکاری

یہ صرف عوام وغریب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ خواص اور امیرزادے بھی اسی کا شکار ہیں یہی کیفیت راحت کی شاعری کو ہمہ گیریت عطا کرتی ہے۔

سونے کا رتھ فقیر کے در تک نہ آئے گا
کچھ مانگنا ہے ہم سے تو پیدل اتر کے آ

یہاں تو چاروں طرف کوئلے کی کانیں ہیں
بچا نہ پائے گا کپڑے سنبھالتا کیوں ہے

خریدے ہیں میرے بچوں نے فاقے
میں سڑکوں پر مقدر بیچتا ہوں

راحت کی غزلوں کی زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے اس لئے ان کی تفہیم اور راحت کی بات کی ترسیل آسان ہے۔ وہ اپنی باتوں کو پیچیدہ نہیں بناتے لیکن اشارے اشارے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ علامتی پیرایۂ اظہار سے ان کے یہاں گریز کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ انہوں نے معنویت سے دامن کھینچ لیا ہے اور غزلوں میں ایک نئی پرکشش فضا تعمیر کرتے ہیں، جس کی زنجیر دور دور تک لے جاتی ہے۔ یہ ساری خوبیاں مل کر راحت کی غزلوں کو ایک نیا روپ نیا رنگ اور مزاج عطا کرتی ہیں۔

یہ کیسی روشنی ہے کہ احساس بجھ گیا
ہر آنکھ پوچھتی ہے کہ منظر کہاں گئے

میں سبک لفظ و معنیٰ کا امین
سنگ بھی آئے تو پانی کردوں

کٹی جاتی ہیں سانسوں کی پتنگیں
ہوا تلوار ہوتی جارہی ہے

بکھر چکا ہوں میں املی کی پتیوں کی طرح

اب اور لے کے کہاں تک غرور جائے گا

شاخ پر جتنے تھے پھل کوئی چرا کر لے گیا

اور ہم اخلاق کے پابند ہوکر رہ گئے

تو جو چاہے تو ترا جھوٹ بھی بک سکتا ہے

شرط اتنی ہے کہ سونے کی ترازو رکھ لے

ہمارا شوق ہے دارو رسن کی پیمائش

تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

یہ بھول مت کہ ابھی سر پہ آسمان بھی ہے

کسی کے سر کا دوپٹہ اتارنے والے

اندھیری رات کے گمراہ جگنوؤں کیلئے

اداس دھوپ کی ٹہنی پہ رات رکھ دینا

مجھے خبر نہیں مندر جلے ہیں یا مسجد

مری نگاہ کے آگے تو بس دھواں ہے یہاں

راحت کی خوبی یہ ہے کہ کسی بڑی سطح پر کوئی بڑا ہفت خواں سر کرنے کے مدعی نہیں ہوتے مگر زندگی کے تعلق سے ان سچائیوں، تصادمات اور کشمکش کو اجاگر کردیتے ہیں، جن سے آج کا انسان جوجھ رہا ہے نیز یہ کہ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے ان چہروں کی نقاب اٹھانے کی فکر میں ہیں، جنہوں نے حیات انسانی کو ایک کربناک تماشا بنا دیا ہے اور اس کوشش میں وہ قدم قدم پر اپنے قاری کو اپنا شریک اور ہم خیال بنائے رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں درد و کسک کا اظہار صرف ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ سب کا درد ہے۔

یہ بوڑھی قبریں تمہیں کچھ نہیں بتائیں گی
مجھے تلاش کرو دوستو یہیں ہوں میں

سب ہی اپنی تیز گامی کے نشے میں چور ہیں
لاکھ آوازیں لگالیجے ٹھہرتا کون ہے

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک حرف کو صدا بھی مان

محبتوں کا سبق دے رہے ہیں دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے

کسی مکین کی آمد کے انتظار میں ہیں
میرے محلے میں خالی کئی مکان پڑے

ہوں لاکھ ظلم مگر بددعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

ابھی رنگوں کی زبان گنگ پڑی ہے لیکن
جب یہ تصویر بنے گی تو قیامت ہوگی

سو رہی تھی اجلے کپڑے پہنے کالی آتما
کم سمجھ لوگوں نے ذرے کو ستارہ پڑھ لیا

ان کی غزلوں میں جا بہ بجا ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں، جو قاری کے ذہن وفہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور انہیں حیات و کائنات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

کوئی بھی دور ہو لے کر جہاد کی مشعل
میری طرح کوئی پاگل ضرور نکلے گا

وہ ایک تیر ہے جس کا شکار میں بھی ہوں

میں ایک حرف سہی دل کے پار میں بھی ہوں

موت لمحے کی صدا زندگی عمروں کی پکار

میں یہی سوچ کے زندہ ہوں کہ مرجانا ہے

بادشاہوں سے پھینکے ہوئے سکے نہ لئے

ہم نے خیرات بھی مانگی ہے تو خود داری سے

یہ کہاں لے کے چلے آئے ہو پلکوں کے چراغ

تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہو اکیسی ہے

راحت کی غزلوں میں حسن وعشق کی چھیڑ چھاڑ اور گھاتیں ہیں اور جمال یار سے مسرور ہونے کی حقیقت بھی۔ انسانی رشتوں کی شناخت ہے زندگی کا تقدس اور معصوم بچوں کی تصویریں ماں باپ بھائی بہن کے چہروں کی مسکراہٹیں ہیں اور اداسیاں بھی، جذبوں اور احساسات کی کسک۔ فساد زدہ لہولہان چہروں کے نقوش اور اپنی بے چہرگی کا درد اور المیہ۔ حق و باطل کا تصادم اور فرسودہ نظام حیات اور رسم و رواج سے انحراف بھی۔ ان تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں سموکر انہوں نے غزلوں کو ایک نیا ذائقہ، کیف وسرور، اور نیا پن دیا ہے۔ انہوں نے غزل کو جو لہجہ اور آہنگ بخشا وہ ان کا اپنا ہے۔ انہوں نے غزل کو محدود فضاؤں سے گلوخلاصی دے کر وسیع تر امکانات اور کائنات سے متعارف کرایا۔ اس طرح غزل کو ایک کھلی فضا اور دنیا سے آشنا کر کے اسے ایک نیا ذائقہ دیا ہے۔

راحت کے بارے میں ایک خاص خیال یہ ہے کہ وہ مشاعروں کے شاعر ہیں اور مشاعرے کبھی ہیرو شب کے تصور سے خالی نہیں رہے۔ لیکن آج کے مشاعروں کے بارے میں یہ خیال یقین کی حد تک راسخ ہے کہ مشاعروں میں پڑھنے والے اور مقبول ہونے والے شعرا کا کوئی ادبی مقام نہیں رہ جاتا اور اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مشاعروں میں عموماً ادبی ذوق رکھنے والوں کا فقدان ہوتا اور مجمع میں صرف

شعروشاعری سے نابلد ہڑبونگ مچانے والوں کا مجمع ہوتا ہے، جہاں اچھا شعر بھی اپنی آبروکھو بیٹھتا ہے۔ ایسے لوگ شعر کی فنی عظمت اوراس کے ادبی وقار سے ناواقف ہوتے ہیں، جن کی شمولیت کی وجہ سے عموماً اچھے پڑھنے والوں کو ان کے ذوق کی سیرابی کیلئے اوچھے اور برہنہ قسم کے بازاری اشعار بھی سنانا پڑتے ہیں ایسے بہت سے شعرا کی مثالیں سامنے ہیں جن کی فنی استطاعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب وہ مشاعروں میں اس قسم کے اشعار پڑھتے ہیں:

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا
مردانگی کی اس کے بڑا زور تھا مگر
آئی شب وصال تو مردار ہوگیا

تو لکھنؤ کے ان قدیم درباری مشاعروں کا نقشہ ذہن میں ابھرآتا ہے، جہاں درباری سامعین کے سامنے ان کے ذہنی معیار اور سطح کے تحت اکثر باشعور اور باصلاحیت شعرا بھی اپنا ادبی شعری اور فنی وقار کھو بیٹھے تھے اور جن کی ہرزہ سرائی پر میر نے جھنجھلا کر چوما چاٹی کا شاعر کہہ دیا تھا آج بھی ایسے شاعروں کا قحط نہیں ہے جو عوامی مشاعروں میں دل سے نکلی ہوئی بات کو دل میں اتار دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ایسے شاعروں میں راحت اندوری کا شمار کیا جا سکتا ہے، جو عہد حاضر کی عصبیت نابرابری، لوٹ کھسوٹ نیتاؤں کی کسی طرح سے دھن اور جٹ کرنے کے منصوبہ بند معاملوں کے خلاف نکل کر بہانگ دہل سچ بات کہہ گزرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتے۔ راحت کے ذہن وشعور میں انسان کشی کے خلاف آواز بلند کرنے کی بے پناہ تڑپ ہے اور اقتدار کے نشے میں ڈوب کر حق تلفی کرنے والوں کے خلاف جذبہ بغاوت ہے ان کے خلاف شعلہ افشانی کا حوصلہ ہے جس کا وہ کھل کر اظہار کرنے میں نہیں چوکتے۔ اسی لئے بڑی بلند آہنگی سے اپنا کلام سنانے اور موجود تمام سامعین کو دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔ وہ ایک انسان دوست کی طرح اپنی آواز کو مشاعروں کے وسیلے سے پھیلا کر ناسمجھوں کو ہوش اور حوصلہ دیتے ہیں۔

راحت اندوری نے ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر کے مشاعروں پر حکومت کی ہے۔بعض لوگوں نے ان کے سر یہ الزام عائد کرر کھا ہے کہ وہ عوام کیلئے تفریحی چیزیں لاتے ہیں ان کے اس احساس میں بلاشبہ ان حضرات کا جذبہ تعصب کارفرما ہے۔راحت اور مشاعروں کے تعلق سے شکیل گوالیاری اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''مشاعرہ میں شاعر کا تعلق عوام سے براہ راست ہوتا ہے۔عموماً ایسے مضامین بیان کئے جاتے ہیں، جن سے دلچسپی عام ہو۔شعر کی ادائیگی کو پرکشش بنانے کیلئے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔مختصر یہ کہ شاعر کا کام شعر کہہ کر ختم نہیں ہوجاتا شعر کی ترسیل کے آخری مرحلے تک اسے چوکنار ہنا پڑتا ہے، بین جانسن نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے:

"A poet has two hands as a drama has one for making the other repeating"

عہد موجود میں شعر کی زبانی خواندگی اور تحریری پیش کش میں فرق کیا جانے لگا ہے، جو بھی تخلیق تحریر میں آکر طباعت کے مراحل سے گزر جاتی ہے اسے تو آنکھ بند کر کے ادب مان لیا جاتا ہے اور وہ زبانی خواندگی تک محدود رہ جاتی ہے خواہ اس کا حلقہ اثر کتنا وسیع کیوں نہ ہوا سے محض تفریح اور دل بہلا وا سمجھ لیا جاتا ہے .... میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری میں پیش کی جانے والی ہر تخلیق ادبی معیار پر پوری اترتی ہے اسی لئے کہ بیشتر تخلیقات میں تخلیقیت افسانویت اور خود اظہاریت کا فقدان ہوتا ہے تخیل کی کارفرمائی جو عوامی سچ کو شاعرانہ سچ میں تبدیل کر کے لافانی اور نا قابل تردید بنادیتی ہے نام کو نہیں ہوتی۔لیکن شاعری کے تمام عناصر ولوازمات ان تخلیقات میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں، جو آئے دن تھوک میں چھپا کرتی ہیں۔راحت اندوری نے اپنی مشاعرہ گردی کا جواز اپنے ایک شعر میں پیش کر کے معترض کا منہ بند کر دیا ہے۔

کام جو کر نہ سکیں تحریر میں

مجھ سے کہئے تو زبانی کردوں (۱)

راحت اندوری کے مطبوعہ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں یہی ان کا انداز زبانی پن اکثر جگہ موجود ہے لیکن راقم کے خیال سے اس زبان میں شعری لوازمات سے چشم پوشی یا صرف نظر کرنے کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ خاص طور سے ان کا یہ شعر دیکھئے:

وہ مجھ سے کہہ کے گیا ہے کہ لوٹ آؤں گا

میرے عظیم خدا اعتبار دے مجھ کو

راحت کی مقبولیت ان کی آواز اور مشاعروں میں ان کی انوکھی پیش کش کی رہین منت ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کے بحر بیکراں یا ریگ زاروں میں اس قدر احتیاط اور حوصلے سے جم کر قدم رکھے ہیں کہ پھر کسی طرح کی ہوائے تند و تیز میں وہ بغیر ڈگمگائے گزر گئے۔ انہوں نے دو مصرعے جوڑ کر قلم کی آبرو کو وقار بخشا، الفاظ کی سادگی اور عظیم قسم کی معنویت کی تہہ داری اور گہرائی ان کا شیوہ ہے۔ راحت اپنے انفرادی طرز فکر اور مسحور کن انداز میں سنانے کے سبب اسٹیج مشاعرہ پر اکیلے دکھائی دینے کا ہنر رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کو سننے کیلئے ان کے مشاعروں میں دور دور سے کھنچ کر چلے آتے ہیں نہ موسموں کے مزاج کی برہمی مانع ہوتی ہے اور نہ تکان راہ۔ یہ ان کی خود کی کمائی کا فیضان کہا جا سکتا ہے بہت دن پہلے ایک مشاعرے کی نظامت کرتے ہوئے منور رانا نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ:

''صاحبو تاش میں چار بادشاہ ہوا کرتے ہیں لیکن مشاعرے کی ملکیت کا صرف ایک بادشاہ ہے اور وہ ہے راحت اندوری مشاعروں کا بے تاج بادشاہ''

بلاشبہ ایک مانے ہوئے شاعر کا یہ جملہ ایک زبردست خراج عقیدت ہے، احمد کلیم فیض پوری راحت کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) علمہ البیان۔ شکیل گوالیاری، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۱۹۷

''راحت کی شاعری بہت سی منزلیں طے کرچکی ہے آج اس کی شاعری میں غالب کا رچاؤ بھی ہے، میر کی حلاوت اور اقبال کی عالمگیریت بھی۔ عصر حاضر نے جو گھاؤ دئے ہیں اس کی ٹیس راحت کی شاعری میں تحلیل ہوچکی ہے، جس زہرنا کی کی وہ تاب نہ لا سکا ہے اس کا قطرہ قطرہ اپنے شعروں میں انڈیل دیا ہے پھر کسی پہاڑ کی بلندی سے انہیں تو وادیوں اور ڈھلانوں میں بکھیر دیا ہے کہ شاعری کی آنچ میں تپ کر اس کی زہرنا کی نے اپنی خاصیت بدل لی ہے۔''(۱)

اسی ضمن میں عقیل نعمانی لکھتے ہیں:

''راحت کی مشاعرے میں آمد نے ایک انقلاب برپا کردیا۔ انہوں نے نہ صرف ترنم بازوں کے ایوانوں کو زمیں بوس کیا بلکہ تحت پڑھنے والے بہت سے شعرا کو اعتماد کی دولت سے مالا مال بھی کیا۔ راحت کے انداز کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کے ڈپلی کیٹ بھی تیار ہونے لگے اور اب تو بقول شخصے:

''ہر شہر میں آدھا درجن راحت اندوری مل جائیں گے اس صورت حال کے باوجود راحت بھیڑ میں پہچانی جانے والی ایک منفرد آواز کا نام ہے۔ راحت کی نقل جاری ہے تقلید بھی اور تنقید بھی۔ مگر انہوں نے ایک بار اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو ''ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا'' کے مصداق گرم سفر رہنے کو اپنا نصب العین بنایا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آج وہ مملکت شعروادب میں اسی منصب پر فائز ہیں جہاں شاعر کو یہ اعلان کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے ''ہم سے پوچھ کہ غزل کتنا لہو مانگتی ہے'' انہوں نے بہت سے نامانوس الفاظ کو اپنے اشعار کا زیور پہنایا کہ شعری فضا پر کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے بلکہ شائقین ایک نئے شعری ذائقے سے لطف اندوز ہوئے۔''(۲)

ان تمام خصوصیات کے باوصف تعجب خیز بلکہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اکثر نقاد حضرات صرف

---

(۱) مضمون ....کوئی صحرا چھپا ہے۔ از احمد کلیم فیض پوری مشمولہ لمحے لمحے بدایوں ص ۳۳۶

(۲) بے جگہ شعلہ بیانی مصنفہ عقیل نعمانی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۳۸

اس وجہ سے راحت کی شاعری کونظر انداز کرتے ہیں کہ ان کی کامیابی کا راستہ مشاعروں سے ہوکر گزرتا ہے خواہ انہوں نے کتنی ہی اچھی اور معیاری شاعری کیوں نہ کی ہو، ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ سیکڑوں مضامین نقد چھپوانے اور سیمیناروں میں داد بٹورنے کے باوجود وہ اس منزل کو نہ چھو سکے ہوں جس پر راحت فائز ہیں۔ راقم کے اس خیال کو عقیل نعمانی کے اس تجزیے سے تقویت پہونچتی ہے کہ:

''راحت اندوری ایک کامیاب غزل گو، نغمہ نگار اور ہر قسم کی بناوٹ اور تصنع سے پاک انسان بھی ہیں، جہاں انہوں نے اپنی شاعری میں:

''یہ شعر وہ ہیں جو سرکس میں کام آتے ہیں''

قسم کے موضوعات کا ذکر کر کے مشاعروں میں ہنگامے برپا کر دیتے ہیں۔ وہیں:

''شاخ سحر پہ مہکے پھول اذانوں کے''

یا

''دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی''

جیسے معیاری کلام سے ادب کے ان ٹھیکیداروں کی بولتی بند کی جو انہیں صرف مشاعروں کا کامیاب شاعر ٹھہرانے پر تلے ہوئے ہیں''(۱)

یہ بات بلا خوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ مشاعروں میں غزل گو شعرا تو کم ہی نظر آتے ہیں ہاں غزل گانے والے زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں راحت اسی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ نہایت بے باک لہجے میں مشاعروں کی ہیئت گدائی نہایت لطیف انداز میں یوں طنز کرتے ہیں:

ادب کہاں کا کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعروں میں تماشے مداریوں والے
مجھ سے دل کا حال کوئی کب پوچھتا ہے
غزلوں کی فرمائش ہوتی رہتی ہے

---

(۱) بے جگر شعلہ بیان از عقیل نعمانی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۳۴۰

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی

داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

شدت احساس کی دین یہ دل میں چبھ جانے والا طنز جس میں نہ لفاظی ہے کہ کرتب بازی بلکہ عام زبان میں مہذب قسم کی زہرناکی اور نشتریت ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''راحت اندوری مشاعروں کا مشہور شاعر ہے اس لئے اس پر اکثر برا وقت پڑتا ہے۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ وہ ناظموں کے جملوں، چٹکلوں اور لطیفوں کا اثر قبول نہیں کرتا اور نہ سامعین کے وقتی طور پر بگڑے ہوئے سطحی موڈ کو خاطر میں لاتا ہے۔ مشاعرے کے رومانی ماحول اور لذتیت کے مارے ہوئے ذہنوں سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ اسٹیج پر اپنے مقام سے کلام کرتا ہے۔ وہ اپنے غیر رومانی اشعار سے مشاعرے کی رومانی فضا کو بدل دیتا ہے اور سننے والوں کو خواب آور ماحول سے نکال کر زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے۔ مجھے راحت کی یہ خود اعتمادی اور سماجی ذمہ داری کا انداز پسند آتا ہے، مجھے کہنے دیجئے کہ مشاعروں میں غیر رومانی جدید غزل کو مقبول بنانے میں راحت اندوری بھی شامل ہیں۔''(۱)

ادب سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے سماج کی سچی تصویر پیش کرنے میں موضوع سب سے اہم رول ادا کرتا ہے راحت کے یہ اشعار دیکھئے ان میں حالات حاضرہ کا عکس اور سماج کے نئے تقاضوں سے بھرپور نئے اسلوب سے مالا مال کیفیت موجود ہے۔

سب کے دکھ سکھ اس کے چہرے پر لکھے پائے گئے

آدمی کیا تھا ہمارے شہر کا اخبار تھا

تو کہاں گم ہے ترے ریشمی آنچل کی قسم

آنسو اب آنکھ میں کنکر کی طرح لگتا ہے

اخبار کنکر غزل کے الفاظ نہ ہونے کے باوجود راحت نے اس سلیقے سے انہیں باندھا ہے کہ بار

---

(۱) نئی غزل کا قلندر، پروفیسر عنوان چشتی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۱۰۳

سماعت نہیں ہوتے۔ اسی قبیل کا ایک اور دل میں گھر کرنے والا اچھا شعر ملاحظہ کیجئے:

حالانکہ دوستوں سے بہت کم ملے ہیں ہم
لیکن کبھی نقاب لگا کر نہیں ملے

کیا یہ آج کے دور کی سچائی نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے چہرہ بدل کر ہی ملاقات کا خوگر ہے۔ حقیقت میں یہ اللہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے جس سے کسب فیض کر کے ہی ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں۔ سورہ بقر آیت ۲۱ر ارشاد باری تعالیٰ ہے ''جب یہ لوگ مومنین کی محفل میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں لیکن جب اپنے زمرہ شیاطین میں پہنچتے ہیں تو ان کا روپ بدل جاتا ہے کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم ان سے استہزا کر رہے تھے'' یہ سچائی آج زندہ جاوید ہے جدھر دیکھو جس رشتے کو بھی ٹٹولو یہی چہرہ نظر آئے گا اسی سلسلے میں راحت کا یہ کرب بھی ملاحظہ کیجئے:

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

مشاعرے کے تعلق سے عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ انور جلال پوری کانپور کے مرچنٹس چیمبر ہال کے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں ان کی ملاقات راحت اندوری سے ہوئی تھی انور جلال پوری کی راحت سے دوبدو یہ پہلی ملاقات تھی۔

''ابھی تک راحت کی تعریفوں سے کان آشنا تھے، ملاقات کے وقت اس کی بے ترتیب مگر پر مغز گفتگو سنی تھی لیکن اس کی شاعری کے تیور سے ناواقف تھا۔ اس کے لہجہ کی شدت اور صلاحیت کا اندازہ نہیں تھا، اس کے ایک ایک مصرعے میں فرہاد کے تیشے کی تیزی ہے اس حقیقت سے میں بالکل بے خبر تھا نہیں معلوم تھا کہ اس کی دست نگاہ میں سارا دشت امکان بس مسافت یک قدم ہے............ میں نے صرف پانچ چھ شاعروں کے بعد راحت کو دعوت سخن دے دی.......... راحت مائیک پر کھڑے ہوئے نہ جانے کیوں اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف کے اوپر باندھے ہوئے تھے سامعین میں سے کسی منچلے نے آواز لگائی

ہاتھ کھولو.........راحت نے بڑی برجستگی سے ہاتھ کھولتے ہوئے جواب دیا ''جی شکریہ! آپ جو جو کہئے میں کھولتا جاؤں'' راحت کے اس برجستہ جملے نے ایک لمحے میں اس منچلے کی فتح کو شکست میں تبدیل کردیا۔ سامعین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہے میں تو شعرائے کرام بھی شریک ہوئے راحت کی ذہانت کی یہ پہلی چھاپ تھی جو ہم لوگوں کے ذہنوں پر پڑی راحت نے شعر سنانا شروع کئے:

ترے نام پر میں نے ہر آفت سر پر رکھی تھی
نظر شعلوں پر رکھی تھی زباں پتھر پہ رکھی تھی
انہی سانسوں کے چکر نے ہمیں وہ دن دکھائے تھے
ہمارے پاؤں کی مٹی ہمارے سر پہ رکھی تھی
سحر تک تو جو آجاتے تو منظر دیکھ سکتے تھے
دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد، اس طرح کے توصیفی کلمات نے مرچنٹس ہال کی چھت کو سر پر اٹھالیا تھا، چند منٹ کی اشعار نوازی نے راحت کو مشاعرے کا ہیرو بنادیا۔ راحت کے انداز اور اس کی شاعری نے لوگوں کو چونکا دیا تھا اس میں آگے بڑھنے ترقی کرنے اپنی پہچان بنانے اور اپنا نقش قائم کرنے کی صلاحیت تھی خاص بات یہ کہ یہ صلاحیت اب تک قائم ہے اس کے تخلیقی ذہن میں اب تک تھکن نہیں پیدا ہوئی غزل کے مضامین اور موضوعات اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔'' (۱)

راحت کے مزاج میں ایک خاص قسم کی خود اعتمادی ہے وہ جب سامعین مشاعرہ سے کہتے ہیں کہ مجھے غور سے سنئے میرا بھروسہ نہیں کہ میں کب اچھا شعر سنا دوں بات یہ مزاحاً ضرور ہوتی ہے مگر ہر ایک اسے ان کی ایک ادا سمجھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کا یہ انداز سنجیدگی سے معمور ہوتا ہے۔ مشاعرے میں سامعین شائقین اور ناظرین پر مشتمل جو بھیڑ ہوتی ہے اس میں باذوق حضرات

---

(۱) تعارف سے تعلق تک۔ مضمون انور جلال پوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۲۹۲

کی تعداد کم ہی سہی اگر ان کی مدارات کا لحاظ شاعر نہ برقرار رکھ سکا تو یہ اس کی بے خبری ہوگی ورنہ وہ ایسے اشعار سنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

بہت سے لوگ کہ جو حرف آشنا بھی نہیں
اسی میں خوش ہیں کہ تیری کتاب رکھتے ہیں

ترا بھلا ہو مسافر کو لوٹنے والے
میں تجھ کو خضر علیہ السلام سمجھا تھا

راحت کی دھڑکن جب تک جاری رہتی ہے
سوتے نہیں ہم ذمہ داری رہتی ہے

اسی خود اعتمادی نے راحت کو دنیائے اردو کی شاعری کے مشاعروں کے ڈائس سے ڈاکٹر اندوری کی منزل تک کا سفر طے کرتے دیکھا ہے۔ ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ غرض کہ جہاں اردو مشاعروں کی محفلیں سجتی ہیں ہندوستان کا یہ نمائندہ شاعر سوال کرتا نظر آتا ہے۔

گلاب خواب دوا زہر جام کیا کیا ہے
میں آگیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے

اور اسی وجہ سے ان کی یہ شاعرانہ تعلّی دل میں جگہ کر لیتی ہے۔

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

راحت کی غزل تصنع اور بناوٹ کے الزام سے پاک ہے وہ چاہے سیاسی رنگ محل ہو یا غریب کا آنگن جہاں جو بھی دکھائی دیتا ہے وہ ویسے ہی اپنے لفظوں سے ایک تصویر بنا دیتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا انوکھا پن ہے جو صرف مداحوں کو نہیں نقادوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ زندگی سے قریب تر ہونے کی وجہ سے ہی ان کے اشعار کا اثر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تجھے کیا درد کی لذت بتائیں
مسیحا آ کبھی بیمار ہوجا
مگر اندر کوئی صحرا چھپا ہے
بظاہر ہم سمندر لگ رہے ہیں

راحت کی غزلوں میں کرب اور بے چینیوں کی الگ ہی شناخت ہے۔

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

نقادوں کی سطحی تنقید اور اچھے اشعار کا بخیہ ادھیڑنے والے بلکہ فن کے ساتھ کارقصابی کا انجام دینے والوں کی طرف راحت اشارہ کرتے ہوئے ان کی بے بضاعتی کا یوں پردہ فاش کرتے ہیں۔

''ایک مشہور تنقید نگار نے ایک نئے شاعر پر مضمون تحریر کیا اور جن اشعار کا حوالہ دیکر شاعر کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش کی ان میں کئی اشعار خاکسار کے تھے۔ جو ان کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے کسی دوسرے شاعر کے کھاتے میں چلے گئے ایک بات اور کہنا چاہوں گا صرف اس وجہ سے کہ میں رسائل میں چھپنے چھپانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا صرف مشاعرہ ہی میرے اشعار کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کئی بزرگان نقد ونظر تو مشاعرے کو ہی قبول نہیں کرتے افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ میں جب مشاعرے میں پڑھتا ہوں۔

بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یاتراؤں سے کچھ نہیں ہوگا

تو میری شاعری متعصب اور تنگ نظر ہوجاتی ہے اسی شعر کا چربہ اتار کر یا اس سے متاثر ہوکر ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''تمہاری رتھ پر تو مریادہ پرشوتم کا پرچم تھا تو ادب بن جاتا ہے میں نے ایک غزل میں موجودہ

تجھے کیا درد کی لذت بتائیں
مسیحا آ کبھی بیمار ہوجا
مگر اندر کوئی صحرا چھپا ہے
بظاہر ہم سمند لگ رہے ہیں

راحت کی غزلوں میں کرب اور بے چینیوں کی الگ ہی شناخت ہے۔

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

نقادوں کی سطحی تنقید اور اچھے اشعار کا بخیہ ادھیڑنے والے بلکہ فن کے ساتھ کارقصابی کا انجام دینے والوں کی طرف راحت اشارہ کرتے ہوئے ان کی بے بضاعتی کا یوں پردہ فاش کرتے ہیں۔

''ایک مشہور تنقید نگار نے ایک نئے شاعر پر مضمون تحریر کیا اور جن اشعار کا حوالہ دیکر شاعر کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش کی ان میں کئی اشعار خاکسار کے تھے۔ جو ان کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے کسی دوسرے شاعر کے کھاتے میں چلے گئے ایک بات اور کہنا چاہوں گا صرف اس وجہ سے کہ میں رسائل میں چھپنے چھپانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا صرف مشاعرہ ہی میرے اشعار کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کئی بزرگان نقد ونظر تو مشاعرے کو ہی قبول نہیں کرتے افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ میں جب مشاعرے میں پڑھتا ہوں۔

بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یا تراؤں سے کچھ نہیں ہوگا

تو میری شاعری متعصب اور تنگ نظر ہوجاتی ہے اسی شعر کا چربہ اتار کریا اس سے متاثر ہوکر ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''تمہاری رتھ پر تو مریادہ پرشوتم کا پرچم تھا تو ادب بن جاتا ہے میں نے ایک غزل میں موجودہ

ہے دھواں چاروں طرف بینائی لیکر کیا کروں
صرف آنکھیں ہی نہیں منظر بھی ہونا چاہئے

ہم بھی اب جھوٹ کی پیشانی کو بوسہ دیں گے
تم بھی سچ بولنے کو سزا دیتے تھے

زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پہ نکلنا ہوگا
گھر کے بوسیدہ کواڑوں سے چپک مت جانا

ہم دیا رکھ کے چلے آتے دیکھیں کیا ہو
اس دریچے پہ تو پہلے سے ہوا رکھی تھی

پھول جیسی مخملیں تلووں میں چھالے کر دیئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کر دئے

مشاعروں سے وابستہ شاعروں کی فہرست میں ایسے چند انے گنے نام ہی نظر آئیں گے، جو ادبی معیار کی میزان پر کھرے اترتے ہیں۔ ان میں ایک نام راحت اندوری کا ہے۔ مثال کے طور پر راحت کی شاعری سے چند اشعار جو زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور نہ صرف زندگی کو روداد یا زندگی کے معنیٰ متعین کرتے ہیں بلکہ ہمارے احساسات و جذبات کی پوری مفاہمت کے ساتھ ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈھنے میں زندگی برباد کی

اپنے ہونے کا ہم اس طرح پتہ دیتے تھے
خاک مٹھی میں اٹھاتے تھے اڑا دیتے تھے

ہوم منسٹر لال کرشن اڈوانی کو نشانہ بنایا ہے:

اس کونے سے اس کونے تک دعویداری سائیں کی
آسانی سے ٹھیک نہ ہوگی یہ بیماری سائیں کی
کھیت لہو سے ہم نے سینچا اور فصلوں پہ حق اس کا
روزہ رکھنے والے ہم ہیں اور افطاری سائیں کی

یہ غزل الہ آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی وہاں علی سردار جعفری تشریف رکھتے تھے انہوں نے مجھ سے یہ غزل لکھوالی اور اس کے بعد جب بھی مشاعروں میں گیا تو فرمائش کر کے یہ غزل سنی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں میری اس غزل کا حوالہ دیا اور میرے انداز کو سراہا۔'' (۱)

زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی راحت اندوری کا شعار ہے وہ اپنے محسوسات کھل کر بیان کرنے میں کبھی تذبذب کا شکار نہیں ہوتے ''ہوتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' اہل نظر کیلئے یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ راحت کے اشعار کہ تہہ میں فنی اور فکری بصیرت کی جوزیریں لہر ہولے ہولے بہہ رہی ہے وہ تپتے میدانوں میں نسیم سحر کے خوشگوار جھونکوں کا لطف دیتی ہے۔ راحت شعر گوئی اور شعر سنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ سہل اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں ادق مضامین اور اضافتوں سے گریز کرتے ہیں۔ جرأت اور بے باکی ان کی فطرت ہے۔ پاکستان میں مہاجرین کے جذبات کا ترجمان راحت کا یہ شعر بن چکا ہے۔ خندہ پیشانی اور انکساری ان کا خاصہ ہے غرور اور تمکنت کا شائبہ نہیں وہ شعر یہ ہے۔

اب کے جو فیصلہ ہوگا یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

راحت کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اسے چوری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کے

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۴۳

انداز کے شعر کہنا ہر کس وناکس کے بس بات نہیں ہے۔ راحت نے اپنی شاعری کو عہد حاضر کی تاریخی دستاویز بنا دیا ہے یہ آئندہ بھی اسی طرح ضوفشاں رہے گی جیسے آج ہے۔ ایسی ہی سچی شاعری ہمیشہ اپنے خالق کے نام کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔

باب چہارم

دیگر اصناف پر طبع آزمائی

اور

شاعری کے موضوعات

ایک یادگار ملاقات میں

راحت اندوری، گیت کار مجروح سلطانپوری

راحت اندوری اپنا کلام سناتے ہوئے۔ تصویر میں کیفی اعظمی بھی نظر آ رہے ہیں

تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر
فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

راحت اندوری نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی اور رفتہ رفتہ غزل ان کے مزاج ذوق اور فکر سے اتنی ہم آہنگ ہوگئی کہ انہوں نے کسی دوسری صنف سخن کی طرف نظر ہی نہیں گھمائی اور اس میدان میں ایسی منفرد راہ اپنے لئے استوار کی کہ ابھی تک نہ ان کے انوکھے طرز تک کسی کی رسائی ہوسکی اور نہ ان کے سلیقہ اظہار کی تقلید ہی ممکن ہوسکی جہاں تک ان کی انوکھی فکر اور تخیل کا تعلق ہے اس میں وہ گہرائی اور گیرائی ہے کہ از دل افتد ہر دل ریزد کا معاملہ سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے صرف غزل میں اپنے فن کے جواہر جگمگائے اور اپنی غزل کو وقت کی ضرورت زمانے کی آواز اور احساسات کے شکست و ریخت کی واردات بنا دیا۔ اسی طرح وہ بس Jake of all trades نہ رہ کر یہ کمی بھی اپنے دامن میں بٹور سکے But master of none اب ان کے بارے میں بانگ دہل راقم کہہ سکنے کی ہمت کرتا ہے کہ جیک آف آل ٹریڈس ہوں نہ ہوں لیکن ماسٹر آف غزل ضرور ہیں یہی ان کی عظمت ہے۔

راحت نے شاگردی استادی کی دنیا خدا معلوم کن وجوہات کی بنا پر ترک کی اور فلمی دنیا کی سیر کو نکل پڑے حالانکہ انہوں نے شہرت اور ناموری جو فلم سے باہر رہ کر حاصل کر لی وہ ہر ایک کے حصے میں

نہیں آتی۔ راحت نے اس دنیا میں پہنچ کر فلمی گانے یا گیت ضرور لکھے جو باکس آفس ہٹ بھی ہوئے اور عوام کے دلوں کو گرما بھی گئے لیکن راحت کا پیرایہ بیان یا اسلوب ادب سے ہٹ کر فلمی رنگینیوں میں گم نہیں ہوسکا یہاں بھی راحت کی آوازااوران کی شاعری کا زیروبم غزل سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اس لحاظ سے ہم ان گانوں یا گیتوں کو غزل ہی کہہ سکتے ہیں کسی دوسری صنف سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

راحت کے کلام کا بھرپور مطالعہ کرنے کے سلسلے میں راقم کو ان کی ایک حمد ولظم نما غزل کے پیرائے میں نظر آتی ہے ورنہ راحت اندوری غزل کے ہی شاعر ہیں، حمد کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

کیا تونے نہیں دیکھا دریا کی روانی میں
بہتے ہوئے پانی میں تیور بھی تو اس کا ہے
تو نوح کا بیٹا کچھ بس میں نہیں تیرے
کشتی بھی تو اس کی ہے لنگر بھی تو اس کا ہے
سورج کے نکلنے سے تاروں کے بکھرنے تک
موجوں کے تھپیڑوں سے طوفاں کے ٹھہرنے تک
غنچوں کے مہکنے سے کلیوں کے چٹکنے تک
کیا تو نے نہیں دیکھا پیکر بھی تو اس کا ہے
عظمت سے حقیقت سے منہ موڑنا چاہا تھا
کچھ ہاتھیوں والوں نے گھر توڑنا چاہا تھا
کیا تونے نہیں دیکھا کمزور پرندوں نے
کس طرح حفاظت کی وہ گھر بھی تو اس کا ہے
کیا تونے نہیں دیکھا کیا دیکھ لیا تونے
اس کے ہی اشارے پر یہ سارے تماشے ہیں

وہ دھوپ کا مالک ہے وہ چھاؤں کا خالق ہے

آنکھیں بھی اس کی ہیں منظر بھی تو اس کا ہے

کیا تو نے نہیں دیکھا وہ خاک کے ذروں سے

سورج بھی بناتا ہے تارے بھی بناتا ہے

میں کیا ہوں مرا کیا ہے مٹی ہی سمجھ مجھ کو

پتھر ہی سہی لیکن پتھر بھی تو اس کا ہے

یہ پوری غزل نما حمد وحدت الوجود کی معرفت اس کی وحدانیت اس کی ہر شے پر قدرت، ہر سانس کی آمدورفت، پھولوں کے چٹکنے مہکنے اور پھول بننے تک ساری کارفرمائیاں اس لم یزل ولا یزال طاقت کی ہیں، جو بظاہر نظر سے اوجھل ہے لیکن ان سارے مناظر آسمان کہکشاں چاند تاروں کی چمک سورج کا طلوع وغروب، نوح کا طوفان بلاخیز میں ایک ادنیٰ سی کشتی کی کیا بساط بس اور صرف اس کی طاقت اور قدرت ہی تو ہے کہ سب کو پار لگاتی ہے۔ ان تمام مناظر میں اس واحد وقدوس کا دیدار صرف اور صرف دیدۂ بینا رکھنے والوں کو ہوسکتا ہے شرط ہے ہوس دنیا ہم کو دیکھ سکنے کی مہلت دے اسی طرح کا خیال نہایت مختصر طور پر اقبال نے بھی ظاہر کیا تھا اور برگ سبز کے حوالے سے ہم تک پہنچایا تھا، ملاحظہ کیجئے:

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

مگر ہم غور وفکر کرنے کی طرف مائل تو ہوں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے انہوں نے بھی چہرے کی نظر ونگاہ کو بھی اہل نظر کے ساتھ مختص کر کے پیش کیا ہے۔ صرف دیدہ بینا اور نگاہ بصیرت آموز سے کام لیکر ہی کمی اس مالک حقیقی جو گھٹ گھٹ میں رام کی طرح موجود ہے کا دیدار میسر ہوسکتا ہے جوش کا شعر ہے:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کیلئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

راحت کی حمد پورے طور سے معرفت الٰہی کا سرچشمہ اوران کے اعتراف حق کا ثبوت فراہم کرتی ہے اگر ہم بھی انہیں نگاہوں سے کام لیں تو قرب الٰہی کی توفیق بھی وہ ہمیں غیب سے عطا کردے گا۔ایک موقع پر راحت اندوری نے لال کرشن اڈوانی کو مخاطب کرنے اور للکارتے ہوئے ان چار مصرعوں کو دہرایا تھا،جن کو ہم ان کا محررہ قطعہ کہہ سکتے ہیں لیکن راحت نے خود اسے اپنی غزل کے اشعار کہا ہے۔ ورنہ ان مصرعوں کوایک قطعہ کہہ سکنے میں راقم کے نزدیک چنداں قباحت نہیں ہے، ملاحظہ کیجئے:

اس کونے سے اس کونے تک دعویداری سائیں کی (۱)
آسانی سے ٹھیک نہ ہوگی یہ بیماری سائیں کی
کھیت لہو سے ہم نے سینچا اور فصلوں پر حق اس کا
روزہ رکھنے والے ہم ہیں اور افطاری سائیں کی

حقیقت یہ ہے کہ راحت نے غزل کو اپنایا اور اس پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو مختلف پیرائے بیان یا صنف سخن میں سبھی شعرا بیان کرتے ہیں۔راحت نے معشوقہ غزل کو گلے لگایا اور اسی کے ہوکر رہ گئے پھر اس سے نظر گھما کے ان کو دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور غزل کی تعریف ان کے نزدیک یہ ہے:

''اب غزل زندگی اور حالات سے گفتگو کرنے کا نام ہے اگر زندگی عورت ہے اور حالات بھی عورت کے اردگرد کے ہوں تو بھی غزل کی تعریف میرے نزدیک یہی ہے۔ فارسی کی قدیم تاریخ کو موجودہ غزل پر تھوپنا ناانصافی ہے۔اس دور میں جو غزل لکھی جارہی ہے اور ہندو پاک کے تمام بزرگان نقد ونظر جسے غزل مان رہے ہیں ان میں زیادہ تر شاعری ایسی ہے جس نے عورت کی خوشبو سے بھی گریز کیا

(۱) سائیں سندھیوں کو کہا جاتا ہے۔

ہے۔ میں جو شاعری کرتا ہوں اس سے میں مطمئن ہوں اور میرے سامعین بھی جن کیلئے میں شاعری کرتا ہوں میری غزل یا تو میرے لئے ہوتی ہے یا میرے سامعین کیلئے۔ قارئین (سکہ بند رسالوں والے) سے میرا رشتہ کچھ خاص گہرا نہیں ہو پایا جس کا مجھے افسوس نہیں'' (۱)

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۵۳

باب پنجم

راحت اندوری کی مجموعی علمی
اور ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ
اور قدر و قیمت کا تعین

راحت اپنی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں بھوپال کے مشاعرے میں
سپاسنامہ حاصل کرتے ہوئے، ۸/نومبر ۱۹۹۹ء

جناب ارجن سنگھ وزیر برائے انسانی وسائل وترقیات، راحت اندوری،
عارف عقیل صاحب ایم ایل اے اور مسلم کمیٹی کے صدر جناب خرم صاحب

اتر پردیش کے گورنر جناب وشنو کانت شاستری کے ساتھ

راحت اندوری، محترمہ شیما رضوی، سابق وزیر اور دیگر شعراء

راحت اندروی نے اندور کی اس فضا میں آنکھیں کھولیں، جہاں کلاسیکی غزل کی مقبولیت کی وجہ کسی دوسرے آہنگ سے شاعروں سے گوش آشنا نہ تھے اور نہ نظریں شناسا۔ ایسے ماحول میں راحت تنہا تنہا سے تھے یہ ان کیلئے آسان تھا کہ وہ اپنا مزاج بھی اہل اندور کے مزاج میں ڈھال کر ان کے صف بہ صف کھڑے ہو جاتے۔ انہوں نے اپنے ماحول اور عہد کو بخوبی پرکھا تولا اور خوب اندازہ کر لیا کہ ان کا مزاج اور فطرت انہیں اس سانچے میں ڈھال نہ سکے گی اسلئے کہ ان کے یہاں ایسا بیدار اور شعوری جذبہ موجود تھا جو اندور کی فضا میں اجنبی ضرور تھا لیکن اپنی طرف متوجہ کر سکنے کا ہنر بھی رکھتا تھا۔

راحت نے ابتدا ہی سے اپنے عہد کے تقاضوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور پرکھا اور اپنی خود راہ استوار کر کے اپنے ہم عصروں سے سبقت لے گئے۔ ان کی یہ تیزروی ایک ہدی خواں کی صورت میں ان کی راہ ہموار کرتی رہی اور ان کی آواز وقت کی آواز بن کر اندور کی شعری فضاؤں میں گونج اٹھی اور لوگ اس طرف متوجہ ہونے اور کھنچنے لگے اور جب راحت نے اندور کی فضا میں ایسے اشعار پیش کرنا شروع کئے:

ڈوبے ہوئے جہاز پر کیا تبصرہ کریں
یہ حادثہ تو سوچ کی گہرائی لے گیا

مگر ستاروں کی فصلیں اگا سکا نہ کوئی

مری زمین پر کتنے ہی آسمان رہے

پیڑ سب ننگے فقیروں کی طرح سہمے ہیں

کس سے امید یہ کی جائے کہ سایہ دے دے

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں

یہیں یہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

فرصتیں چاٹ رہی ہیں میری ہستی کا لہو

منتظر ہوں کہ مجھے کوئی بلانے آئے

جھوٹ کے نرک میں نہ ڈال مجھے

لوگ کہتے ہیں میں یدھشٹر ہوں

راحت کے یہ اشعار حقیقت میں لطیف اشارے ہیں جن میں اس عہد کی تصویریں منہ بولتی ہیں اور یہی اس دور کے ایک طبقہ خاص کا کرب بھی ہے یہ اشعار ان کے ابتدائی دور کے ضرور ہیں کہ لفظیات کا نیاپن، اظہار کی انفرادیت اور شدت اور ہم سے اشاروں اشاروں میں ہماری بات کہہ دینے کا ہنر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایسے اشعار سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ راحت نے اپنے منفرد انداز سے اپنے پیغام کے ذریعے اندور کی مقامی فضا کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس شعور و سلیقہ کے پس پشت ان کی گہری نگاہ اور دوررس ذہن تھا، جسے انہوں نے نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھا کر فکر و شعور کی وسعت دینے کی پوری دل جمعی سے کوشش کی۔ راحت کو اس فرسودہ مزاج کے رسیا اور وقت کے تقاضوں کا گہرا احساس تھا اور ساتھ ہی ان کا عزم و حوصلہ جس نے ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں ہونے دی اور اس طرح انہوں نے تشکیک کی راہوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنی منفرد فکری اور شعوری منزل تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ نتیجہ ہے ان کی اس حقیقت کا جسے انہوں نے ایک سچے فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ تر و تازہ اور بار آور رکھا ہے

جسے انہوں نے نجی مشاہدات تجربات ،فکروشعور کی وسعتوں اوراحساس کی روشنی میں شگفتہ دل ودماغ سے پرکھااور دیکھا ہے وہ محض مطالعہ اور کتب بینی پر اکتفانہیں کرتے بلکہ حالات کا بغائر جائزہ لیکران کا اظہار اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ ان کی آواز لاکھوں لوگوں کی دلوں کی دھڑکن بن جاتی ہے۔راحت احتجاج بھی کرتے ہیں تو اس میں محض نعرہ بازی کا حسن نہیں ہوتا بلکہ اس میں ان کے خلوص کی شدت کی کارفرمائی ہوتی ہے اس لئے ان کا لہجہ گھن گرج سے دامن بچائے ہوئے تراشیدہ سنگ کی وہ دیوی بن کرروپ دھار لیتا ہے جو لائق عبادت اور پیروی ہوتی ہے اور جسے حالات زمانہ کی تیشہ زنی زک نہیں پہنچاسکتی بلکہ ان کا احتجاج لہجہ حالات کے اندھیروں سے نکال کرروشنی دکھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے ویسے تو شاعری میں ناگواریوں کے خلاف احتجاج کرنے کی روایت بہت قدیم ہے اور اس احتجاج میں صرف وہی شعراء کامیاب ہوسکے جن کے طریقہ احتجاج میں جذبات کی شدت کے بجائے شدت فکر شامل ہواور جو اپنے احتجاج کووقتی ابال کی مانند نہ بہا کراس میں استقلال اورٹھہراؤ لانے کا ہنر رکھتے ہوں اور جب سے اپنی فکری جہتوں کے یقین میں بھول چوک یا بےاعتدالی نہ ہو۔ چند اشعار دیکھتے ہیں،جن میں راحت نے الفاظ کی ندرت اور شائستگی اور خلوص کے ساتھ آواز احتجاج بلند کی ہے:

معصوم پتیوں کا لہو پی کے سرخ ہے
یہ پھول اب چمن میں کوئی گل کھلائے گا

جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
ان چراغوں کو بجھادوتو اجالے ہوں گے

پچھلے دنوں کی آندھی میں گنبد تو گر چکا
اللہ جانے سارے کبوتر کہاں گئے

کھڑکیاں بند نہ ہوتیں تو جھلس ہی جاتا
آگ [illegible] ہوا سورج مرے گھر آیا تھا

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں
ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے
گر ہوا کے رخ کا اندازہ لگانا ہے تجھے
ریت پر کاغذ کی اک کشتی بنا کر چھوڑ دے

ان اشعار کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راحت کا احتجاجی رویہ محض جذبات کا کھوکھلا اظہار نہیں ہے کیونکہ انہوں نے حالات کی بے ترتیبی اور ناہمواری سے ابھرنے والے حالات پر جس سلیقہ سے ضرب لگا کر اور اس طرف متوجہ کیا ہے یہ انہیں کا حوصلہ ہے۔ ان اشعار میں نہ سپاہی کی کڑک ہے اور نہ مولوی کا خطیبانہ انداز بلکہ لطافت کے ساتھ انہوں نے اشاروں اشاروں میں ہم کو ہمارے حالات کا آئینہ دکھایا ہے اور ان کی لہجے میں ترشی اور تندی کی جگہ شیرینی اور دلکشی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی۔ راحت کا یہ لہجہ وقت کی سچائیوں کے ساتھ ساتھ زیادہ شگفتہ اور دلپذیر ہوتا گیا مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے ہیں جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بیچارے ہوا دیتے تھے
قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن کی خوشبو
خار صحرا کہیں بھولے سے مہک مت جانا
ان سے پہلے کے جو قاتل بہت اچھے تھے
قتل سے پہلے وہ پانی تو پلا دیتے تھے
پیاس اب کیسے بجھے گی ہم نے خود ہی بھول سے
میکدے کم ظرف لوگوں کے حوالے کر دئے

مندرجہ بالا اشعار میں راحت نے اپنے احتجاج کو استعاراتی انداز اور دلکش لب و لہجہ میں بلند کیا ہے جسے ہم ان کے فنی شعور کی تازگی اور بالیدگی کا نام دے سکتے ہیں۔ راحت طنز کی تمام خوبیوں

اور ان کی زود اثری سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں ان کو اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہے کہ طنز میں ذرا سی لغزش اس کی عظمت کو مٹا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ بڑی احتیاط سے اپنی خداداد فکری تازگی سے اپنا کلام پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں جہاں بھی ایسے رنگ کی آمیزش ہوتی ہے وہ دلکش اور زود اثر ہو جاتا ہے۔ راحت کی طنزیہ ضربیں ان مسائل اور حالات پر زبردست پڑتی ہیں، جن پر قدما پہلے بے باک اظہار خیال کر چکے ہیں راحت نے بھی اسی طنز کو اپنے یہاں جگہ دی ہے مگر نہایت شگفتہ اور پسندیدہ اسلوب و انداز میں:

دلوں میں آگ لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
سب اپنے چہروں پر دوہری نقاب رکھتے ہیں

کہیں شریف نمازی کہیں فریبی پیر
قبیلہ میرا نسب میرا سلسلہ میرا

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

اپنی سانسیں بیچ کر میں نے جسے آباد کی
وہ گلی جنت تو اب بھی ہے مگر شداد کی

ٹوٹ کر بکھری ہوئی تلوار کے ٹکڑے سمیٹ
اور اپنے ہار جانے کا سبب معلوم کر

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

سب نے مل رکھا ہے چہروں پر تعصب کا غبار
آئینہ ہم بن بھی جائیں تو سنورتا کون ہے

داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی

یہی عقیق تھے شاہوں کے تاج کی زینت
جو انگلیوں میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

عدالتیں نہ سہی جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں میرا حل ضرور نکلے گا

نمازیوں کے تقدس پہ طنز کرتا تھا
وہ بدمعاش کئی دن سے اعتکاف میں ہے

میں ہر بتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہوگئے

شاعری آوارگی خوشبو وفا لذت شراب
مختلف شکلوں میں شہزادے کو عورت چاہئے

گھروں کی راکھ پھر دیکھیں پہلے دیکھنا یہ ہے
گھروں کو پھونک دینے کا اشارہ کون کرتا ہے

گاؤں کی بیٹی کی عزت تو بچالوں لیکن
مجھے مکھیا نہ کہیں گاؤں کے باہر کردے

گزشتہ سال کے زخم ہرے بھرے رکھنا
جلوس اب کے برس بھی یہیں سے نکلے گا

مسجد خالی خالی ہے ● بستی میں قوالی ہے

وہ پانچ وقت نظر آتا ہے نمازوں میں
مگر سنا ہے کہ شب میں جوا چلاتا ہے

راحت کی طنز ہواؤں میں گرہ نہیں لگاتی بلکہ ہمارے بیچ کی سچائیاں ایک خوبصورت پیرائے اظہار میں ڈھل کر ایسی مہ ورآتشہ بن جاتی ہے کہ تلخ ہو کر بھی ہمیں بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور وہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر سرشاری کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ راحت کے یہی بلیغ اشارات ان کے ضمیر کی یہ تڑپ آج کے سماجی مسائل کے حل کی شکل میں ناگزیر ہے۔ وہ کام جو مصلحان ملک وقوم، رہنمایان ملت کیلئے بعض وجوہ کی بنا پر مشکل نظر آتا ہے راحت نے احتجاجی لہجہ اور طنزیہ اسلوب میں اسے آسان بنا دیا اور بنا رہے ہیں راحت کا یہی وہ وصف ہے جس کی طرف ندا فاضلی یوں اشارہ کرتے ہیں:

''سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں انسان کے خارجی باطنی کشمکش کے عینی گواہ بھی ہیں ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو غزل کے اشاروں اور کنایوں میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعی مزاج طنزیہ اور باغیانہ ہے جو بیک وقت حالات کا شعری تبصرہ بھی ہے اور اس کا شخصی تجزیہ بھی۔ ان کی شعری زبان بھی ان کے افکار کی طرح ذہنی مسائل کی آئینہ دار ہے۔ مستعمل لفظیات سے گریز اور اظہار کے رائج معماتی پیرایوں سے پرہیز نے ان کی تخلیقی جسارتوں کا دائرہ بنایا ہے۔ نجی مشاہدے اور تجربے پر ان کا یہی اعتماد ان کی شعری ذہانت بھی ہے اور ان کی فنکارانہ دیانت بھی۔''(۱)

اس میں شبہ نہیں کہ آج ہم بھوک اور افلاس کے جس ناگفتہ بہ دور سے گزر رہے ہیں راحت اندوری جیسے دیدہ ور اور حساس شاعر کی زبان پر یہ شعر آ جانا ناگریز سا ہو جاتا ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

راحت کے کلام میں بلا کی برجستگی معنی آفرینی اور دور حاضر کا عکس ہے۔ بدامنی اور ناانصافی کی جو ہوا آج کل چل رہی ہے قدم قدم پر خونچکاں اور لہولہان مناظر کا سامنا ہے اس سے راحت جیسے بیدار انسان کے احساسات لطیف کو اور اس کے کردار کو جو ٹھیس پہنچتی ہے وہ اشعار

(۱) پانچواں درویش۔ راحت اندوری اور لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۸۲

کا پیکر بن کر راحت کی زبان پر آجاتی ہے۔

راحت اندوری نے لفظیات کے استعمال میں بھی بڑی جرأت مندی سے کام لیا ہے اس سلسلے میں بھی ان کا شعور اختراعی نظر آتا ہے، بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔

''ان کے یہاں بے جان اور گونگے الفاظ بھی بول پڑتے ہیں۔''(۱)

اسی طرح لفظوں کے امتزاج نادر تشبیہات اور جدید ترین استعارات کے استعمال سے بھی وہ بیان کا نہایت دلکش پہلو نکال لینے کا ہنر رکھتے ہیں، مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ اکیلا تھا نہتا تھا جو بازی لے گیا
اور ہم اپنے جواں فرزند گنتے رہ گئے

شکست کھاہی گیا میرا حاکمانہ مزاج
کسے خبر تھی کہ وہ میرے خواب مانگے گا

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک لفظ کو صدا بھی مان

سو رہی تھی اجلے کپڑے پہنے کالی آتما
کم سمجھ لوگوں نے ذرے کو ستارہ پڑھ لیا

اپنی کاغذ کی حویلی بھیگنے سے رہ گئی
عقلمندی کی کہ موسم کا اشارہ پڑھ لیا

ہیں خوشبوؤں کے تعاقب میں رینگتے کچھوے
مگر وہ مشک ابھی تک ہرن کی ناف میں ہے

---

(۱) پانچواں درویش۔ راحت اندوری اور لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۳۸۰

پھول جیسے مخملی تلوؤں میں چھالے کردئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کردئے

اب اور تاش کے پتوں کی سیڑھیوں پہ نہ چڑھ
کہ اس کے آگے خدا کا عذاب ہے بیٹا

راحت اندوری کی فنی عظمت اور اس کی بلندیاں ان کی بعض غزلوں کی ردیف میں نظر آتی ہیں۔ردیف کی بنا پر شعر خود بول اٹھے یہ مشکل ہنر ہے، بہتوں کے یہاں ان کی فکری بلندیوں کا اظہار اسی سلیقہ انتخاب ردیف کی بنا پر ہے بعض اوقات طول طویل ردیف بھی غزلوں کو چمکا دیتی ہے۔ جیسے مومن خاں مومن ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''

اسی سلیقہ سے راحت اندوری نے بھی اپنی بیشتر غزلوں کو ردیفوں کے ذریعے یوں بالیدگی عطا کی ہے ملاحظہ کیجئے:

تمہارے نام پر میں نے ہر آفت سر پر رکھی تھی
نظر شعلوں پہ رکھی تھی زباں پتھر پہ رکھی تھی

تو تو اپنے مشوروں کے زخم دے کر چھوڑ دے
مجھ کو زندہ کس طرح رہنا ہے مجھ پر چھوڑ دے

تمہیں کہو کہ ٹھکانہ مرا کہاں میاں
زمیں سے بھاگ بھی جاؤں تو آسماں ہے میاں

میں جب چلوں تو یہ دولت بھی ساتھ رکھ دینا
مرے بزرگ مرے سر پہ ہاتھ رکھ دینا

ہنستے رہتے ہیں مسلسل ہم تم
ہو نہ جائیں کہیں پاگل ہم تم

سمندروں میں موافق ہوا چلاتا ہے
جہاز خود نہیں چلتے خدا چلاتا ہے

کوئی موسم ہو دکھ سکھ میں گزارا کون کرتا ہے
پرندوں کی طرح سب کچھ گوارا کون کرتا ہے

قطرہ قطرہ خوب اچھالیں گنگا جی
ہم پیاسوں پر ہاتھ نہ ڈالیں گنگا جی

چراغ ڈستی ہوئی آندھیاں بھی آئیں گی
اگر سفر ہے دشوار تو دشواریاں بھی آئیں گی

راحت کی غزلوں میں بعض اچھوتی اور نادر تشبیہات کی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں قدیم تلمیحات اور تشبیہات کے پردے میں راحت نے اپنے عہد کے مسائل اور حالات کا عکس بھی دکھایا ہے، جیسے:

آنکھ پیاسی ہے کوئی منظر دے
اس جزیرے کو بھی سمندر دے

اپنی سانسیں بیچ کر میں نے جسے آباد کی
وہ گلی جنت تو اب بھی ہے مگر شداد کی

ہم نے دوسو سال سے طوطے گھر میں پال رکھے ہیں
میر تقی کے شعر سنانا کوئی بڑی فنکاری ہے

گرجا میں اک موم کی مریم رکھی تھی
ماں کی گود میں گزرا بچپن یاد آیا

جھوٹ کو اپنے مرے سچ کے برابر کردے

سامری تو ہے تو آجا مجھے پتھر کردے

میں سب کو رام سمجھ لوں تو یہ بھی ٹھیک نہیں

یہاں ہر ایک کے کاندھے پہ ایک کماں ہے میاں

کسی آہو کیلئے دور تلک مت جانا

شاہزادے کہیں جنگل میں بھٹک مت جانا

یہاں لچھمن کی ریکھا ہے نہ سیتا ہے مگر پھر بھی

بہت پھیرے ہمارے گھر کے اک سادھو لگاتا ہے

یوں صدا دیتے ہوئے ترے خیال آتے ہیں

جیسے کعبہ کی کھلی چھت پہ بلال آتے ہیں

شہ کا نوکر نہ کہے شہ کر مصاحب سمجھے

اس کی خواہش ہے کہ دنیا مجھے غالب سمجھے

کسی کنیز کی قسمت چمک بھی سکتی ہے

سویرے صاحب عالم کی واپسی ہوگی

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا

میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

روٹی کی سختیوں نے ہمیں سخت کردیا

سنتے ہیں اب بھی ڈھاکے کی ململ نہیں ہے

حرم میں خاص مصاحب بھی جا نہیں سکتے

وہاں حرم کی کنیزیں ہیں شاہزادہ ہے

بزرگ مٹی کی عظمت کے اعتراف میں ہے
یہ مقبرہ ہے مگر ریشمی غلاف میں ہے

راحت نے غزل کی ایک قدیم روایت یعنی تذکرہ حسن وعشق کو بھی بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے یعنی ذہنی بے باکی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ ان معنوں کو دہرایا ہے۔ راحت معشوقانہ تصورات کو کم دوستانہ فضا کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لئے تذکرہ حسن کرتے وقت وہ محض خیالی تصورات میں گم نہیں ہوتے بلکہ ارضی حقائق کے پیش نظر وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی انفرادی سوچ وفکر کا کرشمہ ہے کہ اس کے باوجود یہ بھی حسن برقرار رہتا ہے کہ ان کی گفتگو محض برائے گفتگو ہے اسی لئے جب وہ اپنے دوست کے بارے میں لب کشا ہوتے ہیں تو حسن کی تمام عظیم ترین روایات ان کے روبرو ہوتی ہیں اور کہیں بھی ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ وہ تعریف کرتے کرتے تصنع اور بناوٹ کی بے کیف وادیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ ان کا تخیل براہ راست ان منازل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جن میں ارضی حقائق بہ تمام وکمال موجود ہوں اور تب وہ ان سچائیوں کو صاف سادہ اور سچے انداز میں جب بیان کرتے ہیں تو ان کا تصور جگمگا جاتا ہے، یہی وہ عزم ہے جو راحت کو دوستوں کی قصیدہ خوانی (تعریف بیجا) پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ راحت کا تصور حسن، حسن ذاتی کے حصار سے باہر نہیں قدم رکھتا وہ قبائے گل میں گل بوٹے تلاش کرنے کے قائل نہیں بلکہ فطری لب ولہجہ میں حسن ذاتی کے بیان میں ان کی زبان تصنع اور بناوٹ کے بیانات سے آلودہ نہیں ہوتی، مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

جی چاہتا ہے بس اسے پڑھتے ہی جایئے
چہرہ یا ورق ہے خدا کی کتاب کا

دیکھ کر تجھ کو کوئی منظر نہ دیکھا عمر بھر
اک اجالے نے میری آنکھوں میں جالے کر دئے

پھول ہی پھول پاؤں سے سر تک
نا م اس کا بہار ہونا تھا

جھیل اچھا ہے کنول اچھا ہے یا جام اچھا ہے
تری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے

اک کلی مسکرا کے پھول ہوئی
یہ قصیدہ بھی تیری شان میں تھا

مدتوں سے تلاش کرتا ہوں
اک غزل تیرے بانکپن جیسی

میرے آنگن میں آ کے ٹھہری تھی
چاندنی تیرے ہی بدن جیسی

کل ترا ذکر چھڑ گیا گھر میں
اور گھر دیر تک مہکتا رہا

کچھ کم نہیں ہیں تیرے محلے کی لڑکیاں
آواز دے رہی ہیں مجھے تیرے نام سے

چھوڑیئے بھی دکھوں سکھوں کا حساب
آپ ملتے ہیں یہ غنیمت ہے

پنگھٹوں کے سارے منظر اب ڈسیلے ہو گئے
گاؤں کی کچھ لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

وہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اسے چھو بھی سکیں
ہاں اگر نام ہی رکھنا ہے تو خوشبو رکھ دے

اللہ

الدلد

سورج کے نکلنے سے تاروں کے بکھرنے تک
موجوں کے تھپیڑوں سے طوفاں کے ٹھہرنے تک
غنچوں کے مہکنے سے کلیوں کے چٹکنے تک
کیا تو نے نہیں دیکھا پیکر بھی تو اس کا ہے

پانچ بندوں کی اس نظم میں اسی طرح کے سوال ابھار کر راحت نے وجود خالق کائنات کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری مسلسل غزل میں عظمت وحدت الوجود کے ذکر کیلئے اپنے کوکم تر بتاتے ہوئے اپنی عاجزی ظاہر کی ہے، ملاحظہ کیجئے خاص کر یہ اشعار:

جو کتابوں نے لکھا اس سے جدا لکھنا تھا
لکھ کے شرمندہ ہوں تجھ کو سوا لکھنا تھا
چاند لکھا کبھی سورج کبھی موسم لکھا
بات اتنی تھی مجھے نام ترا لکھنا تھا
پانیوں اور زمینوں کو قدم لکھا ہے
آسمانوں کو مجھے تیری قبا لکھنا تھا
تیرے اوصاف رقم ہوں یہ کہاں میری بساط
صرف اک رسم ادا کرنی تھی کیا لکھنا تھا
میں نے کاغذ پہ صدا دل کی بکھر جانے دی
مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا لکھنا تھا

اس کے علاوہ بھی انہوں نے عشق حقیقی کی طہارت کو اور بھی زیادہ پاکیزہ جذبات و تصورات کا اظہار کیا ہے۔ وہ تقرب خداوندی کیلئے براہ راست وسیلہ عجز ودعا واستغفار کو ہی صحیح اور مناسب ٹھہراتے ہیں۔

مسجد میں ہوں گی کلیسا نہ شوالے ہوں گے

اتنا نزدیک ترے چاہنے والے ہوں گے

راحت جستجوئے حق کیلئے اس کے مظاہر کو دیکھنے کی دعوت دیتے۔ انداز نہایت سادہ سبک ہوتے ہوئے بھی بحر معنی کی بیکرانی اس میں موجود ہے۔

سایہ سایہ ڈھونڈھ اسے

جس نے دھوپ نکالی ہے

راحت کو سرشاری عشق کا احساس ہے اور اس عشق میں ڈوب جانے والوں کو بلند مرتبہ والا اور عظمتوں کا حامل سمجھتے ہیں۔

ستارو آؤ میری راہ میں بکھر جاؤ

یہ میرا حکم ہے حالانکہ کچھ نہیں ہوں میں

اس عشق حقیقی کے تعلق سے ان کی پیش کردہ تلمیحات کا حسن دیکھئے:

ہونٹوں پہ اپنی پیاس کا دوزخ کھنگال لے

یا ایڑیاں رگڑ کوئی چشمہ نکال لے

یوں صدا دیتے ہوئے تیرے خیال آتے ہیں

جیسے کعبہ کی کھلی چھت پہ بلال آتے ہیں

راحت کو اپنے جذبہ عشق خداوندی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جلوہ حق سے ایک نہ ایک دن اپنی آنکھوں کو منور کرلیں گے۔

ہزار پردے میں خود کو چھپا کے بیٹھ مگر

تجھے کبھی نہ کبھی بے نقاب کردوں گا

اور اسی کے ساتھ خدائے قدوس کے تصور کو اس جذبہ فکر و نظر سے پیش کرتے ہیں:

کچھ لکیریں سی ہواؤں میں بنا دیں اس نے
میں نے پوچھا تھا کہ تصویر خدا کیسی ہے

راحت اندوری کا کلام فکری بالیدگیوں سے پوری طرح مزین ومرصع ہے اور ساتھ میں حقیقت پسندانہ رویوں کا عکاس بھی ان کو اپنے گرد وپیش کے حالات کا بخوبی علم وادراک ہے جس کا اظہار وہ بڑی بے باکی سے نڈر ہو کر کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں ان کے مجموعے کلام دھوپ دھوپ، پانچواں درویش اور میرے بعد (دیوناگری میں) بڑی وافر تعداد میں نظر آتی ہیں، ملاحظہ کیجئے:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

آج سڑکوں پہ تصاویر بناتے رہئے
انگلیاں ٹوٹ چکیں جب یہ ہنر آیا تھا

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں
ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے

میں اپنا عزم لے کر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پر رکھی تھی قسمت گھر پہ رکھی تھی

پردیس جا رہے ہو تو سب دیکھتے چلو
ممکن ہے واپس آؤ تو یہ گھر نہیں ملے

جن زمینوں کے قبالے ہیں مرے پرکھوں کے نام
ان زمینوں پر مرے جینے کے لالے پڑ گئے

سانسوں کی سیڑھیوں سے اتر آئی زندگی
بجھتے ہوئے دیے کی طرح جل رہے ہیں ہم

راحت نے حرمت غزل کے تحفظ کیلئے اپنا سب کچھ خون کے آنسوؤں کی شکل میں نچھاور کر دیا ہے اور فارسی زدگی سے محفوظ اردو کے سبک لفظ و معنیٰ کی امانت سنبھالتے ہوئے پتھروں کو بھی پانی کر دیا ہے۔ نیز جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو غزل کا نام دے کر رات بھر کی کروٹوں کا ذائقہ منظوم کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی راحت کے کلام کے حوالے سے اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

''جب (راحت اندوری نمبر) راحت اندوری شخص اور شاعر کے باب یکے بعد دیگرے وا ہوتے ہیں اور صفحہ صفحہ شعر در شعر، مصرعہ در مصرعہ سطر در سطر، فقرہ در فقرہ، لفظ اور ان کی تصانیف سے گزرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو منزل گام بہ گام، لمحہ بہ لمحہ ایک جہان حیرت واستعجاب کا سامنا ہوتا ہے۔ راحت اندوری کے تعلق سے قائم کردہ اپنے پچاس سالہ نظریاتی قلعوں کو یکے بعد دیگرے انہدام پذیر ہوتے محسوس کرتا ہوں۔ جب راحت کے گلستان شعر سے روش در روش گزرتا ہوں تو ہر شعر کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہوں۔'' (۱)

راحت بلند فکر کی خواہش اور پرواز تخیل کی بیکرانی کے باوجود ان کی غزل اپنے گرد و پیش کے روزمرہ کے معاملات اور معمولات سے وابستہ زمینی مسائل سے انہیں جوڑے رکھتی ہے۔

میں چاہتا تھا غزل آسمان ہوجائے
مگر زمین سے چپکا ہے قافیہ میرا

زمین سے وابستگی اور زمینی مسائل سے پیوستگی کے باوجود انہیں زمینی غزل کی بے حرمتی گوارہ نہیں ہے اور انہیں مستی اور بازاری شاعری اور عوامی انداز سے گھن آتی ہے، یہ اشعار دیکھئے:

میں جاہلوں میں کچھ لہجہ بدل نہیں سکتا
مری اثاث یہی شین قاف ہے جانی

(۱) راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک، ڈاکٹر محبوب راہی، امکان لکھنؤ ماہنامہ نومبر دسمبر ۲۰۱۰، ص ۸۳

لے تو آئے شاعری بازار میں راحت میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

راحت اندوری کی شاعری کی مقبولیت کے کچھ پہلو یہ بھی ہیں کہ ان کے اشعار کے بارے میں روزنامہ آئینہ عالم مراد آباد نے اپنے چند اداریے تحریر کئے مثال کے طور پر ان کے اس شعر کے حوالے سے:

سمندر پار ہوتی جا رہی ہے
دعا پتوار ہوتی جا رہی ہے

اس شعر کو پیش نظر رکھ کر ۲۱ر جون ۱۹۹۳ء کے شمارے میں محررہ اداریہ کا عنوان تھا ''جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' جس میں نرسمہا راؤ کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی تھی، جو انہوں نے بابری مسجد کے انہدام، سورت کے قتل عام، مہاراشٹر اور گجرات کے فسادات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی۔

اسی اخبار نے ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں راحت اندوری کے مشہور شعر:

تری دستار پہ تنقید کی ہمت تو نہیں
اپنی پاپوش کو قالین کہا ہے میں نے

کے حوالے سے بعنوان ''لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل'' کے تحت اپنے اداریہ میں وی پی سنگھ، چندر شیکھر اور اجیت سنگھ کی تثلیث کو امام بخاری کی انتخابی حمایت و تائید کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔

اسی طرف راحت اندوری کے شعر اشارہ کرتے ہیں:

تم اپنے بوڑھے درختوں پہ خوب اترائے
اور اس کو بھول گئے جو ہوا چلاتا ہے

اسی اخبار کے شمارہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۳ء میں اپنے اداریے بعنوان ''راؤ کے زہریلے سانپ''
نرسمہا راؤ اور ان کے ہمنوا ایک وزیر کے غیر ذمہ دارانہ رویہ پر احتجاج کیا گیا ہے۔

اسی اخبار کے شمارہ مطابق ۲۹ر ستمبر ۱۹۹۳ء کے ایک اداریہ: مولا فقیر کے تحت راحت اندوری کے اس مصرعہ کو پیش کیا تھا۔

ع۔ جاہل ڈھور گنوار سب ہیں قوم کے سردار   اللہ بادشاہ

اور اس کی مناسبت سے انتخاب کیلئے امیدواروں کے نام کے اعلان پر امیدواروں کی نااہلی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ راحت اندوری کی ہمت جہت عالمی مقبولیت ان کی شعری عظمتوں سے متاثر ہو کر ایس ایم حسن نے راحت کی غزلوں پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد ان کی چند غزلوں کے مختلف اشعار کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، چند نمونے ملاحظہ کیجئے:

راحت کا شعر:

اپنا چہرہ تلاش کرتا ہے
گر نہیں آئینہ تو پتھر ہے

ترجمہ دیکھئے:

I have lost my face O sweet heart.

I am searching it in vain,

O let me have a mirror to reflect,

Or other wise let it be lynched to death.

راحت کا شعر دیکھئے:

مجھے زمین کی گہرائیوں نے داب لیا
میں چاہتا تھا مرے سر پہ آسمان رہے

ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

Yeeh, the earth has buried me deep,

Deep among dead and forgotten,

Fair did I have the aspiration,

To enjoy sky flights over here.

راحت کا شعر:

میں بہت جلد ہی گھر لوٹ کے آجاؤں گا
میری تنہائی یہاں کچھ دنوں پہرہ دیدے

ترجمہ دیکھئے:

Rest arsured O dear,

My return would not be long,

Till then O my solitude,

Guard the precints ofmy home.

راحت کا شعر دیکھئے:

آپ اس شخص سے واقف تو ہیں کم واقف ہیں
وہ مسیحا ہے مگر زخم لگانے والا

ترجمہ دیکھئے:

You may know the man but,

Yoy know him not full well,

He is massiah but you know,

He heals with cuts and wounds.

راحت اندوری نے اپنا شعری سفر جس اعتماد اور ذہنی بیداری سے شروع کیا تھا آج ان کے یہ رویے اس منزل تک پہنچ چکے ہیں، کہ انہیں ہماری موجودہ شاعری کے تروتازہ کارآمد اور زندہ حقائق کو پیش کرنے کا مکمل شعور حاصل ہو گیا ہے۔ شاعر جمالی اپنے ایک مکتوب بنام راحت اندوری میں ان کی شعری استعداد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میرے تجزیے کے مطابق تمہاری شاعری کے تین دور ہیں ایک وہ جب تم ایک جھنجھلاتے ہوئے عاشق تھے پھر جب احتجاج کو اپنا پرچم بنایا اور پھر آج جب تم نے اس وادی میں قدم رکھا جہاں پائندگی تابندگی اور آئے والی نسل کیلئے ادبی زندگی کے واضح نشانات نظر آنے لگے۔''(۱)

یا پھر بقول طارق سبزواری:

''راحت کی شاعری میں جدت طرازی اور ترسیل و ابلاغ کے پیش نظر اثرات یا شعوری تجربے تو نہیں بلکہ وہ فکری شعر کاری اور ذہنی شاخ تراشی کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے معاشرے کے تمام ناسوروں کو اپنی شاعری کے پیراہن میں ڈھانپنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی ان کے فن کی معراج ہے۔''

اپنے شعری رویوں کے لحاظ سے خود راحت اندوری کا یہ احساس بہت اہمیت رکھتا ہے ملاحظہ کیجئے:

''مسلسل سفر میں ہوں پیروں میں لغزش اور دل میں خوف پہاڑوں کی طرح راستہ روکے ہوئے الفاظ و معنی لیکن مجھے چلتے رہنا ہے بیساکھیوں کے بغیر راستہ بھی تو خود میں نے چنا ہے، ہتھیلی پر بکھری ہوئی لکیروں کی طرح الجھا ہوا راستہ، میری رفتار سے کچھ لوگ چیں بہ جبیں ہوا کریں میں تو مطمئن ہوں اپنی لہولہان زندگی سے۔''(۲)

---

(۱) مکتوب شاعر جمالی بنام راحت اندوری

(۲) مجموعہ کلام دھوپ دھوپ راحت اندوری ص ۷

ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنے ایک مضمون میں راحت کی شعری عظمتوں کو سراہتے ہوئے بڑی وقیع بات کہی ہے، ملاحظہ کیجئے:

''راحت اندوری کو محض مشاعروں کے شاعر کی تہمت لگا کر ناٹ باہر نہیں رکھا جا سکتا کہ انہوں نے ادب پڑھا ہی نہیں پڑھایا بھی ہے۔ وہ بڑبولے پن کے خمار میں ''وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے'' کہہ کر تالیاں نہیں پٹواتے میر و غالب جیسے یگانہ روزگار سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی فنی جہتوں میں نو بہ نو وسعتوں اور اضافوں کے امکانات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، مثال کیلئے راحت کے اشعار دیکھئے:

ساری دنیا حیرتی ہے کس لئے
دور تک منظر بہ منظر کون ہے

یارو معاف میر کا میں معتقد نہیں
ایسی بھی کیا غزل کہ کلیجہ نکال لے

اور مرا دل وہی مفلس کا چراغ
چاند تیرا ہے ستارے تیرے

بجھ گئے چاند سب حویلی کے
جل رہا ہے چراغ مفلس کا

میر جیسا تھا دو صدی پہلے
حال اب بھی وہی ہے مجلس کا

ہم نے دو سو سال سے طوطے گھر میں پال رکھے ہیں
میر تقی کے شعر سنانا کون بڑی فنکاری

غالب تمہارے واسطے اب کچھ نہیں رہا
گلیوں کے سارے سنگ تو سودائی لے گئے

غالبوں کو رکھو دماغوں میں
دل یگانہ مثال رکھا کرو

غالب بھی ہے بچپن بھی ہے شہروں میں
مجنوں بھی ہے لیکن پتھر غائب ہیں

کون وہ مرزا اسداللہ خان
مجھ سے وہ تنہائی میں اکثر ملا

یہ تو میر و غالب یگانہ وغیرہ کی ادبی روایت سے وابستگی یا استفادہ کا نام بہ نام راست اظہار ہوا۔ راحت نے اپنی شاعری میں جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت تجربات کی کثرت فکر ونظر کی بلوغت اور نتائج اخذ کرنے میں ان کی ذہانت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ عالم بالخصوص تاریخ اسلام کے مدوجزر عروج وزوال اور فتح وشکست کے تمام مناظر گویا ان کی نظروں کے سامنے تیرتے رہتے ہیں، جنہیں حسب موقع ومحل وہ اپنے اشعار میں منعکس کرتے رہتے ہیں محض ایک مصور اور کیمرہ مین کی طرح نہیں بلکہ ان میں ان کی شدت احساس کے لہو ریز رنگوں کی بھی شمولیت ان کی تاثر انگیزی کو دوبالا کر دیتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری پڑ گئے
باپ حاکم تھا مگر بیٹے بھکاری ہو گئے

چلو دیوان خاص اب کام آیا
پرندوں کا ٹھکانہ ہو چکا ہے

حاشیے پر کھڑے ہوئے ہیں ہم

ہم نے خود حاشیے بنائے تھے

میری گم گشتگی پر ہنسنے والو

میرے پیچھے زمانہ چل رہا ہے

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں

یہیں یہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

کوئی وارث ہو تو آئے اور آ کر دیکھ لے

ظل سبحانی کی اونچی چھت میں جالے پڑ گئے

انہیں سانسوں کے چکر نے ہمیں وہ دن دکھائے تھے

ہمارے پاؤں کی مٹی ہمارے سر پہ رکھی تھی

وہ آج چلے گئے پائینچے اٹھائے ہوئے

کبھی چڑھا ہوا دریا اتارنے والے

کہاں وہ خواب محل راجداریوں والے

کہاں یہ بیلچے والے تگاڑیوں والے

مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں

مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے

ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر

مگر ہمارا مقدر خراب ہے بیٹا

یہ الگ بات کہ پستی میں پڑے ہیں ورنہ

چاند تاروں کی تو ہم راہ گزر جانتے ہیں

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

ہمارے جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیضیں لوگ ہماری پہن کے آئے ہیں

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہیں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائیں دیں گے

اسلامی تاریخ کے عروج وزوال اور ملت اسلامیہ کے حالات کی اتھل پتھل کے علاوہ راحت کی شاعری کا ایک اہم موضوع سیاست بالخصوص ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کی لعنتوں پر نشتر زنی بلکہ شمشیرزنی کی ہے، ملاحظہ کیجئے:

ورنہ اوقات کیا تھی سایوں کی
دھوپ نے حوصلے بڑھائے تھے

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

سڑک پر دوریاں ہی دوریاں ہیں
کہ آمد پھر کسی تہوار کی ہے

یہ سارے لوگ تو شامل تھے لوٹنے میں مجھے
سنا ہے اب میری امداد کرنا چاہتے ہیں

مرے سچ سے انہیں کیا لینا ہے میں جانتا ہوں
ہاتھ قرآن پہ رکھو کہ وہ کیا پوچھیں گے
یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے
بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچو
یاتراؤں سے کچھ نہیں ہوگا(۱)

راحت اندوری کی کثیر الجہات شاعری کو کسی ایک خانے میں رکھ کر پرکھا نہیں جاسکتا ان کی شاعری بیک وقت تاریخ، سماجیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، مدحیات وغیرہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے ان تمام اجزائے ترکیبی کے متوازن امتزاج سے ایک بالکل نیا لب وہ لہجہ اور اچھوتا رنگ و آہنگ ایجاد کیا ہے، جس پر میر، غالب، یگانہ اور شاد کی انانیت پسندی آتش کے سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ اقبال کی مقصدیت آمیز داخلی اور مسائل حیات و کائنات کے اشتراک باہمی سے رچے بسے بے تکلف اور واشگاف انداز اور اپنے ہم عصروں میں مظفر حنفی کے طنز سے مملو منفرد لب ولہجہ کی چمک دمک دکھائی دیتی ہے۔ راحت نے اپنا ایک ایسا لہجہ وآہنگ اختیار کیا ہے جوان کا اپنا لہجہ اور آہنگ ہے، جس کا تلخ کھٹا میٹھا ذائقہ ان کو اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ تھلگ ایک منفرد پہچان عطا کرتا ہے۔ راحت نے اپنے دامن فکر ہر ہنگامہ، تحریک وقتی رجحان یا گروہی نظریہ سے محفوظ و مامون رکھتے ہوئے اپنے گردوپیش اپنے روزمرہ کے معاملات ومعمولات پر مبنی مسائل کی ترجمانی کے وسیلے سے اپنی تخلیقی وجود کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے راحت اندوری کی مجموعی تخلیقی شناخت پر ارباب نقد ونظر کی موقر ومعتبر آرا اپنے ایک مضمون میں بہت ہی مفصل طور پر پیش کی ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''مظفر حنفی نے راحت کو فراق کے بعد اسٹیج پر شعر کی تصویر بن جانے والے دوسرے شاعر سے

(۱) راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک ڈاکٹر محبوب راہی ماہنامہ امکان لکھنؤ نومبر دسمبر ۲۰۱۰، ص ۲۹

موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس ان کی شاعری کو نئی کمان کا تیر سے مشابہ قرار دیتے ہیں جو جدید میزائلوں کی طرح اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ وسیم بریلوی نے انہیں میزائلی لہجے اور تیزابی تیور کا فنکار کہا ہے، جو اپنی شعلہ بیانی سے طمطراق اقتدار کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت رکھتا ہے۔ اختر نظمی انہیں تلخ اور درشت لہجے سے خود اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے والا بتاتے ہیں، جبکہ نظام صدیقی انہیں نئے عہد کی غزلیہ تخلیقیت کے آبنوسی گلاب سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے راحت کو غزل کا جیون ساتھی قرار دیا ہے جبکہ اسعد بدایونی کو ان کے بنیادی مزاج میں عصری صداقتوں اور سفاکیوں کی بیباکانہ اظہار کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اندوری راحت کی شاعری میں عصبیت کے خلاف اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر للکارتے لہجے کو تلوار کی کاٹ بنا کر لفظوں کی تیزی دماغوں کو جھنجھوڑ دینے، مردہ طبیعتوں کی افسردگی دور کرنے، شعلہ بیانی بلند آہنگی، احتجاجی روش اور برہنہ گفتاری جیسے نمایاں اوصاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صلاح الدین ہنر نے انہیں شعلے اگلنے والا، آتش زیرپا، منہ زور آندھی کی طرح فضا کو تہہ و بالا صبا رفتار سیلاب، تیغ آبدار، طمطراق دبدبانہ اور باغیانہ بانکپن والے امڈامڈ کر برسنے والے بادل برق و باراں جیسی کیفیات کا حامل شاعر قرار دیا ہے، جبکہ اقبال مسعود ان کی احتجاج کی آواز کو ایک مسلسل چیخ سے تعبیر کرتے ہیں، جو نعرہ ہے نہ پاگل پن یہ چیخ مزاحمتی شاعری کی صورت میں شہر شہر گلی گلی پھیلی ہوئی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔ عشرت ظفر ہر محاذ پر شمشیر بہ کف راحت کی غزل کو عصری نظام کا کرب اور خندہ واستہزا قرار دیتے ہیں۔ شکیل گوالیاری نے راحت کی غزل کو چاق و چوبند پھرتیلی اور منہ پھٹ سے تعبیر کیا ہے۔ شاعر جمالی نے راحت کی غزل کو سینہ باطل کیلئے نیزے کی طرح استعمال کرنے والا جرأت انکار کا شاعر کہا ہے۔ سعید عارفی نے انہیں ایک نئے ذائقے کا شاعر قرار دیا ہے، جو معاشرتی نظام کے تضادات، زندگی کی تلخیوں، حالات کی سنگینیوں، بے ثباتی اور بے یقینی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ معراج فیض آبادی نے انہیں بائیں کاندھے کا فرشتہ جبکہ طارق شاہین نے قدیم اور جدید رویوں کا نقطہ اتصال قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر خالد حسین راحت کو اپنے عہد کے ساتھ آنے والے وقتوں کا بھی سرمایہ قرار دیتے

ہیں۔ واجد قریشی نے انہیں عصری حسیت کا شاعر اوران کی شاعری کو ساعتوں اور جسارتوں کی شاعری سے تعبیر کیا ہے، جو تمام معیاروں پر کھری اترتی ہے۔ واصف فاروقی نے ان کی شاعری کو ہوش وحواس اور وجدان کو مسخر کرنے والی آواز کہا ہے، اثر صدیقی انہیں عبقری اور منفرد غزل گو نیز اردو کا ایک غیور اور نابغۂ روزگار سخنور کہتے ہیں۔ احمد کلیم فیض پوری معنویت کی گہرائی کو راحت کو شیوہ شاعری قرار دیتے ہیں، جبکہ جوہر کانپوری انہیں اپنا آئیڈیل تسلیم کرتے ہیں۔

سید محمد عقیل کی رائے میں ان کی شاعری میں برہنہ گفتاری کے ساتھ ساتھ تہہ داریاں بھی ہیں، جو کیفیت اور حالات کی بے رحمیوں کو سمیٹ کر راحت کی شاعری میں متحرک ہوگئی ہیں۔ ایسی شاعری محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوا کرتی اس کیلئے زندگی کی سخت راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سرخیل علی سردار جعفری نے راحت کا شعری رشتہ قرون وسطیٰ کی شاعری سے ملایا ہے اور آخر میں طنز وظرافت کے نابغۂ روزگار شاعر مرحوم ساغر خیامی کی سنجیدگی اور متانت کی حامل اس رائے کو بجائے مقطع پیش کرتا ہوں کہ اس صدی میں جینے والے قابل تحسین ومبارکباد ہیں کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے، جس میں راحت اندوری جیسا شاعر اپنی پوری ادبی تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔''

اختتام کلام سے قبل جی چاہتا ہے راحت کے مزید چند خوبصورت اشعار ضیافت طبع کیلئے پیش کردئے جائیں، ملاحظہ کیجئے:

آنکھوں میں آنسوؤں کو اگر ہم چھپائیں گے
تاروں کو ٹوٹنے کی ادا کیسے آئے گی

ندی سے دھوپ نے کیا کہہ دیا روانی میں
اجالے پاؤں پٹکنے لگے ہیں پانی میں

میں ہوں یہ کم تو نہیں ہے ترے ہونے کی دلیل
میرا ہونا ترا احساس دلاتا ہے مجھے

قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن خوشبو کا
خار صحرا کہیں بھولے سے مہک مت جانا
شاخ سحر پر مہکے پھول اذانوں کے
پھِنک رضائی آنکھیں کھول اللہ بول (۱)

جہاں تک راحتؔ کے ادبی مرتبہ کا تعلق ہے اثر صدیقی نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ ''راحت کی شاعری مشاہدات وتجربات کی سنگلاخ وادیوں سے گزرتی ہے۔ انجان پتھریلی زمینوں میں خیالات کے دلفریب کیکٹس اگ آتے ہیں ان کا تیشہ شعور فلک پیا چٹانوں پر ترسیلات کا اجنتا تراش کر تخلیقاتی نروان ڈھونڈتا ہے۔ راحت شعروادب کی ریڈی میڈ شاہراہوں کا قائل نہیں وہ اس پگڈنڈی کا عاشق ہے، جو خود اس کے اپنے نقوش پا سے ابھر آئی ہے۔ اسے قافلوں کی آواز جرس سے زیادہ اپنے پیروں کی آہٹیں پیاری ہیں۔ غزل میں راحت کی پیکر تراشیاں، قلندرانہ شان، نادر تشبیہات تابندہ اسلوب، انفرادی زاویہ نگاہ، عمیق مشاہدہ اور شاعرانہ اخلاص بدرجہ اتم ہے، جو اسے معاصرین اور متوسلین اور ناقدین میں ممتاز ومنفرد کرنے کیلئے کافی ہے۔'' (۲)

---

(۱) مشاعروں سے شہر ادب تک (راحت اندوری) مضمون محررہ ڈاکٹر محبوب راہی۔ امکان ماہنامہ لکھنؤ نومبر دسمبر ۲۰۱۰۔ ص ۳۰۔
(۲) عبقری اور منفرد غزل گو از اثر صدیقی راحت اندوری شخص اور شاعر، لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲، ص ۳۳۲

باب ششم

راحت اندوری کی فلمی زندگی

لیکن ان کی پیشانی پر فکر و ملال کی شکنیں کبھی نہیں دیکھی گئیں اس ضمن میں ایم این غوری نہایت تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری فلم ''سب سے بڑی بازی گر'' جس کی موسیقی دے رہے تھے مرحوم لکشمی کانت (لکشمی کانت پیارے لال) اور گیت کار کی حیثیت سے راحت بھائی کا نام تھا پہلے گانے کی نشست میں جب وہ لکشمی جی گھر گئے اور دو تین مکھڑے سنائے تو انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا کچھ دیر بعد یہی کہا'' کچھ مزہ نہیں آیا'' واپسی میں راحت بھائی نے مجھ سے کہا یہ فلم آنند بخشی سے لکھوالیں۔ شاید لکشمی کانت میرے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے، میں نے کہا ایسا نہیں ہے آپ کچھ اور لکھیں'' تب راحت بھائی نے مجھ سے پوچھا آپ میوزک ڈائرکٹر کو ایک گانے کا کتنا پیسہ دیتے ہیں، چونکہ لکشمی جی کا بیٹا میری فلم میں ہیرو تھا اس وجہ سے مجھے انہوں نے کافی رعایت دی تھی۔ صرف ریکارڈنگ کا خرچ لیتے تھے۔ لکشمی جی کا پے منٹ اسٹوڈیو کا کرایہ گلوکاروں اور میوزیشین وغیرہ کے اخراجات کل ملاکر سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں ایک گانا تیار ہوجاتا تھا۔ میں پھر بھی اعزازیہ کے طور پر گیارہ ہزار روپیہ کا لفافہ لکشمی کانت جی اور گیارہ ہزار روپیہ کا لفافہ پیارے لال جی کو ہر گانے کے طور پر دیتا تھا میں نے راحت بھائی سے فرمائش کی کہ میرے لئے دس ہزار روپیہ میں ایک گانا لکھیں۔ دو چار روز بعد پھر جب ہم لکشمی کانت جی کے گھر جانے لگے تو راستے میں راحت بھائی نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے غوری صاحب آج انہیں اگر میرا لکھا ہوا گانا پسند نہیں آیا تو میں ان سے اور آپ کی فلم سے اپنے کو الگ کرلوں گا اگر وہ میوزک ڈائرکٹر ہیں تو میں بھی شاعر ہوں۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک ہزار روپیہ کا فرق ہے۔''(۱)

راحت کا خودشناسی کا یہ جوہر کہا جائے یا اللہ کی دین کہ ان کا گیت تو پسند کرلیا گیا لیکن ''ظلمتیں بھی ہیں یہاں قندیل زر کی لو کے ساتھ'' فلم مکمل نہ ہوسکی ورنہ اچھے گیت ضرور سامنے آتے۔ اسی لئے دئے پن کے ساتھ وہ آج فلمی دنیا سے وابستہ ہیں لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے آہنگ کو

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، ایم این غوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ ص ۴۱۶

بیٹھتے۔ اس کا تصور محال ہے ان حالات میں راحت اندوری اگر اپنے پروقار ذہن اور ادبی وشعری بلندیوں کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یقین ہے کہ ان کے ذریعے فلم انڈسٹری میں ایک زبردست تبدیلی اور ایک عظیم انقلاب پیدا ہو سکے گا اس خیال سے فلم کی ان کا سفر لائق تحسین ہے۔ اس لئے انہوں نے اب تک جو فلمی نغمات لکھے ان میں شعری حسن بھی ہے، فکری گہرائی بھی ہے اور قبول بھی کئے گئے ہیں، مثلاً فلم خوددار کا یہ گیت:

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے
کیا چیز ہو تم خود تمہیں معلوم نہیں ہے

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ راحت کی یہ پہلی فلم تھی اور یہ بھی فیل ہوگئی لیکن فلم میں کام کرنے والوں کو حالات سے بہت کچھ سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے، مثلاً موسیقی کی دھنوں پر گیت ہو، منظر چاہے جیسا ہو شاعر کا ذہن اس طرف رجوع نہ ہوا دبیت دم توڑ رہی ہو پھر بھی گیت کار انہیں قید سلاسل میں رہ کر لکھنے پر مجبور ہوتا ہے یعنی فلم آمد سے تہی دست ہو کر صرف آورد ہی آورد ہوتی ہے اور یہ کام اس وقت اور بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے جو سچا یعنی وہی شاعر اور اچھا شاعر ہو۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ ایسے افراد کیلئے لکھے جو شاعری یا شعر کے شین سے بھی نابلد ہوتے ہیں۔ راحت اندوری کو فلم میں کام کرتے ہوئے ان مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، اکثر انہوں نے یہ دل میں ٹھان لی کہ اب وہ فلم سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ جس ناؤ پر وہ بحر جہات پار کر رہے تھے اسے توڑ چکے تھے یعنی کالج کی پروفیسری جیسی باوقار ملازمت یہ ان کی بے بسی تھی، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس تھوپی ہوئی شاعری اور مسلط کردہ موضوع پر شعر کہنا دشوار ضرور ہے پھر بھی ان کے گیتوں میں شاعری کی خوشبو الگ سے محسوس ہوتی ہے۔

راحت کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے فلموں کے لئے گیت پھکڑ پن، بازاری اور پھوہڑ قسم کے گیت لکھنے سے ہمیشہ انکار کر دیا۔ فلم کی اس کاروباری زندگی میں راحت نے اپنی شرافت نفس کا کبھی سودا نہیں کیا ان کی فطرت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، جس کا ان کو بسا اوقات مزہ بھی چکھنا پڑا

آج ہم نے دل کا ہر قصہ مکمل کردیا
خود بھی پاگل ہوگئے ان کو بھی پاگل کردیا

شعری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہوا اور فلمی منظر کے عین مطابق لیکن فلم سرمایہ دار پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی بدمزاقی بدذوقی اور کج فہمی کا بھلا ہو اس بھرپور مطلع میں اس طرح انہوں نے تبدیلی کی کہ شعر بحر سے ساقط ہو کر اپنا سارا حسن کھو بیٹھا، ترمیم ملاحظہ کیجئے:

آج ہم نے دل کا ہر قصہ تمام کردیا
خود بھی پاگل ہوگئے ان کو بھی پاگل کردیا

تمام کی تقطیع یوں ہوگی، پہلا رکن ساکن، دوسرا رواں، اور تیسرا پھر ساکن اس طرح اور پاگل میں دو رکن رواں ہیں پا اور گل یعنی:

ساحر نے فلمی گیت بھی لکھے ہیں لیکن آج کا کج فہم اور کوتاہ نظر مالک یقین ہے کہ ان کو کوڑے دان Dust bin کے حوالے کردے گا فلم ساز کی خوشی تو ہو جائے گی لیکن ادب کا قلع قمع ہو جائے گا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ساحر کے وہ گیت جو اپنے عہد میں مقبول ہو چکے ہیں آج کا فلمی آقا ان میں کیسی کیسی اور کیا کیا تبدیلی کرتا۔

خدائے برتر تری زمین پر زمین کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے
ہر ایک فتح وظفر کے دامن پہ خون انساں کا رنگ کیوں ہے

یا یہ شعر:

یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبر ملک و قوم بتا

یا ان پرانے گیتوں کے کٹھن الفاظ جن کو فلم دیکھنے والا اپنے دور میں قبول کرتا رہا تھا کہیں ایسے اشعار آج کے فلم گروں کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ان کو چودہ نہیں چودہ سو برس کا بن باس دے

اندوری فلمی دنیا میں دستک دے رہے تھے ان دنوں وہ اندور کے ایک کالج میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے مکمل طور پر وہ ممبئی کے ہوکر نہیں رہ گئے تھے وہاں ایک فلم پروڈیوسر انو ملک کے یہاں راحت اندوری لگے ہوئے ممبئی جاتے تو باندرہ کے ایک اچھے ہوٹل میں ان کا قیام ہوتا جہاں چار چھ دن کا کرایہ ہزاروں روپیہ ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ پیسہ فلم کا پروڈیوسر ہی ادا کرتا تھا لیکن راحت صاحب اس خرچ کو پروڈیوسر کے سر ایک بوجھ سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے غوری صاحب کے ساتھ رہنا شروع کردیا غوری صاحب نے کسی نہ کسی طرح راحت کو بھی اپنے ساتھ کام پر لگالیا تھا حالانکہ وہ فلم کامیاب نہ ہوسکی تھی یہ الگ بات ہے لیکن بقول غوری صاحب:

''وہ یہ حقیقت ہے کہ جس وقت راحت بھائی کو پردے پر ایک جیل میں شعر پڑھتے دکھایا جاتا تھا تو سارا ہال تالیوں سے گونج جاتا تھا۔'' (۱)

ایسے کلمات تحسین کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ راحت اندوری ایک حساس ذہین خوددار فنکار ہیں موجودہ نغمات فلم سے زیادہ وہ شعری حسن ولطافت اور گہرائیوں کا بھی ان کو عرفان حاصل ہے ادبی روایت اور فلم کے باہمی روابط پر بھی ان کی نگاہ گہری ہے۔ فلم کی عرفانیت اور پاکیزگی میں تمیز کرنا انہیں بخوبی آتا ہے یعنی وہ ایک بیدار مغز ذہن لیکر فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے ہیں اس ضمن میں پروین شاکر کا شعر پیش کرنا یقین ہے کہ حسب حال ٹھہرے گا۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

کم ہی یقین ہے کہ پرکاش نے جوان سے امیدیں وابستہ کررکھی ہیں ان پر وہ کھرے اتریں گے آج کی فلمی بے ترتیبی کبھی پوری ہونے دے گی جس کی ایک دلیل تو یہی ہوسکتی ہے۔ فلم سرکیلئے راحت نے ایک گیت لکھا گیت شعری نغمگی سے بھرپور تھا ادبی وقار سے بھی مزین گیت، گیت کا مطلع تھا:

---

(۱) لمحے لمحے بدایوں راحت اندوری نمبر ۲۰۰۲ ص ۳۱۳ مضمون ایم این غوری

فلمی دنیا کی چکا چوند اور مسحوریت میں وہ کشش اور جاذبیت ہے کہ بہتیرے اس کی طرف کھنچ جاتے ہیں اور یہ ایسا مایا موہ کا پھندہ یا مہابھارت کا چکر دیو ہے، جس میں ارجن کے بیٹے ابھیمنو کی طرح جو بھی پھنسا اس کا بچنا محال ہو جاتا ہے یعنی وہ چاہ کر بھی دامن نہیں چھڑا پاتا۔ راحت اندوری کو بھی یہی چمک دمک کھینچ لائی اس ضمن میں این ایم غوری اپنا قصہ بیان کرتے ہیں۔:

''میں ایک کاروباری آدمی بھلا سلولائیڈ کی چمک سے متاثر ہو گیا اور فلم انڈسٹری میں اپنی قسمت آزمانے کیلئے ۱۹۹۲ء میں اندور سے یہاں آ گیا اور یہاں میں نے لاکھوں کا نقصان اٹھانے کے بعد بھی اس امید پر کہ اپنا کھویا ہوا سرمایہ یہیں سے واپس لینا ہے، دو اور فلمیں ایک ساتھ شروع کیں۔'' (۱)

این ایم غوری صاحب پہلے سے فلمی دنیا میں قدم جمائے ہوئے تھے لیکن سب سے پہلے ان کو دلبر نامی فلم میں کام ملا تھا فلم تیار ہونے کے بعد فلاپ ہو گئی تھی اس میں ان کو کافی خسارہ برداشت کرنا پڑا لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انہوں نے پھر دو اور فلمیں ایک ساتھ شروع کیں اسی زمانے میں راحت

---

(۱) لمحے لمحے راحت اندوری نمبر ۲۰۰۲ ص ۱۳،۱۴ مضمون راحت بھائی اور فلم مضمون نگار ایم این غوری

لکھنؤ کے مشاعرے میں غزل پیش کرتے ہوئے راحت اندوری

کسی آہو کے لئے دور تلک مت جانا
شاہزادے کسی جنگل میں بھٹک مت جانا

اپنے گیتوں میں پوری طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فلمی گیتوں میں غزلیہ آہنگ کو برقرار رکھنے والوں جیسے مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، ندا فاضلی، جاوید اختر، جاں نثار اختر وغیرہ کی فہرست اس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گی جب تک راحت اندوری کا نام اس فہرست میں نہ درج کیا جائے۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ راحت اندوری کو فلموں کی وجہ سے شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہوئی بلکہ فلم والوں نے ان کی شہرت کا فائدہ حاصل کیا ہے۔ راحت کی فلمی دنیا تک رسائی کا ذکر کرتے ہوئے ایم این غوری لکھتے ہیں:

''مرحوم گلشن کمار نے انہیں پہلی مرتبہ ممبئی آنے کی دعوت دی یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے اندور کے کسی ٹرانسپورٹر نے انہیں کالج میں آکر گلشن کمار کا فون نمبر دیا اور کہا کہ وہ فوراً ان سے بات کرلیں لیکن راحت بھائی کو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس وجہ سے انہوں نے بات نہیں کی۔ دو چار روز بعد دوبارہ فون آیا تب یہ سوچ کر کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے، انہوں نے ممبئی بات کی۔ گلشن جی نے کہا آپ پہلی فلائٹ سے یہاں آجائیں آپ سے ایک گانا لکھوانا ہے۔ راحت بھائی نے جواب دیا کہ مجھے پنجاب کے مشاعرے میں جانا ہے گلشن جی نے کہا کہ مشاعرہ چھوڑ دیں جتنا بھی نقصان ہوگا وہ دینے کو تیار ہیں۔ لہٰذا راحت بھائی ممبئی کے سفر کیلئے تیار ہوئے یہ پہلا سفر تھا جو راحت بھائی نے فلمی دنیا کیلئے کیا۔ گلشن جی نے ان کا شاندار استقبال کیا اس زمانے میں وہ ایک فلم بنا رہے تھے جس کا نام جانم تھا۔ اس فلم کی ایک سچوایشن پر راحت کی یہ غزل شامل کی گئی:

جھیل اچھا ہے کنول اچھا ہے جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کیلئے کون سا نام اچھا ہے(۱)

جس زمانے کا یہ ذکر ہے ان ہی دنوں میں راحت کے دیرینہ دوست ٹی سیریز کے مشہور قوال اختر آزاد بھی وہیں کام کرتے تھے ان کی فرمائش پر گلشن کمار نے راحت کو ممبئی بلایا تھا۔ گلشن پہلی

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، ایم این غوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲

میں دراز، یارانہ، ہمالیہ پتر، جنٹل مین، اوزار، ناجائز، تمنا عشق اور ناراض وغیرہ بے حد مقبول اور کامیاب فلمیں کہی جاسکتی ہیں۔ قریب آٹھ سال قبل جاوید اختر نے بھی انو ملک کے ساتھ گیت لکھنے کی کوششیں کیں اور وہ بھی آخر کار کامیاب گیت بن گئے۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر انو ملک اور جاوید اختر میں بگاڑ پیدا ہوگیا اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ مطلب نکلنے کے بعد آدمی احسانات بھول جاتا ہے جب تک ابتدا تھی تب تک ساتھ رہا پھر الگ الگ ہوگئے۔ جب انو ملک نے یہ دیکھا کہ جاوید اختر نے ساتھ چھوڑ دیا ہے تو انہوں نے راحت سے رجوع کر کے ان سے گانے لکھوانے شروع کئے اور اس فلم کے دو جو باقی گیت رہ گئے تھے راحت اندوری نے لکھے:

راج کمار سنتوشی کی فلم گھاتک کے گیت کار مجروح سلطانپوری تھے اور اس فلم کے میوزک ڈائرکٹر راہل دیو برمن کی وفات کے بعد سنتوشی کو ایسے گانے کی فکر لاحق تھی جو فلم کو صرف کامیاب ہی نہیں بلکہ ہٹ کرادے۔ انہوں نے راحت اور انو ملک کو منتخب کر لیا۔ راج کمار کی یہ فلم گھاتک تھی اور یہ فلم کامیاب رہی اس کا گانا ممتا کلکرنی پر تھا، اس گانے کا یہ بند دیکھئے:

کوئی جائے تو لے آئے
میری لاکھ دعائیں پائے
میں تو پیا کی گلی جیا بھول آئی رے

راحت اور انو ملک کے اس گیت کی بدولت فلم ہٹ ہوگئی۔ کیونکہ اس گیت میں ہی پوری فلم کی روح کا راز مضمر تھا۔ اسی طور پر مشہور پروڈیوسر این چندرا کی فلم بے قابو میں راحت داخل کئے گئے حالانکہ اس فلم کے گانے ندا فاضلی کے لکھے ہوئے تھے لیکن اس کے دو گانے راحت نے تحریر کئے تھے اور انہیں گانوں کی بدولت بلکہ درج ذیل گیت کی وجہ سے فلم کامیاب ہوگئی وہ گانا تھا۔

عمر تیری سولہ نخرے تیرے سترہ
سترہ نخروں والی تیرا ہر نخرہ ہے خطرہ

ہی ملاقات میں راحت کے کلام ان کی بات چیت وغیرہ سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے راحت سے ایک البم کیلئے کچھ گانے بھی لکھوائے۔ اس البم کی موسیقی توصیف اختر نے دی تھی اور گلوکار انورادھا پوڑوال کے تھے۔ یہ البم بہت شہرت پا گیا۔ راحت ممبئی سے آتے وقت کچھ گانے وہیں ٹی سیریز کے دفتر میں چھوڑ گئے تھے۔ جن میں ایک گانے کو مہیش بھٹ کی فلم سر کیلئے انو ملک نے چن لیا تھا۔ دوسرے تمام گانے اس فلم کے شہرت یافتہ قتیل شفائی کے محررہ تھے۔ لیکن راحت اندوری کا گانا سب سے زیادہ پسند کیا گیا اس گانے کا مکھڑا تھا:

خود بھی پاگل ہو گئے مجھ کو بھی پاگل کر دیا

لیکن اس زمانے میں ٹیلی ویژن پر اتنے چینلوں کی آسانی نہیں تھی، سب سے پسندیدہ پروگرام امین سیانی کا مرتبہ گیت مالا ہی صرف ہوا کرتا تھا۔ سر فلم کا راحت کا گانا اول نمبر پر شمار کیا گیا لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ راحت کا یہ گانا قتیل شفائی کے نام غلطی سے منسوب کر دیا گیا اور راحت کا ظرف یہ کہ انہوں نے اس طرف کچھ توجہ ہی نہیں دی احتجاج کیسا۔ لیکن احباب کے بار بار اصرار پر انہوں نے Venus کمپنی والوں سے کہا اور انہوں نے اس بھول کو سدھار دیا اس طرح حق بہ حقدار رسید۔ اس گانے کی مقبولیت کے بعد انو ملک نے منوج ڈیسائی کی فلم رام کیلئے گانے لکھنے کی فرمائش راحت سے کی، اس فلم کو سہیل خاں ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ سلمان خاں ہیرو تھے۔

مشہور اسٹوڈیو محبوب میں اس فلم کا پہلا گانا ریکارڈ کیا گیا لیکن کن ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ فلم رک گئی، کچھ دنوں کے بعد پھر انو ملک کی کوششوں سے ونود راٹھور کی آواز میں یہ گانا سنجے گپتا نے اپنی فلم رام شاستر میں داخل کیا، جہاں اس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد سے راحت اور انو ملک کئی فلموں میں لگاتار کام کرتے رہے۔ پریم شکتی سکنز، غنڈہ راج وغیرہ کیلئے گانے لکھنے کے بعد ہی Venus کمپنی کی فلم ''میں کھلاڑی تو اناڑی'' میں راحت کے گانے شامل ہوئے اور پسند کئے گئے۔

اب سے کچھ دن قبل تک راحت نے قریب دو درجن فلموں کے لئے گیت تحریر کئے ہیں، جن

میں رہ پڑتے تو یقین ہے کہ وہ اور زیادہ کامیاب ہوتے یہ بات بھی راحت کے سلسلے میں بے خوف ہوکر کہی جاسکتی ہے کہ راحت فلم کی بدولت نہیں شہرت پذیر ہیں بلکہ دنیا کو ان سے جو کچھ ملا ہے لائق ستائش ہے، ہوتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

اپنی فلمی دنیا سے وابستگی اور ادبی صلاحیتوں کے تعلق سے حبیب سوز سے ایک ملاقات میں راحت نے یہ وضاحت کی ہے۔

''یہ صحیح ہے کہ فلموں سے ہمارے ملک کی بہترین صلاحیتوں کا تعلق رہا ہے لیکن میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ فلم ہمارے ادباء وشعرا کیلئے معراج ہے ہاں بیس برس پہلے تک جب میڈیا نے اپنے پر اس حد تک نہیں پھیلائے تھے جتنے آج پھیلے ہیں، فلم سے متعلق لوگوں کو شہرت اور پیسہ بٹورنے کا شاندار موقع ملا، آج حالات دوسرے ہیں فلم کے علاوہ بھی دولت اور شہرت کمانے کے ان گنت راستے ہیں، جس سے لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر کے دور میں فلم کی شاعری میں اوچھاپن نہیں آیا تھا جو آج ہے۔ فلم ساز ہدایت کار یہاں تک کہ فلم بین بھی شاعری کے ذائقے سے واقف تھے۔ ہمارے ان شعرا نے فلموں کے حوالے سے بھی بہترین شاعری عوام تک پہنچائی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ساحر لدھیانوی کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہوں نے فلم والوں سے بہت کم سمجھوتے کئے۔ راجہ مہدی علی خاں، راجیندر کرشن شیلیندر وغیرہ کی مثالیں اس سلسلے میں دی جاسکتی ہیں، جنہوں نے خوبصورت نغمات ہماری شاعری کو دیئے۔ شکیل بدایونی کے یہاں حالانکہ اتر پردیش کے علاقائی گیتوں کی بھرمار رہی لیکن انہوں نے بھی فلموں میں بہت نام کمایا۔ موجودہ دور میں فلموں کی موسیقی اور شاعری میں کافی گراوٹ آگئی ہے اس کا سب سے بڑا سبب ہے Western music جو ہمارے نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ شاعری کی گنجائش ہماری فلموں میں کم بچی ہے۔ پھر بھی جاوید اختر، گلزار، آنند بخشی وغیرہ ایسے گیت ضرور لکھ دیتے ہیں، جو گانوں کو بھلے لگنے کے ساتھ ساتھ اپنے میں تھوڑی بہت شاعری لئے ہوئے ہیں۔ فلموں میں مقبول ہونے

کمپوزر کلیان جی آنند جی تھے اور اس البم کا Music arrangement ان کے بیٹے جو موسیقار بھی ہیں یعنی وجو شاہ تیار کررہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی پرائیوٹ البم میں راحت کا کلام جگ جیت سنگھ، وین سچدیو، روپ کمار راٹھور، سونا می راٹھور، انورادھا پوڑوال اور دوسرے گلوکاروں نے گایا ہے۔ راحت کی فلمی زندگی کا کچھ اور ذکر این ایم غوری نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا۔ حالانکہ یہ مضمون بہت پہلے کا ہے لیکن اس سے راحت کی فلمی زندگی کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے:

''گزشتہ دنوں راحت بھائی کی چند فلمیں اور ریلیز ہوئی ہیں ان میں خوف، اگر تم نہ آتے، دیوانہ تیرے پیار کا، مشن کشمیر وغیرہ ہیں۔ مشن کشمیر نے ملک کے کئی شہروں میں گولڈن جوبلی کی اس فلم کا ایک نغمہ بومبرو بومبرو مال کے بہترین نغمات میں Nominate ہوا۔ اس زمانے میں راحت بھائی وونود چوپڑہ کی فلم Chess مقبول فدا حسین کی فلم مینا اور راج ببر کی فلم کاش آپ ہمارے ہوتے کیلئے نغمات لکھ رہے ہیں۔ ان فلموں کے موسیقار حسب ترتیب عدنان سمیع، اے آر رحمٰن اور آویش شریواستو ہیں۔'' (۱)

اس میں شک نہیں کہ راحت نے کم وقت میں جتنا کام کیا ہے وہ ریکارڈ کام کہا جا سکتا ہے اور ان کی لگن یہ کہ جو زبان نہیں آتی تھی اس میں خاطر دسترس حاصل کر کے صرف دو ہی ہفتہ میں خود کو اس قابل بنالیا کہ اس میں بخوبی گیت لکھ سکیں یہ بھی ایک ریکارڈ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ورنہ اگر دیکھا جائے تو لوگوں کے تلوے گھس جاتے ہیں کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں کہ راحت کبھی جم کر ممبئی میں نہیں رہے مشاعروں میں جانا ان کی روح میں داخل ہے اور مشاعرے کہیں نہ کہیں آئے دن ہوا ہی کرتے ہیں اور راحت سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن مشاعرہ ترک نہیں کر سکتے وہ ان کی روح کی غذا ان کے جسم و دماغ کی توانائی اور فطری ذوق ہے اسے کوئی کیسے ان سے چھین سکتا ہے۔ ویسے وہ یا ان کی موجودگی عہد حاضر میں مشاعروں کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اگر وہ مستقل طور سے ممبئی

---

(۱) راحت بھائی اور فلم، این ایم غوری ص ۴۲۵

گانے کیلئے ونود چوپڑہ نے گلزار کا نام سوچ رکھا تھا لیکن جب اس گانے کے لکھنے کا وقت آیا تو ونود چوپڑہ نے راحت سے کہا کہ راحت تم چونکہ پنجابی سے نابلد ہو اس لئے میں یہ گانا گلزار سے لکھوانا چاہتا ہوں۔ راحت کو یہ بات بری لگ گئی اور اس میں تھی بھی راحت کی سبکی۔ راحت نے ونود چوپڑہ سے پوچھا یہ گانا آپ کو کب چاہئے۔ انہوں نے بتایا کہ ریکارڈ ہونے میں ابھی دو ہفتہ کا وقت ہے۔ راحت کا یہ کمال ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس قلیل مدت میں پنجابی کی کافی کتابیں جو وہاں کی شاعری ثقافت سماج اور اس کے رسم و رواج سے تعلق رکھتی تھیں، پڑھ ڈالیں اور خود کو اس لائق کر لیا کہ وہ پنجابی لکھ سکیں ایک مہینہ کے بعد ونود چوپڑہ کو انہوں نے وہ دکھایا جو انہوں نے پنجابی میں لکھا تھا اور اس طرح یہ آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا یہ گانا پنجابی تاثر لئے ہوئے اپنی خوشبو بکھیرتا ہے۔

ونود کی فلم قریب کے بعد بھی راحت کی کئی فلمیں ریلیز ہوئی ہیں، جن میں ہیرو ہندوستانی اور پریم اگن قابل ذکر فلمیں ہیں حالانکہ یہ فلمیں زیادہ نہیں چل سکیں لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ ان کے گیت بہت پسند کئے گئے ویسے کسی گیت کار کے پاس ایسا کوئی نسخہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ پوری فلم کو ایک زندگی دے سکے لیکن جہاں تک اس کے تعلق سے بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ راحت کے گانے کافی مقبول ہوئے اور آج بھی ان کے لکھے ہوئے گانے پسند کئے جاتے ہیں۔

اس موقع پر امیتابھ بچن کارپوریشن لمیٹیڈ کی فلم کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اس فلم کا نام گاہک ہے۔ اس کے میوزک ڈائرکٹر انو ملک اور ڈائرکٹر رویندر پی پٹ (یہ راج کپور کے معاون تھے) راحت کا کہنا ہے کہ اس پانچ گانوں میں راحت کی پیٹھ امیتابھ بچن خود تھپتھپاتے رہے لیکن ABCL امیتابھ بچھ کارپوریشن لمیٹیڈ کچھ مالی بحران کا شکار ہو گیا اور مجبوراً اس کمپنی کے کئی پروجیکٹ بند کرنا پڑے۔ ان دنوں فلمی دنیا میں البم بنانے کے کام کی دھن اور زور وشور تھا۔ اس کیلئے بھی راحت کے پاس بہت سے دعوت نامے (Offer) آئے لیکن انہوں نے منظوری نہیں دی۔ کچھ دن بعد ضرور انہوں نے Wings company کیلئے دو پرائیورٹ البم کا کام شروع کیا، خاص بات یہ ہے کہ اس کے

چوری چوری جب نظریں ملیں

چوری چوری پھر نیندیں اڑیں

چوری چوری پھر دل نے کہا

چوری میں بھی ہے مزا

رشتوں کے نیلے بھنور کچھ اور گہرے ہوئے

تیرے میرے سائے تھے پانی پہ ٹھہرے ہوئے

جب پیار کا موتی گرا بننے لگا دائرہ

چوری چوری نظریں ملیں

اس فلم کے دوسرے نغموں میں بھی شاعری کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں، جنہیں کمار شانو نے گا کر ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غم کا موسم گزرتا نہیں

زخم یادوں کا بھرتا نہیں

رات پربت ہے کٹتی نہیں

دن ہے دریا اترتا نہیں

عمر کیسے گزر پائے گی

ایک پل جب گزرتا نہیں

ہاں جدائی سے ڈرتا ہے دل

موت سے تو میں ڈرتا نہیں

فلم قریب میں راحت کے انہاک کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہے کہ راحت کو اس فلم سے کتنی دلچسپی تھی۔ ونود چوپڑہ اس فلم کیلئے ایسا گانا چاہتے تھے، جس میں پنجابی الفاظ ہوں۔ اس

اسی زمانے میں خود دار کیلئے گانے راحت لکھ رہے تھے یہ فلم اقبال درانی کی تھی۔ گانے اتنے من پسند ثابت ہوئے کہ فلم مکمل ہوتے ہی اس کے گانوں کی گونج سارے ملک میں پھیل گئی وہ گانے خاص طور سے یہ تھے۔

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے

اور

دل لگا کر ہم یہ سمجھے زندگی کتنی خوبصورت ہے

اس کے بعد ہی سے راحت فلمی دنیا میں پوری طرح چھا گئے ان دنوں وہ بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائرکٹر کے ساتھ کام کر رہے ہیں، جن میں فیروز خاں، ونود کھنہ، ڈیوڈ دھون، راج کمار سنتوش، عباس مستان، چندرا، جی پی سپی، ونود چوپڑا، اقبال درانی، عزیز سجاد ل لارنس ڈیسوزا منصور خان وغیرہ شامل ہیں۔

راحت کی فلمی زندگی میں ایک زبردست موڑ فلم قریب کے ساتھ آیا ونود کی اس فلم کا باکس آفس پر نہیں کہا جا سکتا کیا حشر ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انو ملک اور راحت کے ناموں کی ہر طرف جے جے کار ہونے لگی۔ اگر یہ فلم بھی ہٹ ہو جاتی تو راحت اور انو ملک کی ہمراہی فلمی تاریخ کو ایک نیا رخ ایک نئی جہت دے سکتی تھی۔ یہ فلم لکھتے وقت رات دن راحت پر فلم قریب ہی کی دھن سوار رہتی تھی۔ یہ عام خیال ہے کہ اتنی لگن اور جوش اور محنت شاقہ بہت کم گاروں میں نظر آتی ہے، خود راحت کا کہنا ہے کہ جو کام ریکارڈ نہیں ہو سکا وہ اعلیٰ درجہ کا تھا لیکن فلم والوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں ان کے پیش نظر کہانی اور سچویشن کے ساتھ دیکھنے والوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال رہتا ہے۔

پھر بھی فلم قریب کے گیتوں نے راحت کو ایک خاص پہچان اور مقبولیت دی۔ ان کے لکھے ہوئے گانے عام و خاص دونوں نے پسند کئے۔ ۱۹۹۸ء میں اسکرین ویڈیو کان کیلئے جو گانا چنا گیا تھا ملاحظہ کیجئے:

والے دو شاعر شکیل اور آنند بخشی کا معاملہ لگ بھگ یکساں ہے، جہاں شکیل نے اتر پردیش کے لوک گیتوں کو توڑ پھوڑ کی آنند بخشی نے پنجابی لوک گیتوں کو بیچ بیچ کر خوب نام اور مال کمایا۔ ایسے بخشی نے اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جب کہ شکیل اچھے خاصے شاعر تھے۔ فلموں کے علاوہ وہ مشاعروں میں بھی مقبول تھے ان کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

''مجھے فلموں میں کچھ ایسا لکھنا ہوتا ہے جو فلم کی ضرورت کے مطابق ہو۔ میں نے بہت کم وقت میں بڑے بڑے بینر کی فلمیں لکھی ہیں اس کے باوجود بھی کوشش کی ہے کہ پھوہڑ پن اور سستے گانوں سے اپنے آپ کو بچاؤں، خدا کا شکر ہے کہ میرا کام سب لوگوں نے پسند کیا۔ میرے بیشتر فلمی نغمات مقبول بھی ہوئے ہیں۔''(۱)

ایک دوسرے موقع پر شکیل اختر سے گفتگو کے دوران انہوں نے کہا:

''فلم انڈسٹری میں سرف کا مرشیل ہٹ کو کامیاب سمجھا جاتا ہے میں نے فلموں کیلئے گیت لکھے ہیں، ان میں زیادہ تر فلمیں Box office پر اپنا رنگ نہیں جما سکیں ایسا نہیں کہ یہ فلمیں بکواس تھیں، اصل میں ملٹی چینلس کے زمانے میں ناظرین کو دلچسپی اور پسند کا احاطہ کرنا بے حد مشکل کام ہے گزشتہ پانچ سات برسوں میں کیسی کیسی خوبصورت فلموں کو لوگوں نے Reject کر دیا یہ حیرت انگیز بات ہے کہ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں اور خوش بھی۔ میں نے بہت کم عرصے میں بہت کام کیا ہے۔ میری فلمیں چلی ہوں یا نہ چلی ہوں میرے گیت Hit ہوتے ہیں۔ جہاں تک مقام کا سوال ہے تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ فلمی دنیا میں مقام صرف جوڑ توڑ سے حاصل ہوتے ہیں جتنا کام کر سکتا ہوں اس سے زیادہ مصروفیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

راحت کی ان تمام گفتگوؤں کے باوجود جہاں تک دیکھنے میں آیا ہے ان کا ہر بڑے بینر نے استقبال کیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے مشاعروں کے ذوق وشوق کی وجہ سے جم کر ممبئی میں نہیں رہے اس کے

---

(۱) راحت اندوری سے ایک ملاقات، حبیب سوز

باجود جب بھی فلم والوں کو اچھی شاعری کی ضرورت ہوئی راحت کی تلاش ضرور ہوئی۔ انہوں نے بڑے بڑے عہد حاضر کے مثلاً اقبال درانی، مہیش بھٹ، راج کمار سنتوشی، عباس مستان، این چندرا، ونود چوپڑہ، ڈیوڈ دھون جیسے اہم اور مصروف ترین ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا ہے لیکن اس کے باوجود گھٹیا قسم کے گیتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھا لیکن پھر بھی فلم والوں نے انہیں عزت دی اور کام بھی دیا۔

سچ بات یہ ہے کہ راحت صرف اپنے شوق کی خاطر سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی کی جستجو میں وہاں پہنچے ہیں ان کے ذہن میں کسی قسم کے جلب منفعت کا خیال دور دور تک نہیں رہا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ فلم میں اپنی پسند ناپسند کو ہر وقت ملحوظ رکھتے ہیں اور اسی طرح کے گیت لکھتے ہیں جو غزل کے آہنگ کو قائم رکھ سکیں۔ ان کو جتنے آفرس ملے اگر سب کو انہوں نے قبول کرلیا ہوتا تو بغیر کسی غلطی کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے کئی گنا زیادہ کام کر چکے ہوتے جتنا انہوں نے کیا ہے۔ مگر یہ انہیں کسی طرح منظور نہیں وہ ہر گیت میں شعری فضا کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تا کہ وہ الگ سے اپنی پہچان قائم کر سکیں حالانکہ انہوں نے ویڈیو البم کیلئے بہت کچھ لکھا ہے لیکن پھر بھی بہت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے کھل کر کہنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی کہ فلمی دنیا میں کام کرنے کا سلیقہ ہو نہ ہو جی حضوری ضرور آتی ہو۔ یہی وہاں کی زندگی کی سب سے بڑی سند ہے اور راحت اس سے کوسوں دور ہیں۔ ان کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ فلمی زبان صاف ستھری اور آسان ہونا چاہئے تا کہ عوام تک سمجھ سکیں اور گنگنا سکیں۔

راحت اندوری کے فلمی زندگی کے تعلق نیز متعدد نقادان فن اور دانشوروں کی آرا کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ انہوں نے شاعری کو امانت کی طرح محفوظ رکھا اور مشاعروں کی دلچسپیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا حالانکہ اس طرح ان کو مالی منفعت تو خاطر خواہ نہ مل سکی لیکن اپنی شاعری اور انداز بیان پڑھنے کے ڈھنگ کی بدولت انہوں نے عالمی شہرت اور پذیرائی حاصل کی ہے۔ وہ ان کو قطعی پیسے کی خاطر بھاگنے کی صورت میں اس حد تک نہ حاصل ہوسکتی، جو ان کو ملی ہوئی ہے نیز یہ کہ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فلمی دنیا سے جو حاصل کیا وہ اس سے بہت کم

ہے جوانہوں نے فلم کو دیا ہے۔

ایک موقع پر حبیب سوز سے ایک ملاقات پر راحت اندوری نے فلموں سے اپنی وابستگی کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں بڑی تفصیلی گفتگو کی تھی جسے اس موقع پر پیش کرنا راقم کے خیال نامناسب نہ ہوگا اس گفتگو سے راحت کی فلم سے وابستگی اور خود راحت کے فلم کے عمومی مزاج میں خود کو نہ ڈھالنے کی بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے یعنی اس دنیا میں پہنچ کر بھی وہ وہاں کی چکا چوند میں گم نہیں ہوئے اپنی شناخت ادب کی شناخت قائم رکھی اور کامیاب بھی ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجئے جس کے راحت اندوری مصداق ہیں:

بگیر ترک تعلق دلاز مرغابی

کہ درآب شود چوں برخاست خشک پر برخاست

(جس طرح سے مرغابی کا تعلق پانی سے رہتا ہے کہ پانی سے نکل کر جب وہ پرواز کرتی ہے تو اس کے پر خشک ہوتے ہیں، (تعلق کے اسی طریقے کو اپنانے کی ضرورت ہے) راحت کا تعلق بھی فلم سے کچھ اسی نوعیت کا ہے ان کا جواب ملاحظہ کیجئے:

راحت اندوری کی اب تک لگ بھگ چالیس بیالیس فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں، ان کے وسیلے سے ان کو دام بھی اور نام بھی ملے لیکن وہ اس سے خاطر خواہ مطمئن نہیں ہیں ان کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اب اردو کا وہ ماحول نہیں رہا، جو شکیل ساحر اور مجروح کے زمانے میں تھا کیونکہ اس زمانے میں ڈائرکٹرز جیسے بی آر چوپڑہ، محبوب کے آصف اردو شعر و ادب کے رسیا تھا۔ مختصر یہ کہ فلموں میں اتنی شہرت اور مقبولیت کے باوجود راحت اسے شاعری کے حوالے سے کوئی وجہ افتخار نہیں تصور کرتے ہیں۔

حرف آخر

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ راحت اندوری کے بزرگ خاندان شہر مالوہ کے مضافاتی علاقہ ہانسل پور کے باشندے تھے جو اپنی دیانت، محنت و مشقت کی بدولت علاقہ بھر میں معزز و معتبر گردانے جاتے تھے، جس زمانے میں راحت نے اندور میں آنکھ کھولی وہ زمانہ ان کے والدین کے ادبار، پریشان حالی اور تنگی معاش کے اعتبار سے عسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا گھر کے حالات نے شروع ہی سے راحت کو محنتوں کا عادی بنادیا تھا چنانچہ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ خود کو مختلف کاموں میں لگائے رکھتے تھے۔

راحت کو شعر گوئی کا شوق اوائل عمری ہی سے قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا اپنے ہی کہنے کے مطابق انہوں نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا اور انیس سال کی عمر میں پہلی بار انہوں نے مشاعرے میں غزل پیش کی تھی اس وقت وہ ترنم سے پڑھتے تھے لیکن جلدی ہی ترنم کو اپنی افتادطبع کے موافق نہ پاکر انہوں نے ترنم کے بجائے تحت اللفظ پڑھنے کی شروعات کی اور اس میں اپنا ایک ایسا خاص انداز اختیار کیا کہ اس کی نقالی آج تک کوئی نہ کرسکا اور ان کا طرز پیش کش اب تک انہیں کے دم سے قائم ہے۔ شعروشاعری مشاعروں کے شوق اور سرگرمیوں کی وجہ سے ان کی تعلیم ضرور متاثر ہوتی رہی، ان کے شوق تعلیم اور پکے ارادوں نے انہیں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سندات کا اہل بھی بنادیا۔

راحت نے ایک سچے فنکار کی طرح اپنے ذہن کے دروازوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ کثرت مطالعہ اور نظر بیدار نے انہیں نئے تجربات بخشے۔ایک حساس فکر ونظر کے ساتھ وقت کی ہر دھڑکن پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے راحت اپنے آئینہ قلب ونظر کی گرد صاف کرتے ہوئے برابر آگے بڑھتے رہے۔

جس زمانے میں راحت نے شاعری کا آغاز کیا ان کے وطن اور گردوپیش کی شعری فضائیں کلاسیکی طرز شعرگوئی کی دلدادہ تھیں لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد احتیاج زمانہ کے لحاظ سے روش قدیم سے الگ ہٹ کر مسائل حیات کی ترجمانی کو کچھ بزرگ اور نوجوان شعرا نے اپنی توجہ کا مرکز بنانا شروع کیا اور اندور کے قدیم روایتی طرز کو نیا رنگ دینے کی کوششیں بھی اپنا سر اٹھانے لگیں اس گروہ میں راحت بھی پیش پیش شامل تھے۔

راحت شاعری کو محض وسیلہ تفنن طبع واظہار جذبات ہی کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے وہ مستقل فن سمجھتے تھے اس لئے اس وقت اندور کے مشہور شاعر قیصر اندوری سے انہوں نے مشورہ سخن شروع کیا۔لیکن ان کا مزاج اپنے استاد کے مزاج شاعری سے ہم آہنگ نہ ہوسکا کیونکہ راحت کا مزاج اندور کے قدیم شعری مزاج سے الگ تھا کچھ دنوں تک راحت نے عزیز اندوری کو بھی اپنا کلام دکھایا۔لیکن بہت جلد اپنے مطالعہ مشاہدے اور تجربات کو اپنا رہبر بنا کر وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔شروع میں راحت کی نئی طرز سے اجنبیت کا اظہار ضرور کیا گیا پھر بھی وہ کچھ پرواہ کئے بغیر مقامی محافل اور مشاعروں میں شامل ہوتے رہے۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی مشاعروں کی روایت قدیم ہے لسانی تہذیب کے لحاظ سے یہ خیال ہمیشہ پیش پیش رہا ہے کہ شاعری میں آسمان کی بلندیوں سے اتر کر ارضی مسائل سے گفتگو ہو اور مشاعرہ مجموعی طور سے انسانی جذبات، احساسات ونظریات کے اظہار کا ایک کارگر وسیلہ ہوتا ہے اس لحاظ سے کہ شعر کی سریع الاثری مسلمہ ہے اور راحت کی ارضی مسائل سے گفتگو ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ راحت کی شعری صلاحیتوں نے اپنے قدم جمانا شروع کئے اور آج وہ عالم ہے کہ

مقبولیتوں اور شہرتوں کے بام عروج پر وہ فائز ہیں۔

اردو شاعری پر روایتی رنگ غالب رہا ہے، راحت نے اس رنگ سے بغاوت کی اور فولادی عزم و حوصلہ مسائل حیات و سماج کی ترجمانی کرنے میں اٹل رہے جس کا اچھا نتیجہ بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا رہا۔ اس طرح اور بھی حوصلہ پا کر وہ اپنے انداز و طرز اظہار میں ثابت قدم رہے اور اپنی فکر رسا، جودت طبع، بلند تخیل نگارہ دور رس، کثرت مطالعہ، مشاہدہ اور وقت کی ہر آہٹ پر کان دھرتے ہوئے اور اسے موضوع شاعری ٹھہراتے ہوئے نہ صرف ملک بلکہ دنیا کے سبھی ملکوں میں جہاں مشاعرے ہوتے ہیں، راحت نے اپنے نام اور کلام کا جھنڈا نصب کر دیا ہے اور آج ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔

راحت کی زبان عام فہم سادہ اور صاف ہوتی ہے۔ فارسی عربی کے بھاری بھرکم الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں، کبھی انہوں نے قدیم لب و لہجہ اور انداز نہیں اپنایا اور پورے عزم و اعتماد سے اپنی الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ وہ ظلم و تشدد، عدم مساوات ناروا سلوک، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ کمربستہ رہتے اور للکارتے ہیں۔ وہ صرف مشاعرے ہی بلکہ سامعین منتظمین اور شریک شعرا کا مرکز نگارہ بن گئے ہیں۔ ان کا شعری سفر خوشبو کے سفر کی طرح عطر بیزی کرتا ہوا برابر جاری وساری ہے۔ ان کا انداز پیش کش ایسا دلپذیر ہے کہ جب وہ باغیانہ پن کے ساتھ شعر پڑھتے ہیں تو ایسا سحر زدہ سا ماحول ہو جاتا ہے کہ اس کی نفی کر سکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی۔

شہرت اور پیسہ کہ خاطر راحت نے کبھی اپنی انا کا سودا نہیں کیا ان کے اندر کا شاعر جب ستم رسیدہ لٹے پھنکے مظلوم مسلمان کے روپ میں سامنے آتا ہے تو اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کا سارا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے طرز و سلیقہ کی بدولت ان میں مایوسیوں کی لہر نہیں سر اٹھاتی بلکہ کچھ کرنے اور کر گزرنے کا حوصلہ ملتا اور ظلم کے اندھیروں سے نکلنے کو دل بے قرار ہونے لگتا ہے۔

راحت ایک وطن پرست شاعر ہیں اس لئے بے خوف ہوکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے اس لئے کہ اس کے چپہ چپہ پر ہمارے اسلاف کے قدموں کے نشانات ہیں۔ وہ یہ احساس بھی توانا کرتے ہیں کہ ہم دوسرے درجے کے شہری نہیں بلکہ ہم وہ ہیں جس نے ساری قوم کو تہذیب سکھائی ہے۔

راحت کی شاعری میں تصنع، ریا، خوشامد، مصلحت پسندی، موقع پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہے ان کے اشعار ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولتے ہیں ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ یہ باور کراتا ہے کہ وہ راحت کے زیر نگیں ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ جو حسب ضرورت قوت اظہار نہ پانے کے سبب گونگے لگتے ہیں راحت کے یہاں ان کو قوت گویائی میسر آجاتی ہے اور وہ پوری تاب وتوانائی سے اپنے اثر مرتب کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ راحت کے یہاں محض مسائل زدہ اور روکھے سوکھے اشعار کی کثرت ہے بلکہ ان کے اشعار میں تنوع اور ایسی سرمستی جا بجا بکھری ہوتی ہے، جو غزل کو غزل بناتی ہے۔

راحت ایک کامیاب غزل گو اور ہر تصنع اور بناوٹ سے پاک کھرے اور بے لوث انسان ہیں۔ اگر ایک طرف انہوں نے اس قسم کے اشعار سنائے کہ ''یہ شیر وہ ہیں جو سرکس میں کام کرتے ہیں'' یا ''بہروں کو بھی شعر سنانا پڑتا ہے'' جیسے موضوعات چھیڑ کر ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی ''شاخ سحر پر مہکے پھول اذانوں کے'' یا ''دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی'' جیسے معیاری کلام سے ادب کے ٹھیکیداروں کا منہ بھی بند کر دیتے ہیں یا جو راحت کو صرف مشاعروں کا شاعر یا ڈھونڈورچی کہنے پر تلے ہوتے تھے اور راقم یہ کہنے میں چنداں پس وپیش نہیں کہ راحت اندوری کی شاعری نہ صرف آج کی سچائی ہے بلکہ کل کی بھی سچائی رہے گی۔ راحت کا یہ خیال درست ہے کہ آج اردو مخالف ماحول میں مشاعروں کی وجہ سے اردو کا دیا روشن ہے، جس طرح غزل کی گائیکی نے اردو کو مقبول بنانے میں معاونت کی۔ یہی کام مشاعروں نے بھی کیا ہے، چنانچہ مشاعرے ہی وہ ادارے ہیں، جو اردو کو غیر اردوداں حلقے میں بھی پہنچا رہے ہیں۔

آج کل راحت اندوری فلمی دنیا سے جڑے ہوئے ہیں لیکن وہ کبھی نہیں یہ سمجھتے کہ فلموں سے وابستگی کوئی خاص بڑا اعزاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں نے اس کی بدولت دولت اور شہرت دونوں خوب کمائی ہیں۔لیکن اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ نام اور دام کمانے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں راحت نے صدق دل سے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ پہلے کے فلمی شاعری کرنے والوں نے ادب وشعر کا گلا نہیں گھونٹا بلکہ بہترین نغمات اور شاعری فلموں کو دی ہے۔آج وہ بات نہیں رہی راحت نے سستے اور بیہودہ گانوں سے اپنے دامن شعر کو ہمیشہ پاک رکھا۔آج ان کی بہت سی فلمیں سامنے آچکی ہیں، جو کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ راحت نے کم وقت میں جتنا کام کیا، وہ بہر حال ایک ریکارڈ ہے۔اس میں ان کی ہمسری کرنے والا نظر نہیں آتا ہے اور لطف یہ کہ وہ کبھی مستقل جم کر ممبئ میں نہیں رہے۔ ہفتہ دو ہفتہ بس وہ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مشاعرہ نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ ان کی روح کی غذا ہے۔ راحت کے بارے میں حرف آخر کے طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ راحت اندوری کی شاعری پوری طرح سے کامیاب شاعری ہے۔مشاعروں میں کلمات تحسین، فلمی شاعری اور ان کے فن پاروں میں خلاقانہ فکری بصیرتوں،فکری توانائیوں، بیان کی دلآویزیوں اور زبان کی فصاحتوں، جدت ادا اور متنوع فکر و خیال اپنی تمام تر تہہ داریوں کے ساتھ لطف محاکات اور رنگا رنگ وسعتوں کے ساتھ عصری صداقتوں کا ہر صاحب نظر نے اعتراف کیا ہے۔ان کے ادبی مرتبہ اور شعری صلاحیتوں سے صرف نظر ممکن نہیں ہے ان کی شعر کی پیش کش ایسی دلفریب اور انوکھی ہے، جس کی نقالی ممکن نہیں ہے اور اسی لئے ان کے کلام اور لہجہ کی چوری بھی ممکن نہیں ہے۔

کتابیات

۱ چھوٹے بھائی جان ۔ عادل قریشی ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۲۶

۲ مضطر مجاز ۔ حیدر آباد ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۳۳

۳ خاکہ ۔ ظفر احمد نظامی ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۱۱

۴ تھیکے لہجے کا شاعر ۔ ڈاکٹر عزیز اندوری ۔ راحت اندوری شخص اور شاعر مکتبہ دین و ادب لکھنؤ ۲۰۰۲ء ص ۵۸

۵ راحت اندوری سے ایک ملاقات ۔ حبیب سوز ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۳۸

۶ ہمارے مشاعرے ۔ مشمولہ تنقیدی تحریریں ۔ ڈاکٹر عزیز اندوری

۷ اندازے ۔ فراق گورکھپوری ص ۱۱

۸ علمہ البیان ۔ شکیل گوالیاری ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۱۹۶

۹ مضطر مجاز ۔ ماخوز از امکان لکھنؤ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء ص ۲۸

۱۰ راحت اندوری مشاعروں سے شہر ادب تک ۔ ڈاکٹر محبوب راہی امکان لکھنؤ ص ۳۵

۱۱ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات ۔ وامق جونپوری ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۴۵

۱۲ کالے گلاب کی خوشبو ۔ ڈاکٹر بشیر بدر ۔ مطبوعہ فاران کھمریا بنارس ۳۵

۱۳ تاثرات ۔ از پروفیسر اے اے عباسی

۱۴ مجموعہ کلام دھوپ دھوپ ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۷۹ء
۱۵ مجموعۂ کلام ناراض (ہندی) راحت اندوری ۲۰۰۹ء
۱۶ مجموعہ کلام رت (ہندی) ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۸۳ء

۱۷ مجموعہ کلام میرے بعد (ہندی) ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۹۰ء

۱۸ مجموعہ کلام پانچواں درویش ۔ راحت اندوری ۔ ۱۹۹۲ء

۱۹ بائیں کاندھے کا فرشتہ ۔ معراج فیض آبادی ۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۵۴

۲۰ میرا آئیڈیل راحت اندوری ۔ جوہر کانپوری ۔ ص ۳۷۶

۲۱ راحت میرا یار ۔ انور جلال پوری روشنی کے سفیر ۲۵ رجون ۱۹۹۰ء ص ۱۹۲

۲۲ اقبال کا اجتماعی تبصرہ ۔ اقبال خدا کرے کے چند مقالات ۔ ناشر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اپریل ۱۹۷۷ء ص ۶۱

۲۳ ماہنامہ شب خون الہ آباد مناظر عاشق ہرگانوی جون ۱۹۶۸ء ص ۸

۲۴ جدید شاعری اور اس کے خدوخال اور وسائل ۔ الہ آباد ص ۲

۲۵ جدید شاعری ایک سمپوزیم ماہنامہ کتاب لکھنؤ سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۸

۲۶ اردو شاعری ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک مطبوعہ تنقیدی تحریریں ڈاکٹر راحت اندوری ص ۱۳۵

۲۷ جدید شاعری ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص ۲۵۲

۲۸ زندگی کی تخلیق کا شاعر ۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی

۲۹ مضمون نگار اسعد بدایونی۔ راحت اندوری حیات اور شاعری ۲۰۰۲ء ص ۱۵۲

۳۰ جرأت انکار کا شاعر۔ از شاعر جمالی لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۱۴

۳۱ مضمون ''کوئی صحرا چھپا ہے''۔ احمد کلیم فیض پور ص ۳۳۶

۳۲ مضمون ''بے جگر شعلہ بیان''۔ عقیل نعمانی۔ راحت اندوری حیات اور شاعری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۳۳۸

۳۳ مضمون ''نئی غزل کا قلندر''۔ پروفیسر عنوان چشتی۔ لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۱۰۳

۳۴ مضمون ''تعارف سے تعلق تک''۔ انور جلال پوری لمحے لمحے بدایوں ۲۰۰۲ء ص ۲۹۲

۳۵ مکتوب شاعر جمالی بنام راحت اندوری مملوکہ راحت اندوری

۳۶ عبقری اور منفرد غزل گو راحت اندوری از اثر صدیقی راحت اندوری شخص اور شاعر

۳۷ راحت بھائی اور فلم مضمون ایم این غوری راحت اندوری نمبر ص ۴۱۳